ایس امتیاز احمد کلیکشن

(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)

(2)

Compiled by
Abdul Basit

ایس امتیاز احمد کلیکشن

(ڈر ڈائجسٹ سے انتخاب)


پراسرار آئینہ
پراسرار دھندلکا
پھر وہی کتا
پراسرار مخلوق
تم مرچکے ہو
جنات کا مہمان
خطرناک تجربہ
حسین روح
خونخوار
خوفناک وکٹوریہ
خونی ڈرامہ
خونی کاوش
راج دلاری
روح کا انتقام
روح کا فریب
روح کی بے چینی
زندہ لاشیں
زندہ روح
سکتے کی موت
سمادھی کا بھوت
سونے کی تلاش
شکار



پراسرار آئینہ

ایس امتیاز احمد-کراچی

ایک چھوٹا سا کمرہ اور اس میں ضروریات کی ساری چیزیں موجود تھیں اور مزید چیزوں کی گنجائش نہیں تھی مگر پھر اس میں کئی ہزار کتابیں سمودی گئیں لیکن وہ کتابیں نظروں سے اوجھل تھیں، آخر وہ کتابیں گئیں تو کہاں گئیں؟

پراسرار عمل چاہے نوری ہو یا ناری، اس میں لغزش اکثر نقصان کرتی ہے-کہانی پڑھ کر دیکھیں

''آپ کا تعارف؟'' مسز جوزف نے کہا۔

''ناچیز کو رابرٹ کہتے ہیں۔ میں غیر شادی شدہ ہوں اور چند معزز گھرانوں کے بچوں کو ریاضی پڑھاتا ہوں۔'' زرد چہرہ والے، دبلے پتلے، دراز قامت ادھیڑ عمر آدمی نے اپنا مختصر سا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران مسز جوزف نے پہلی منزل کرایہ پر لینے کے خواہش مند امیدوار کی شخصیت کا جائزہ لے لیا۔ اس کے لب ولہجے اور چہرے مہرے سے شرافت کے آثار نمایاں تھے۔

''آپ چاہیں تو ان معززین سے میری بابت ضروری معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔'' رابرٹ نے چند شخصیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ مسٹر رابرٹ! میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے دراصل حوالہ کی شرط کا تذکرہ

میں نے اپنے اشتہار میں بحالت مجبوری کیا تھا۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ آج کے دور میں کسی کا کیا بھروسہ، میں ایک تنہا بیوہ عورت ہوں اور اس مکان کے گراؤنڈ فلور پر رہتی ہوں سب سے اوپر کی منزل پر ایک پادری صاحب رہتے ہیں۔ بے حد شریف بلکہ فرشتہ صفت انسان ہیں۔ انہیں یہاں رہتے ہوئے پورے گیارہ سال ہوچکے ہیں مگر کیا مجال جو کبھی کوئی اونچ نیچ والی بات ہوئی ہو۔ دوسری منزل پر ایک بینک آفیسر اپنی بیوی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ انتہائی معقول آدمی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

یقین کیجیے کہ ایسا عمدہ مکان اور اتنا پرسکون ماحول آپ کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ سچ مچ گوشہ عافیت ہے۔'' بے چاری مسز جوزف کو اپنے مکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے پڑ رہے تھے ،وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کمر توڑ مہنگائی اور عرصہ سے پہلی منزل کے خالی پڑے ہونے کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھیں۔ ادھر نوکرانی کے پھوہڑ پن نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ تنخواہ تو کم لیتی تھی مگر کوئی کام درست نہ ہوتا تھا، مسز جوزف اس انتظار میں تھیں کہ پہلی منزل کے کرایہ پر اٹھتے ہی اس نکمی نوکرانی سے جان چھڑائیں اور زیادہ تنخواہ پر کوئی قاعدے قرینے کی خادمہ رکھیں۔

''یہ لیجیے دو ماہ کے کرایہ کی رقم پیشگی۔'' رابرٹ نے نئے نئے نوٹ مسز جوزف کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ! یہ لیجیے مکان کی چابی۔'' مسز جوزف نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے چابی کرایہ دار کے ہاتھ میں تھمادی۔ وہ اپنے قیاس پر بہت خوش تھیں آدمی واقعی معقول تھا۔ کرایہ کے معاملے میں ذرا بھی سودے بازی نہیں کی۔

رابرٹ کی شخصیت مثالی تھی رات کو شریفوں کی طرح جلدی سو جانا اور صبح مناسب وقت پر بیدار ہونا، نہ کوئی شکایت نہ شکوہ۔ نہ توڑ نہ پھوڑ۔ کمرہ صاف ستھرا اور سب چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھی ہوئی۔ کرایہ کی ادائیگی بلاتاخیر مقرر تاریخ پر، نہ تاک نہ جھانک۔ اس کے جانے اور آنے کے اوقات اس طرح مقرر تھے کہ آدمی اپنی گھڑی ملالے۔

ایک روز مسز جوزف نے اس کی عدم موجودگی میں اسکے کمرے کا جائزہ لیا۔ وارڈ روب میں کپڑے نہایت سلیقے سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک طرف سفید دستانے اور خوب صورت اوپیرا ہیٹ رکھا ہوا تھا دوسری طرف کونے میں جوتوں کی ایک بڑی تعداد مگر نہایت قرینے سے مگر ایک چیز نے مسز جوزف کو چونکا دیا۔ قد آدم خوب صورت آئینہ کا رخ دیوار کی طرف کردیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ آئینہ اس کمرہ کی خوب صورتی میں نمایاں اضافہ کرتا تھا۔

''آخر ایسا کیوں کیا اس نے؟'' مسز جوزف کے ذہن میں بار بار یہی سوال پیدا ہو رہا تھا۔ اتنے خوب صورت آئینہ کے ساتھ مسٹر رابرٹ کی یہ زیادتی اس کی سمجھ سے باہر تھی اس نے آئینہ کا رخ موڑ کر کمرے کی طرف کردیا۔ پھر دو تین دن بعد جب وہ دوبارہ جائزہ لینے کے لئے رابرٹ کے کمرہ میں گئی تو حیران رہ گئی۔ قد آدم آئینہ کا رخ پھر دیوار کی طرف اور اس کی بھدی پشت کمرے کی جانب تھی۔

''اتنے حسین آئینہ کے ساتھ یہ بدسلوکی۔ توبہ ! توبہ!'' مسز جوزف نے دل ہی دل میں کہا اور دوسرے لمحہ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ شاید آئینہ ٹوٹ گیا ہے اسی وجہ سے رابرٹ نے اس کا رخ تبدیل کردیا ہے آئینہ کے ٹوٹ جانے کے خیال سے اس کے دماغ کو ایک زبردست دھچکا لگا اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے اس کا رخ موڑا تو آئینہ کو بالکل صحیح سلامت پایا اب تو اس کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔

آئینہ کی پشت دیوار کی طرف اور رخ کمرہ کی طرف کرکے وہ پھر چلی آئی اور جائزہ لینے کے لئے آئندہ روز کا انتظار کرنے لگی اور پھر جب وہ دوبارہ کمرے کا جائزہ لینے گئی تو حسب معمول آئینہ کا رخ بدلا ہوا تھا، بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں

صرف ایک ہی وجہ آئی اور وہ یہ کہ آئینہ کے عکس سے مسٹر رابرٹ کو مطالعہ کے وقت دقت محسوس ہوتی ہوگی کیونکہ وہ نظر کمزور ہونے کی وجہ سے موٹے موٹے شیشوں والی عینک استعمال کرتے تھے مگر فوراً ہی ایک دوسرا خیال بھی ذہن میں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ آئینہ پسند ہی نہ ہواس کشمکش کے عالم میں ایک روز رابرٹ کے باہر جاتے وقت مسز جوزف نے روک کر اس سے پوچھا۔

''کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں محسوس کرتے آپ؟''

''نہیں مسز جوزف میں بالکل آرام سے ہوں۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔

''تکلف نہ کیجیے گا۔ اگر کوئی بات ذرا بھی ناگوار خاطر ہو یا کمرہ کی کوئی چیز تو بتایئے گا۔'' مسز جوزف نے اصرار کیا۔

''نہیں خاتون میں نے عرض کیا ہے نا کہ میں ہر طرح مطمئن ہوں۔'' رابرٹ نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔

''اگر آپ کمرہ کی کسی چیز کو تبدیل کرانا چاہتے ہوں تو بلا تکلف فرمادیجیے۔'' مسز جوزف کا اشارہ قد آدم آئینے کی طرف تھا مگر واضح طور پر اس کے تذکرہ سے وہ ہچکچا رہی تھی۔ اس کے یہ الفاظ سن کر رابرٹ نے قدرے توقف کیا اور مسز جوزف کو توقع ہوگئی کہ اب آئینہ کا ذکر ہوگا۔

''نہیں مسز جوزف ہر چیز میری مرضی کے عین مطابق ہے آپ بتایئے کہ آپ کو تو مجھ سے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں؟'' رابرٹ کے لہجے میں بلا کی انکساری تھی۔ مسز جوزف کے لئے رابرٹ کا یہ جواب شدید طور پر مایوس کن تھا۔

''آپ کی جانب سے تو تکلیف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ تو ایک مثالی انسان ہیں۔'' مسز جوزف بولیں۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی۔'' رابرٹ نے جواب دیا اور زینہ سے اتر کر چلا گیا۔ مسز جوزف اسے کھڑکی سے دیکھتی رہی وہ انہاک کے ساتھ بغل میں چند کتابیں دبائے ہوئے بڑی بے نیازی سے چلا جارہا تھا۔

''عجیب شخص ہے یہ، مزاج میں سنجیدگی، فطرت میں شرافت اور لہجہ میں خلوص و عاجزی۔ باتوں اور رکھ رکھاؤ سے علمیت اور قابلیت ٹپکتی ہے۔'' مسز جوزف اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

خادمہ اس وقت نیچے گراؤنڈ فلور پر تھی مسز جوزف کے تجسس نے انہیں رابرٹ کی کتابوں وغیرہ کا جائزہ لینے پر مجبور کردیا۔ موقع بھی غنیمت تھا کیونکہ وہ ابھی ابھی گھر سے گیا تھا اور معمول سے پہلے اس کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ انہوں نے کتابوں کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے شروع کئے مگر لا حاصل ہندسے اور طرح طرح کی علامتیں ان کی سمجھ سے قطعی بالاتر تھیں۔ کہیں مختلف شکلیں بنی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں دائروں اور زاویوں کی طرح کی چیزیں تھیں۔ جن کا سمجھنا محال تھا۔ عبارت کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' مسز جوزف نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''عجیب معمہ ہے۔'' اور اس کے بعد اس نے میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ باریک باریک کاغذوں کی ایک گڈی تھی ان کاغذوں پر روشنائی سے مختلف قسم کی آڑی ترچھی لکیریں اور شکلیں بنی ہوئی تھیں الٹ پلٹ کے دوران مسز جوزف کی نگاہ ایک کاغذ پر پڑی اور وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ قد آدم آئینہ کی ڈرائنگ اس پر بنی ہوئی تھی اور سرخ روشنائی سے اس کی لمبائی چوڑائی تحریر تھی۔

''آخر اس کا مقصد کیا ہے؟'' انہوں نے ڈرائنگ پر نظر مرکوز کرتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اس کے بعد مختلف زاویوں سے اس کا جائزہ لیا مگر اس پراسرار گتھی کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ ایک ناقابل بیان ساخوف اس کے ذہن پر چھانے لگا۔

''کس قدر حیرت انگیز معاملہ ہے!'' مسز جوزف نے دراز بند کرتے ہوئے کہا اور جیسے ہی وہ جانے کے لئے مڑنے لگیں۔ مکڑی کے جالے کی طرح کوئی چیز ان کے گال سے چھوگئی۔ ہوا میں معلق کوئی چیز مسز جوزف نے نظر اٹھا کر غور سے دیکھا تو ریشم کا ایک باریک سا تار تھا۔ ایسے ہی اور کئی تار چھت سے لٹک رہے تھے۔ مسز جوزف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کمرہ کے درودیوار پر پراسراریت چھانے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے کی تمام چیزیں آپس میں سرگوشیاں کررہی ہوں۔

خوف کے مارے مسز جوزف کا برا حال تھا۔

پوری تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ مسز جوزف کے دماغ میں ایک عجیب سی کشمکش اور بے چینی پیدا ہوگئی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جس میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا ہر وقت وہ اس پراسرار گتھی کا حل تلاش کرنے کی جستجو میں رہنے لگیں ایک روز وہ اسی سوچ بچار میں تھیں کہ خادمہ دوڑی ہوئی آئی۔

''ذرا مسٹر رابرٹ کے کمرہ میں چل کر دیکھئے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرے خدا! کیا کوئی مصیبت آگئی ہے؟'' مسز جوزف نے گھبرا کر پوچھا۔

''مصیبت تو نہیں آئی مگر میڈم سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معاملہ ہے؟'' اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا کوئی شخص موجود ہے کمرے میں؟'' مسز جوزف نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کوئی آواز یا سایہ؟''

''جی نہیں۔''

''تو پھر منہ سے پھوٹو تو کہ آخر کیا ہوا۔'' مسز جوزف نے بگڑ کر کہا۔

''میڈم آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔'' خادمہ بولی۔ مسز جوزف گھبرائی ہوئی رابرٹ کے کمرے میں پہنچیں تو انہوں نے دیکھا کہ سارے فرش پر چاک سے طرح طرح کی شکلیں دائرے اور زاویے بنے ہوئے ہیں۔

''ٹھیک ہے تم نیچے جاؤ۔ میں مسٹر رابرٹ سے اپنے آپ بات کرلوں گی۔'' مسز جوزف نے کہا۔

''اوہ میڈم وہ دیکھئے چھت کی طرف۔'' خادمہ نے اپنی مالکن کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ مسز جوزف نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ریشم کے بے شمار تار چھت سے لٹکے ہوئے تھے اسی طرح کا ایک تار مسز جوزف کے گال کو چھو چکا تھا۔ مسز جوزف کا ذہن اور الجھ گیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ رابرٹ کس قسم کا شخص ہے۔''

اگلے روز صبح سویرے کسی نے مسز جوزف کے دروازہ پر دستک دی دیکھا تو رابرٹ کھڑا تھا۔

''فرمایئے کیا خدمت ہے میرے لائق؟'' مسز جوزف نے کہا۔

میں نے فرش پر کچھ شکلیں بنائی تھیں اور ریشم کے کچھ تار بھی اپنے کمرے میں لٹکائے تھے دراصل میں نے انہیں ریاضی کے کچھ مسئلوں کے حل کے سلسلے میں استعمال کیا تھا میں نے سوچا کہ شاید آپ کو ناگوار گزرا ہو اس لئے چل کر آپ سے معذرت کرلی جائے، آئندان کے بجائے میں کاغذ کی پٹیاں استعمال کروں گا اور پن کے ذریعہ قالین کے ساتھ نتھی کردوں گا۔ براہ کرم خادمہ کو ہدایت کردیجیے کہ انہیں چھوئے نہیں ورنہ مجھے یہ سب کچھ دوبارہ کرنے میں خاصی دشواری ہوگی۔ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ آپ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر خدانخواستہ کچھ ہوا بھی تو میں بخوشی اس کا معاوضہ ادا کردوں گا۔

''بہت بہت شکریہ مسٹر رابرٹ۔'' مسز جوزف کے منہ سے صرف یہی الفاظ نکل سکے۔

☆......☆......☆

''واہ! میری کتابیں آگئیں۔'' رابرٹ نے خوشی کے عالم میں بے اختیار کہا۔ مسز جوزف نے کھڑکی

سے دیکھا ایک بڑی وین سے ایک شخص ایک بہت بڑا صندوق اتار رہا تھا۔

''آپ کی کتابیں!'' مسز جوزف نے صندوق کی بڑی جسامت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ '' مگر آپ اتنی ساری کتابوں کو رکھیں گے کہاں؟ میرا مطلب ہے کہ کمرے میں اتنی جگہ نہیں ہے۔'' مسز جوزف نے حیرانی اور جھجک کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''اوہ! آپ اس کی فکر نہ کریں میں کسی نہ کسی طرح گنجائش پیدا کر ہی لوں گا۔'' اور پھر چند دنوں بعد اتنا ہی بڑا ایک اور صندوق آیا۔

''میرے کچھ آلات بھی آنے والے ہیں۔'' رابرٹ نے تذکرے کے طور پر مسز جوزف سے کہا تھا۔ ''ریاضی سے متعلق آلات ہوں گے وہ۔'' اور اس سے قبل کے مسز جوزف کے منہ سے کوئی الفاظ نکلتا وہ پھر بولا۔ ''جگہ کے بارے میں آپ پریشان نہ ہوں۔ انسان کو چیزیں رکھنے کا ڈھنگ آنا چاہئے جگہ تو آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سے کوئی زحمت نہ ہوگی۔ دراصل یہ آلات اور کتابیں میرے کام کے لئے لازمی ہیں۔''

مسز جوزف کو ان صندوقوں کے آنے سے کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی کیونکہ رابرٹ نے اس قدر احتیاط سے کام لیا تھا کہ در و دیوار پر کہیں کوئی خراش تک نہ آئی تھی نہ ہی کسی قسم کا کوڑا کرکٹ پھیلا تھا۔ مگر ایک بات نے مسز جوزف کے ذہن کو پریشان کر رکھا تھا۔

رابرٹ کی غیر موجودگی میں جب اس نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا تو وہ دم بخود رہ گئی کتابوں اور آلات کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا اس نے رابرٹ کو گھر سے کوئی چیز باہر لے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی کوئی ملاقاتی اس دوران رابرٹ کے پاس آیا تھا پھر آخر یہ سب سامان کہاں گیا؟ زمین کھا گئی یا دیواریں نگل گئیں؟ معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا اور ایک ناقابل بیان خوف اسے گھیرے ہوئے تھا۔

اور پھر اس نے دیکھا پہلے کی طرح ریشم کے ریشے چھت سے لٹک رہے تھے اور قد آدم آئینے کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ یہی سوال اس کے ذہن کو کھائے جا رہا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ جنگ کا زمانہ نہیں ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں انہیں وائرلیس کا کوئی سلسلہ سمجھتی۔'' مسز جوزف نے دل ہی دل میں کہا۔ قالین پر بنی ہوئی شکلوں، زاویوں اور دائروں وغیرہ کا ان ریشوں سے تعلق تو کسی حد تک سمجھ میں آ جانے والی بات ہو سکتی تھی مگر ڈھیروں کتابوں اور آلات کے پراسرار طور پر کمرے سے غائب ہو جانے سے مسز جوزف کو عجیب تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے اپنے اردگرد خوف کے دائرے سے پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اسی دوران ایک روز اس کی ملازمہ نے یک بیک نوکری چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ مسز جوزف نے اگرچہ اس سے اس کی وجہ دریافت نہیں کی مگر اس کا ذہن یہی کہہ رہا تھا کہ اس نے رابرٹ کی حرکتوں سے ڈر کر ایسا کیا ہے، اب تو مسز جوزف پر رابرٹ کی پراسرار شخصیت اور بھی بری طرح مسلط ہو گئی۔ اس کے آنے جانے کے اوقات پر وہ ادھر ادھر ہو جاتی تھی تاکہ اس سے سابقہ نہ پڑے۔

سارہ کی جگہ اب نئی ملازمہ لیزا آ گئی تھی جو ایک نڈر دیہاتی لڑکی تھی۔ اسے رابرٹ کی حرکتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر مسز جوزف کی حالت دن بدن غیر ہوتی جا رہی تھی۔ راتوں کو وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچتی رہتی اور اس کے کان کسی متوقع پراسرار آواز یا آہٹ کی طرف لگے رہتے تھے۔

بے چینی کے اس سلسلے سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا یعنی رابرٹ کو گھر سے چلتا کر دینا۔ مسز جوزف نے کئی بار سوچا بھی کہ رابرٹ کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دے مگر اس سے بات کرنے تک کا حوصلہ نہ ہوا۔ رابرٹ پابندی سے ہر ماہ کرایہ کی رقم اسے دیتا تھا۔ ایسی صورت میں مکان خالی کرانے کے لئے

وہ کیا جواز پیش کرسکتی تھی بہت غور وفکر کے بعد ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ مہنگائی کی آڑ لے کر مکان کا کرایہ چوگنا کیوں نہ کردیا جائے ظاہر ہے کہ رابرٹ کے لئے یہ مطالبہ قابل قبول نہیں ہوگا اور مجبوراً اسے مکان خالی کرنا پڑے گا، رات کے وقت لیٹے لیٹے مسز جوزف نے یہ چال سوچی صبح ہوتے ہی وہ رابرٹ کے پاس گئی اور بہانہ پیش کردیا۔

''واقعی اس مہنگائی نے تو کمر توڑ ڈالی ہے۔''

رابرٹ نے کہا اور مسز جوزف کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ یہ جملہ اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ رابرٹ بھی مہنگائی سے بری طرح متاثر تھا اور اس قدر کرایہ کا بوجھ اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔

مگر رابرٹ کے دوسرے جملے نے اس کی توقعات کی فلک بوس عمارت کو بیک جنبش زبان خاک میں ملا کرر کھ دیا۔

''آپ فکر نہ کریں مجھے خود احساس ہے۔''

اور یہ کہہ کر اس نے مسز جوزف کے مطالبہ کی شرح کے مطابق آئندہ تین ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کردیا۔ مسز جوزف اپنے منصوبہ کی ناکامی سے ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ پھر بول پڑا۔

''اصل بات یہ ہے کہ اس مکان میں مجھے بے حد سکون وآرام میسر آیا ہے اور یہ سب آپ کی قابل تعریف شخصیت کا عطیہ ہے۔''

تعریف عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے چنانچہ رابرٹ کے ان الفاظ نے مسز جوزف پر سحر انگیز اثر کیا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں رابرٹ کی طرف مائل ہوگیا اور وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔ کہ کاش رابرٹ وہاں سے کبھی نہ جائے۔

اس دن کے بعد سے رابرٹ کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں اٹھنا بیٹھنا اس کا معمول بن گیا۔ ایسا کرنے سے اسے ایک ناقابل بیان سکون ملتا تھا ایک روز رابرٹ کی عدم موجودگی میں وہ اس کے کمرے میں بیٹھی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک خط پر پڑی جو میز پر کھلا پڑا تھا تحریر کسی نوعمر لڑکے کی تھی۔ خط کا متن حسب ذیل تھا۔

جناب من!

میں نے آپ کی ہدایتوں پر عمل کیا ہے۔ حالانکہ ایسا کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی ہے۔ میں صبح چار بجے بیدار ہوا۔ اس کے بعد پھر نیند طاری ہوگئی کوئی دس منٹ بعد آپ کے فرمانے کے مطابق میری آنکھ پھر کھلی۔ مگر ایک منٹ بعد میں پھر سو گیا اور تھوڑی دیر بعد میری آنکھ دوبارہ کھل گئی عجیب وغریب کیفیت تھی جسے بیان نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ آپ نے توقع ظاہر کی، میں اس کی کیفیت سے خاصا خوف زدہ ہوا۔ اور اس خوف سے نجات پانے کے لئے میں جلد ہی دوبارہ نیند کی آغوش میں پناہ لے لی۔

آئندہ ایسے موقعوں پر کیا میں آپ کو مدد کے لئے پکار نہیں سکتا؟''

فقط۔ بی۔ پی

اس خط کے حاشیہ میں رابرٹ نے بہت سی عجیب وغریب علامتیں بنائی تھیں جو مسز جوزف کے خیال میں اعلیٰ علم حساب سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رابرٹ کی یہ تحریر بھی تھی۔ ''خوف زدہ ہونے پر مدد کرو، یا میری مدد کرو، پکارا جاسکتا ہے۔'' اس کے علاوہ اور بھی کچھ لکھا ہوا تھا جو بہت کوشش کے باوجود مسز جوزف کی سمجھ میں نہیں آیا۔

مسز جوزف نے خط کو دوبارہ وہیں رکھ دیا جہاں سے اسے اٹھایا تھا۔

بی۔ پی۔ برنارڈ پارکر کا مخفف تھا جو رابرٹ کا بہترین شاگرد تھا اور جس کے متعلق رابرٹ اس سے دو تین بار تذکرہ کرچکا تھا۔ چائے وہ ہمیشہ اپنے اسی شاگرد کے یہاں پیا کرتا تھا۔

ایک شام مسز جوزف اپنی کھڑکی کے قریب کھڑی ہوئی تھی کہ رابرٹ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ شراب نوشی اسے بالکل پسند نہ تھی۔ اس لئے اس کے قدموں کے لڑکھڑانے کی وجہ نشہ نہیں

بلکہ تھکن ہی ہوسکتی تھی اس کے قریب آنے پر یہ وجہ قطعی واضح ہوگئی کیونکہ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا کہ وہ سخت محنت کی وجہ سے بری طرح تھک گیا ہے۔ مسز جوزف نے اسے نزدیک آتا دیکھ کر کھڑکی سے ہٹنے کا ارادہ کیا مگر وہ ایسا نہ کرسکی۔ چند لمحوں بعد رابرٹ اس کے سامنے موجود تھا۔ مسز جوزف نے ایک نظر ڈالی تھکن کی وجہ سے پیدا ہونے والی نقاہت کے باوجود اس کی آنکھوں میں ایک عجیب وغریب چمک تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے رابرٹ کو اس کی مدد کی ضرورت ہو۔ اس کی قربت کی چاہ ہوا اور ایک لمحہ کے لئے مسز جوزف کے کانوں میں رابرٹ کے چند دنوں پہلے کے یہ الفاظ گونجے۔ ''آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کو دیکھ کر مجھے کس قدر تسکین ملتی ہے آپ سچ مچ بہت اچھی ہیں۔'' اور جب تک وہ خیالات کے طلسم سے باہر آئی رابرٹ اپنے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

وہ اپریل کی ایک حسین رات تھی مسز جوزف کے کمرے کی بالائی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور خوش گوار نم دار ہوا کے جھونکے موسم بہار کی آمد کا پیغام دے رہے تھے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے مسز جوزف کو نیند آنے لگی تھی۔ اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ دو بج رہے تھے روشنی بجھانے کے بعد وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ پھر اس کے خیالات کا رخ رابرٹ کی طرف مڑ گیا۔ جو بالائی منزل پر سو رہا تھا۔ ''کتنا عجیب وغریب آدمی ہے۔ ریشمی ریشے، پراسرار علامتیں اور زاویے آخر یہ سب کیا ہے؟'' وہ سوچے چلی جارہی تھی۔

اچانک رات کی گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک آواز آئی کوئی مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی بہت دور سے آواز دے رہا ہو۔ مسز جوزف کے کان میں اس آواز سے آشنا تھے رابرٹ کی اس آواز میں بے انتہا کرب تھا۔

''وہ خطرے میں ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بستر سے اٹھی اور خود بخود اس کا ہاتھ بجلی کے سوئچ پر چلا گیا۔ روشنی میں اس کی نظر گھڑی پر پڑی تین بج رہے تھے۔ ''پورا ایک گھنٹہ بستر میں گزر گیا!'' وہ حیران تھی اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور بالائی منزل پر رابرٹ کے کمرے کے سامنے جا پہنچی۔ مگر اسے نہ تو کوئی نظر آیا اور نہ ہی کسی کی آواز سنائی دی۔ ''مسٹر رابرٹ! مسٹر رابرٹ!'' وہ بلند آواز سے چلائی۔ ''آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟'' مگر اسے ایسا لگا جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آرہی ہو۔ پریشانی کے عالم میں وہ چند ثانیوں تک اسی طرح کھڑی رہی مگر رات کی پراسرار خاموشی کی سرگوشیوں کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔

''مسٹر رابرٹ کیا آپ نے مجھے پکارا تھا؟'' اس نے ایک بار پھر بہ آواز بلند کہا۔ مگر رات کے گہرے سناٹے میں اپنی آواز کی گونج کے علاوہ اسے کچھ اور سنائی نہ دیا۔ ''یہ خواب تھا یا حقیقت؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا مگر کوئی جواب نہ مل پایا اور پھر وہ آ کر دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ نیند کا غلبہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ پھر وہی آواز آئی۔

''مدد! مدد!'' خوف وہراس میں ڈوبی ہوئی یہ آواز رابرٹ کی تھی۔ مسز جوزف اپنی پوری قوت سے بالائی منزل کی طرف دوڑی ابھی چند سیڑھیاں طے کرنے پائی تھی کہ وہی دہشت بھری آواز پھر سنائی دی ''مدد! مدد!'' مگر فرق یہ تھا کہ اس بار ایک کی بجائے دو آوازیں تھیں۔

''مدد! مدد!'' چند لمحے خاموشی کے بعد آوازیں پھر بلند ہوئیں اور خوف کے مارے مسز جوزف کے ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس مرتبہ یہ آوازیں بالکل پشت پر تھیں۔ پہلی آواز رابرٹ کی تھی اور دوسری کسی نوعمر لڑکے کی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں مدد کے لئے پکار رہے تھے مگر کیسی عجیب وغریب موجودگی تھی یہ جس کے وجود کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

''مدد! مدد!'' آوازیں پھر بلند ہوئیں مگر اس مرتبہ یہ گراؤنڈ فلور سے آتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے مسز جوزف نیچے پہنچی

مگر وہاں کسی کا نام ونشان نہ تھا۔

''کہیں یہ واہمہ تو نہیں تھا؟'' مسز جوزف نے جائزہ لیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ کان مسلسل تو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس نے سوچا کہ خادمہ یا اپنے پڑوسیوں کو جگا لے مگر اس واقعہ کی غیر معمولی نوعیت نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ ہمت کر کے وہ دوبارہ اوپر پہنچی اور رابرٹ کے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

دوسری آواز کے خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ رابرٹ کے کمرے سے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی تو پھر وہی آوازیں سنائی دیں۔ مگر اس مرتبہ یہ بہت دھیمی تھی اس نے ان کی سمت کا پتہ لگانے کی کوشش کی مگر ایسا محسوس ہوا جیسے یہ دائیں بائیں آگے پیچھے اور اوپر نیچے ہر طرف سے آ رہی ہوں بدحواسی کے عالم میں وہ اپنے بستر پر آ کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

صبح کا زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات بجے تک بیدار ہو جانا مسز جوزف کا معمول تھا مگر اس روز وہ نو بجے تک نہ اٹھی تو ملازمہ کو سخت تشویش ہوئی۔

''مالکن خیریت تو ہے؟'' ملازمہ نے مسز جوزف کے سرہانے بہت آہستہ سے کہا۔ پریشانی کی وجہ سے اس کے لہجہ میں کپکپاہٹ سی تھی اور اس کا سارا جسم کسی نامعلوم خدشے کی وجہ سے تھرتھرا رہا تھا۔

''لیزا تم یہاں...... کیسے؟'' مسز جوزف نے آنکھ کھول کر لیزا کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ذہن میں رات کے واقعات تازہ ہوگئے۔

''مالکن وہ مسٹر رابرٹ ہیں نا......'' لیزا کچھ کہتے کہتے رک گئی اس کے چہرے سے خوف ٹپک رہا تھا۔

''بولو بولو کیا بات ہے؟'' مسز جوزف اب تک بیدار ہو چکی تھی۔ ''ان کا کمرہ اندر سے بند ہے۔ میں نے کئی بار کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔''

''ارے کیا کہا!'' مسز جوزف نے گھبرا کر آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ گھبرانے کی بات بھی تھی۔

صبح کو ناشتہ کر کے زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک گھر سے چلے جانا رابرٹ کا روزمرہ کا معمول تھا۔

''کہیں گزشتہ شب ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟'' مسز جوزف نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ظاہر ہے لیزا سے ایک دم یہ تو دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آیا اس نے گزری ہوئی شب وہ آوازیں سنیں تھیں۔ جن کی وجہ سے خود اس کا برا حال تھا۔

''نہیں مالکن ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' لیزا کے جواب سے مسز جوزف کو یقین ہوگیا کہ گزشتہ شب کی باتوں کے بارے میں اسے ذرا بھی معلومات نہیں۔

''چلو چل کر دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے؟'' مسز جوزف نے کہا اور لیزا کے ساتھ رابرٹ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

لزی کے کہنے کے مطابق رابرٹ کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا البتہ ڈرائنگ روم کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد مسز جوزف نے ایک بات خصوصیت سے محسوس کی اور وہ یہ کہ کھڑکیوں کے سختی سے بند ہونے کے باوجود ہوا میں گزشتہ شب کی سی تازگی موجود تھی۔ چھت سے ریشمی ریشے بدستور لٹک رہے تھے اور قالین پر پہلے کی طرح پنوں کے ذریعہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نتھی تھے اور طرح طرح کی شکلیں، زاویے اور دائرے بنے ہوئے تھے۔

''مسز رابرٹ، ! مسز رابرٹ!'' مسز جوزف نے پکارا اور کوئی جواب نہ ملنے کے بعد ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ زیادہ توقع اس بات کی تھی کہ بستر پر مسٹر رابرٹ کا بیمار یا مردہ جسم پڑا ہوا ملے گا مگر آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ انتہائی حیران کن تھا۔ رابرٹ کا وہاں نام ونشان تک نہ تھا اور بستر اس قدر صاف وشفاف تھا کہ شکن تک نہ تھی، قد آدم آئینہ کا رخ حسب سابق دیوار کی طرف تھا اور اس کے پایوں پر کاغذ کی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

''لیزا! کھڑکیوں کے پردے ایک طرف سرکا دو۔'' مسز جوزف نے سراسیمگی آمیز لہجہ میں کہا۔

پردوں کے ہٹنے سے کمرہ روشن ہوگیا اور مسز جوزف کی نظریں چھت پر لٹکتے ہوئے بے شمار ریشمی ریشوں میں الجھ گئیں۔

''مالکن وہ دیکھئے مسٹر رابرٹ کا ہیٹ رکھا ہوا ہے اور وہ دیکھئے ادھر کونے میں ان کی چھتری بھی رکھی ہوئی ہے مگر جوتے دکھائی نہیں دے رہے!'' لیزا کے لہجہ سے خوف مترشح تھا۔

''تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟'' مسز جوزف نے اپنے اوپر بمشکل قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''ان سب چیزوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مسٹر رابرٹ یہاں سے کہیں باہر نہیں گئے ورنہ۔'' لیزا کہتے کہتے رک گئی۔

''مدد! مدد!'' وہی مردانہ آواز پھر سنائی دی دور بہت دور سے آتی ہوئی مدھم آواز۔ اور اس کے فوراً ہی بعد مگر اس سے بھی زیادہ دور سے آتی ہوئی کسی لڑکے کی آواز سنائی دی جو ''مدد! مدد!'' پکار رہا تھا۔ سمت کا تعین کرنا اس مرتبہ بھی ممکن نہ ہوسکا کیونکہ یہ آواز بیک وقت دائیں بائیں، اوپر نیچے بلکہ ہر طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی مسز جوزف نے ایک معنی خیز نظر ملازمہ لیزا پر ڈالی۔ مگر یقین کی حد تک یہی اندازہ ہوا کہ وہ اس آواز سے بالکل لاعلم تھی۔

''سب چیزوں کو جوں کا توں چھوڑ دو اور میرے ساتھ واپس نیچے چلو۔'' مسز جوزف نے کہا۔ پھر کچھ انتظار کیا کہ شاید وہ آوازیں پھر سنائی دیں مگر ماحول پر پراسرار خاموشی طاری رہی۔

کئی روز گزر گئے مگر رابرٹ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مسز جوزف نے پولیس میں بھی رپورٹ درج کرائی مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ البتہ اکثر و بیشتر رات کے وقت اور کبھی کبھی دن کو مسز جوزف کے کان میں وہی آوازیں آتی رہتیں جو پہلے بھی آئی تھیں۔ ''مدد! مدد!'' اور یہ آوازیں دور ہوتی چلی جاتی تھیں مردانہ آواز کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی لڑکے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن صرف لڑکے کی آواز اسے کبھی سنائی نہیں دی مسز جوزف نے ان آوازوں کے متعلق کسی سے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا، نہ ہی اس نے کسی دوسرے کرایہ دار کو اس جگہ آباد کیا۔ کمرے کی تمام چیزیں جہاں کی تہاں تھیں آئینہ کا رخ بھی دیوار کی طرف تھا اور روزانہ جمنے والی گرد کی تہہ روز بروز موٹی ہوتی جارہی تھی۔

آہستہ آہستہ یہ آوازیں اور بھی مدھم پڑنے لگیں حتیٰ کہ لڑکے کی آواز تو اب بالکل سنائی نہ دیتی تھی۔ البتہ مسٹر رابرٹ کی آواز شب و روز کے امتیاز کے بغیر اکثر و بیشتر اٹھتے بیٹھتے مسز جوزف کے کانوں میں آتی رہتی تھی۔

دن گزرنے کے ساتھ ان آوازوں کے درمیان کا وقفہ بڑھتا چلا گیا اور ان میں دھیما پن آتا گیا یہاں تک کہ ایک روز یہ آواز فضا میں پوری طرح تحلیل ہوگئی۔

مسٹر رابرٹ کی گمشدگی سے تو کوئی فرق نہیں پڑا مگر جب لوگوں کو سر فریڈرک پارکر کے ہونہار بیٹے کے پراسرار طریقہ پر غائب ہوجانے کے بارے میں معلوم ہوا تو پورے علاقہ میں سنسنی پھیل گئی اور اخباروں میں اس معاملے کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔

پولیس انکوائری سے پتہ چلا کہ رابرٹ کی شخصیت کسی بھی اعتبار سے پراسرار نہیں تھی۔ وہ ایک شریف آدمی تھا اس کی زندگی میں نظم و ضبط کو پورا پورا دخل تھا۔ وہ کسی کا قرض دار نہیں تھا بلکہ وہ اچھی خاصی جائیداد کا مالک تھا۔ ہونہار طلباء کو پڑھانا اس کا مشغلہ تھا۔ رابرٹ کی گمشدگی کے بعد اس کا چچیرا بھائی ایک روز مسز جوزف کے پاس آیا اور رابرٹ کے کمرے سے اس کا سامان اٹھا کر لے گیا مگر ان ڈھیروں کتابوں اور آلات کا کمرے میں نام و نشان تک نہ تھا جو وقتاً فوقتاً رابرٹ منگاتا رہا تھا۔

مسز جوزف نے پولیس کے آنے سے پہلے ہی ریشمی ریشوں کاغذ کے پرزوں اور زاویوں وغیرہ کا صفایا کردیا تھا اس کے دل میں رابرٹ کے لئے ایک طرح کی عقیدت اور محبت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ

سے اس نے اس کی پراسرار عادات کے بارے میں کسی کے سامنے ایک لفظ بھی نکالنا مناسب نہیں سمجھا۔

چھان بین کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ رابرٹ اور ہونہار پار کر دونوں اسی رات غائب ہوئے تھے لڑکے کا کمرہ بھی صبح کو خالی پایا گیا اور وہاں سے ایسی کوئی چیز برآمد نہ ہوئی کہ جس سے اس کا کوئی سراغ لگایا جاسکتا۔ پولیس نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے شب وروز جانفشانی سے کام لیا مگر اسے شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس واقعہ کے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد مسز جوزف کو اپنے ایک رشتہ دار کا خط ملا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے قد آدم آئینہ مسز جوزف کو تحفہ میں دیا تھا۔ اس مختصر خط کا متن حسب ذیل تھا۔

''میں ایک یا دو ہفتہ کے لئے کسی کام کے سلسلے میں آرہا ہوں۔ اپنے قیام کے لئے مجھے مسٹر رابرٹ والا کمرہ چاہئے تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ پراسرار باتوں کے کھوج کا مجھ پر خبط سوار رہتا ہے اور پھر یہ معاملہ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پراسراریت سے بھرپور ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ میں اس لڑکے سے بھی واقف تھا جو مسٹر رابرٹ کے ساتھ غائب ہے بڑا ہی ہونہار لڑکا تھا۔''

فقط۔ ہمفرے

مسٹر رابرٹ کی گمشدگی کے واقعہ کے اگلے ہی روز لیزا ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی اب سارا بوجھ مسز جوزف پر ہی آن پڑا تھا آنے والے مہمان کے لے اسے رابرٹ کا کمرہ صاف کر کے رکھنا تھا۔ صفائی تو بہر حال کوئی مشکل نہیں تھی مگر اس بھیانک کمرے میں داخل ہونے کے لئے ہر کولیس کا حوصلہ درکار تھا۔

مسز جوزف کمرہ کی جانب بڑھنا چاہتی تھی مگر پاؤں تھے کہ خوف کے مارے فرش سے چپکے جارہے تھے آخر کار جی کڑا کر کے اس نے دروازہ کھول ہی دیا مگر یک لخت اسے کوئی ان دیکھی چیز کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا دل دہشت کی وجہ سے اچھل کر حلق میں آگیا اور ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ بڑی دیر بعد اپنے آپ پر قابو کر کے اس نے کمرے کی جھاڑ پونچھ کی۔ کھڑکیوں کے پردے بدلے اور بستر کی چادر تبدیل کی۔ ہر چیز کو صاف کر کے قرینہ سے رکھا مگر ایک شے ایسی تھی جسے چھونے کی اس میں بالکل ہمت نہ تھی اور یہ تھا قد آدم آئینہ جو اسی طرح دیوار کی طرف منہ کئے موجود تھا۔

ہمفرے کی آمد تیسرے پہر متوقع تھی اور ابھی دوپہر کا صرف ایک بجا تھا۔ مسز جوزف فلاور باسکٹ اٹھا کر بازار کی طرف چل پڑی، گلاب کے پھول خریدنے کے لئے جو ہمفرے کو بے حد پسند تھے، بازار میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ واپسی پر اس نے اپنے کمرے کی کھونٹی پر ایک نیا فلیٹ ہیٹ لٹکا ہوا دیکھا۔

''اوہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمفرے صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ مگر اس قدر پہلے!'' مسز جوزف نے اپنے آپ سے کہا اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی رابرٹ والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کمرے کے دروازے چوپٹ تھے اور ہمفرے دیوار کے ساتھ ڈھیر ہوا پڑا تھا اس کے جسم کا آدھا حصہ قالین پر اور باقی آدھا فرش پر تا اور سب سے زیادہ پراسرار بات یہ تھی کہ اس کا ایک ہاتھ قد آدم آئینہ کے پایوں پر تھا اور دوسرا آئینے کی جانب یوں اٹھا ہوا تھا جیسے وہ اسے پکڑنا چاہتا ہو، آئینہ اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور اس کا رخ اب تھوڑا سا کمرے کی طرف تھا۔

مسز جوزف نے ہمفرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی نظر اچانک آئینہ کی طرف گئی اور وہ ایک ناقابل بیان تجسس کے زیر اثر تیزی سے آئینہ کی جانب لپکی جہاں اسے ایک حیرت انگیز منظر دکھائی دیا۔

لامحدود خلا میں رابرٹ ایک جانب منہ کئے کھڑا تھا، اس کے ساتھ ہی ایک لڑکا بھی تھا۔

مسز جوزف کو اسے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ یہ پارکر تھا جس کی گمشدگی کی خبریں اس کی تصویروں سمیت ملک بھر کے اخباروں میں شائع ہو چکی

تھیں، ادھر ادھر کتابیں بکھری پڑی تھیں اور آلات کے ڈھیر تھے وہی بے شمار کتابیں اور آلات جن کی پٹیاں رابرٹ اپنے کمرے میں منگواتا رہا تھا۔ خلاء میں ایک دھندلی سی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی پر چھائیں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

دنیا ومافیا سے بے خبر مسز جوزف اس عجیب وغریب منظر میں جذب ہوکررہ گئی۔ اس کی نظریں رابرٹ اور اس نوعمر لڑکے کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے رابرٹ اس لڑکے کو کوئی مسئلہ سمجھانے کے لئے جھکا ہوا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ یونہی محو گفتگو رہے مگر آواز تو درکنار سرگوشی تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

چند منٹ بعد رابرٹ نے سیدھا کھڑا ہو کر پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ مسز جوزف کو ایسا لگا جیسے اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی ہوں۔ رابرٹ کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی اور اس نے مسکرا کر مسز جوزف کی طرف دیکھا۔ خوف زدہ ہونے کی بجائے جذبات کی ایک عجیب وغریب لہر مسز جوزف کے جسم میں دوڑ گئی جیسے زمین میں کوئی جوئے آب۔ اس کا دل اس بری طرح دھڑکنے لگا جیسے کسی مشین کا کوئی پرزہ بے قابو ہو گیا ہو۔

رابرٹ مسز جوزف کی طرف اپنے بازو پھیلائے بڑھنے لگا۔ اس کے قدم تیز ہوتے گئے مگر جوں جوں وہ قریب تر ہوتا جارہا تھا اس کا قد چھوٹا ہوتا چلا جارہا تھا اور جب وہ بالکل قریب آ گیا تو مسز جوزف کے ہاتھ بے اختیار اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے اٹھے مگر......

مگر عین اس وقت اسے ایک بات کا خیال آیا آئینہ میں اس کا اپنا عکس کہیں نہیں تھا۔ ''ہائیں! یہ کیا؟'' برجستہ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے اور وہ بحر تحیر میں ڈوب گئی۔

''آؤ میرے قریب آؤ۔ یہاں، جہاں حقیقت ہے۔ دنیا کے ہر قید وبند سے آزاد۔'' رابرٹ نے پکار کر کہا اور دوسرے لمحے جب مسز جوزف نے پلٹ کر آئینہ میں دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس آئینہ کا فریم ہی فریم تھا۔ اور وہ آواز جیسے اس کی پشت کی جانب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''اوہ! میرے خدا۔'' وہ چیخی اور دھم سے فرش پر گرگئی۔ گرتے ہوئے اسے اتنا ضرور محسوس ہوا جیسے قدآدم آئینہ بھی اس کے ساتھ ہی گر رہا ہو اور پھر نا معلوم دھماکہ کی آواز سے یا مسز جوزف کے بوجھ سے جو ہمفرے پر مع فریم کے آن پڑی تھی ہمفرے کو ہوش آ گیا۔ اٹھ کر اس نے ٹھنڈے پانی کے کچھ چھینٹے مسز جوزف کے چہرے پر مارے تب جا کر وہ اپنے ہوش میں آئی مگر ہوش میں آتے ہی اس نے صرف یہ سوال کیا۔

''آئینہ ٹوٹا تو نہیں؟''

''آئینہ کیسا آئینہ؟ یہاں تو صرف فریم ہی فریم تھا۔'' ہمفرے نے اس کے چہرہ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا!'' مسز جوزف متحیر ہو کر بولی۔ ''میں نے تھوڑی ہی دیر پہلے مسٹر رابرٹ اور ان کے شاگرد کو آئینہ میں دیکھا تھا۔''

''جی ہاں دیکھا تو میں نے بھی تھا انہیں مگر......''

ہمفرے کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

''تو پھر کہاں چلے گئے وہ؟'' مسز جوزف نے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔

''خلاء کی بیکراں وسعتوں میں جہاں آزادی ہی آزادی ہے لامحدود آزادی۔''

''آزادی!''

''آزادی!''

یکے بعد دیگرے دو نسوانی اور مردانہ آوازیں گونجیں اور ساتھ ہی ساتھ ایسا محسوس ہوا جیسے دو پرندے پھڑ پھڑا کر پنجروں سے نکل بھاگے ہوں۔ مسز جوزف اور ہمفرے کے روح سے خالی جسم فرش پر پڑے ہوئے تھے۔





پراسرار دھندلکا

ایس امتیاز احمد۔کراچی

میرے سوا کوئی بھی تمھارے قریب نہیں آسکتا کوئی بھی نہیں۔" نوجوان نے سوچا اور اس نے اپنے کھردرے ہاتھ خوبرو حسینہ کے گلے پر جمادیئے اور اس نے حسینہ کا گلا دبانا شروع کردیا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

اگاتھا کرسٹی کا ڈرامائی انداز اور سسپنس سے بھرپور شاہکار چونکا دینے والی کہانی

یہ واقعہ سننے کے لئے آپ کو اپنا ذہن دوسری جنگ عظیم سے ذرا قبل کے زمانے میں لے جانا ہوگا۔ یہاں میں اپنے ایک نہایت قریبی دوست رابرٹ کا تعارف کراؤں گا۔ہم کئی سال اکٹھے پڑھتے رہے اور اچھے دوست ہونے کے ناطے ہمیں ایک دوسرے کے نہ صرف ذاتی مسائل بلکہ خاندانی امور سے بھی آشنائی تھی۔رابرٹ کا ایک چھوٹا بھائی ایلن اور بہن جین تھی۔ایلن سے تو کئی بار سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن جین سے میں کبھی نہیں مل سکا تھا۔وہ اپنے آبائی قصبہ فورٹ ٹاؤن میں رہتی تھی۔رابرٹ ہر بار چھٹیوں کے آغاز میں یہ اصرار کرتا کہ میں اس کے ساتھ فورٹ ٹاؤن چلوں۔بارہا میں نے تیاری باندھی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی مجبوری آن پڑتی اور مجھے رابرٹ سے معذرت کرنا پڑتی۔

یہ ذکر ہے 1939ء کے اوائل سرما کا جب رابرٹ نے گویا مجھے فورٹ ٹاؤن لے جانے کی قسم کھالی۔اس بار خوش قسمتی سے میں بھی فارغ تھا سومیں نے سامان باندھا اور رابرٹ کے ساتھ ہولیا۔

فورٹ ٹاؤن چھوٹا سا ہرا بھرا قصبہ تھا۔شہر کی پرشور اور تیز رفتار زندگی سے نکل کر یہاں پہنچا تو بے حد سکون محسوس ہوا۔رابرٹ کا حویلی نما مکان خاصا قدیم تھا۔لمبی لمبی راہداریاں، بے شمار کمرے، دالان، پائیں باغ، ناواقف آدمی کو اس حویلی کے راستے ذہن نشین کرنے کے لئے وقت درکار ہوتا۔رابرٹ کے دادا اس علاقے کے ایک معروف زمیندار تھے۔بدقسمتی سے ان کے بعد زمینوں کا کام کوئی بھی خوش اسلوبی سے نہ سنبھال سکا اور اب رابرٹ کے پاس تقریباً یہی ایک حویلی رہ گئی تھی اور اس میں بھی نوکر چاکر ندارد۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حویلی میں آج کل مہمانوں کی ایک پوری فوج موجود ہے۔حال ہی میں جین کی منگنی ہوئی تھی۔رابرٹ نے مجھے بتایا کہ منگیتر اس سے عمر میں خاصا بڑا ہے لیکن ایک بڑا زمیندار اور علاقے کا بارسوخ آدمی ہے۔

جب ہم حویلی میں داخل ہوئے تو شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔حویلی کی چھوٹی چھوٹی منقش برجیاں شفق کے پس منظر میں چمک رہی تھیں۔

''مجھے تو تمہاری یہ حویلی بڑی پراسرار لگ رہی ہے۔''میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''ہاں،اس کے بارے میں بھوت پریت کی بہت سی روایات مشہور ہیں لیکن ہم تو ہنوز کسی بھوت کی ملاقات سے محروم ہیں۔''رابرٹ مسکرایا اور مہمانوں سے تعارف کرانے سے قبل مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور کہا کہ میں رات کے کھانے کے لئے تیار ہوجاؤں۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ اچھا ہوگا اگر وہی مجھے کچھ دیر کے بعد کھانے کے کمرے تک لے جائے کیونکہ حویلی کی بھول بھلیوں میں کمرہ تلاش کرنا میرے لئے دشوار تھا۔میں جانے کہاں بھٹکتا پھرتا۔

رابرٹ کے جاتے ہی میں نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس کھولا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔جب میں آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا تو میری نگاہ غیر ارادی طور پر پیچھے دیوار پر پڑی۔اس میں ایک دروازہ تھا جس کا عکس میں آئینے میں دیکھ رہا تھا۔جونہی میں نے ٹائی باندھی، سرسری طور پر میری نگاہ پھر آئینے میں دروازے کے عکس پر پڑی۔مجھے محسوس ہوا وہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے...... یہ عین فطری بات تھی کہ مجھے مڑ کر براہ راست دروازے کو دیکھنا چاہئے تھا مگر نہ معلوم کیوں میں ساکت کھڑا آئینے میں اس کا عکس دیکھتا رہا۔

آہستہ آہستہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔یہ ایک خاصے کشادہ کمرے میں کھلا اور پھر جو منظر مجھے دکھائی دیا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔ کمرے میں بچھی مسہری پر ایک لڑکی پڑی تھی اور ایک مرد اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔یہ منظر نہایت واضح تھا اور غلط فہمی یا وہم کا شائبہ بھی امکان سے باہر تھا۔میں لڑکی کا چہرہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے خوبصورت چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں تھے البتہ آدمی کی کمر چونکہ میری طرف تھی اس لئے میں اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے بائیں رخ پر زخم کا ایک نشان بڑا واضح تھا جو چہرے کو چیرتا ہوا اس کی گردن تک آگیا تھا۔

مجھے یہ تمام صورت حال بیان کرتے ہوئے تو کچھ وقت لگا ہے لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا جیسے ہی میری یہ سکتے کی کیفیت ختم ہوئی میں فوراً مڑتا کہ براہ راست دہشت ناک منظر دیکھ سکوں...... لیکن...... میرے پیچھے تو محض ایک دیوار تھی اور ایک قد آدم کپڑوں کی الماری اس سے لگی کھڑی تھی۔کوئی دروازہ تھا نہ قتل کا کوئی منظر...... میں دوبارہ آئینے کی طرف مڑا لیکن اب تو وہ اسی کپڑوں کی الماری کو منعکس کررہا تھا۔

''اوہ خدایا!''میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔پھر اسی

کیفیت میں بڑھا اور الماری دھکیلنے کو تھا کہ رابرٹ کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے الماری سے زور آزمائی کرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی میں نے سوال داغ دیا۔

''کیا اس الماری کے پیچھے کوئی دروازہ ہے؟''

''ہاں...... وہ اس کمرے سے ملحق دوسرے سونے کے کمرے میں کھلتا ہے...... مگر......''

''اس کمرے میں آج کل کون قیام پذیر ہے؟'' میں نے بےتابی سے پوچھا۔

''یہ کمرہ آج کل میجر لنک اور ان کی بیگم کے استعمال میں ہے۔''

''کیا میجر لنک کی بیوی کا رنگ انتہائی سفید اور بال سنہرے ہیں؟'' میں بےحد پرجوش ہوگیا۔

''نہیں...... ان کے بال بالکل سیاہ ہیں اور رنگ بھی قدرے مدھم ہے۔'' رابرٹ نے انتہائی اکتاہٹ کے عالم میں جواب دیا اور میں نے مایوسی کے ساتھ اپنی یہ تفتیش بند کردی۔ رابرٹ نے سرسری انداز میں اس کا مقصد پوچھا تو میں بات گول کرگیا۔ دراصل اب میں خود بےیقینی کا شکار ہوگیا تھا کہ یہ منظر کہیں محض میرے تخیل کی پیداوار تو نہیں۔ شاید میں اس واقعہ کو اپنا وہم سمجھ کر فراموش کرڈالتا لیکن جب تعارف کے دوران رابرٹ نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ''تم جین سے ملنے کے مشتاق تھے نا، یہ ہے میری بہن جین۔'' اسے دیکھتے ہی میں مبہوت ہوگیا۔ بالکل وہی لڑکی جسے کچھ دیر پہلے میں نے آئینے میں ہلاک ہوتے دیکھا تھا۔ سنہرے بال، رنگ دودھیا گویا سنگ مرمر سے تراشا ہوا انتہائی پرکشش بدن۔

اور پھر رابرٹ دوسری طرف مڑا۔

''اور یہ ہیں مسٹر چارلس پائن جین کے منگیتر۔'' جونہی میری نظر مسٹر چارلس پر پڑی میرا کلیجہ گویا اچھل کر حلق میں آگیا اور مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ لمبا قد، سنولائی ہوئی رنگت اور بائیں گال پر زخم کا ایک طویل اور بڑا واضح نشان جو گردن تک آ گیا تھا۔

یہ سب کچھ کیا تھا...... ؟ وہی لڑکی...... ہو بہو وہی لڑکی اور وہی بائیں گال پر زخم کے نشان والا آدمی جو نہایت بےرحمی سے لڑکی کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اب یہ دونوں ایک ماہ کے اندر اندر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔

کیا مجھ پر قبل از وقت ایک انکشاف نہیں ہوا تھا...... ایک ناقابل فہم صورت حال!'' کیا واقعی شادی کے بعد جین اور چارلس اس کمرے میں ٹھہریں گے؟ اور پھر یہ منظر واقعی حقیقت کا روپ دھار لے گا؟'' یہ سوچ کر میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگر میں رابرٹ یا جین کو یہ واقعہ سناتا تو کیا وہ میرا تمسخر نہ اڑاتے اور بالفرض وہ اس پر یقین کر بھی لیتے تو کیا وہ مستقبل کی اس آفت کو روک پاتے اور اگر میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں اور پھر واقعی چارلس یہ وحشیانہ اقدام کرگزرے تو کیا میرا ضمیر ساری زندگی مجھے ملامت نہیں کرتا رہے گا؟

غرض میں جتنے دن وہاں رہا؟ پرسکون زندگی کے لطف سے بےنیاز! اسی ادھیڑ بن میں الجھا رہا اور آخر واپسی سے ایک روز قبل میں نے یہ سب کچھ انتہائی سنجیدگی سے حرف بہ حرف جین کو سنا ڈالا۔

جین نے انتہائی تحمل سے یہ سب کچھ سنا۔ اس کے چہرے پر تمسخر کے آثار نمودار ہوئے نہ اس نے میری کہانی پر ایمان لانے کا اقرار کیا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نہایت غیر معمولی تاثر تھا جو میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ چلتے چلتے جب میں کسی دروغ گو کے مانند یہ دہراتا رہا کہ میں ہرگز جھوٹ نہیں بول رہا اور میں نے واقعی یہ منظر دیکھا تھا تو جین نے بہت سنجیدگی سے کہا کہ ''اسے مجھ پر اعتبار ہے، اگر میں یہ سب کچھ بیان کررہا ہوں تو میں نے یہ سب کچھ یقیناً دیکھا ہوگا۔''

فورٹ ٹاؤن سے واپسی کے بعد میں اسی شش وپنج میں تھا کہ میرا یہ اقدام اچھا تھا یا برا کہ یہ اطلاع ملی ''کہ جین نے چارلس سے منگنی توڑ دی ہے۔''

اس سے کچھ ہی دن بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور پھر سوائے جنگ کے اور کوئی چیز گفتگو کا موضوع ہی نہ رہا۔ کئی بار محاذ سے رخصت کے دوران میری مڈ بھیڑ جین سے ہوئی، لیکن ہر بار میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے احتراز کیا۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ میں پہلی ہی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا اور ہنوز اس کے سحر سے نکل نہیں پایا تھا، لیکن محبت کا اظہار کرنے میں وہ واقعہ میری راہ میں رکاوٹ رہا۔ یقیناً میرے وہ واقعہ سنانے کی بنا پر جین نے چارلس سے منگنی توڑ دی تھی۔ اب اگر میں اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کروں تو کہیں وہ اس واقعے اور منظر کو ایک چال اور من گھڑت افسانہ نہ سمجھے۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ میں نے ہر بار اس سے یہ بات کرنے سے گریز کیا۔

پھر ایک دن محاذ پر یہ جاں سوز اطلاع ملی کہ رابرٹ دشمن کے حملے کے دوران مارا گیا۔ میرا فرض تھا کہ میں اپنے بچپن کے دوست کے آخری رسومات میں شرکت کروں۔ میں تعزیت کے لئے جین کے پاس بھی گیا۔ وہ بھائی کے غم میں چپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ میں دیر تک اسے دلاسے دیتا رہا۔ اس دن افسردگی کے عالم میں وہ مجھے اتنی پرکشش لگی کہ کئی بار دل چاہا اپنا مدعا اس سے کہہ ڈالوں مگر ہر بار وہی خدشہ آڑے آیا...... میں اس دعا کے ساتھ محاذ پر لوٹ آیا کہ خدا اگر مجھے جین کا قرب نہ دے تو موت دے دے کہ مجھے اس بے قراری سے تو نجات ملے۔

جین کے بغیر یہ تمام دنیا زمیرے لئے بے مقصد اور افسردہ وحزیں تھی۔ لیکن شاید دشمن کی کسی گولی پر میرا نام نہ تھا۔ بلکہ کئی بار تو میں حیرت انگیز طور پر موت کے منہ سے بال بال بچا۔ کبھی بارودی خندق صرف دس گز دور پھٹی تو کبھی گولیاں چند انچ کے فاصلے سے گزر گئیں حتیٰ کہ ایک بار تو ایک گولی میرے دائیں کان اور گال کو چھوتی ہوئی میری جیب میں رکھے سگریٹ کیس سے ٹکرائی اور دوسری طرف نکل گئی۔

جنگ ایسی چھڑی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ شاید تمام زندگی اس جنگ عظیم کی نذر ہو جائے گی۔ دوستوں، عزیزوں کی موتیں روزانہ کا معمول ہوگئیں۔ ایک روز اطلاع آئی کہ چارلس بائن حملے کے دوران ہلاک ہوگیا ہے۔ اس خبر نے کسی نہ کسی حد تک صورت حال میں فرق پیدا کردیا۔

خدا خدا کرکے جنگ بند ہوئی اور کچھ عرصہ قبل جب میں چھٹی پر گھر آیا تو جین سے ملا اور تمام خدشات بالائے طاق رکھ کر وہ تمام باتیں کہہ ڈالیں جو ایک عرصہ سے میرے دل میں سلگ تو رہی تھیں مگر زبان تک پہنچنے سے محروم تھیں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جین نے ان باتوں کو نہایت خوش دلی سے سنا گویا وہ بھی دل میں اس کی تمنا لئے بیٹھی تھی اور کہا۔ ''بھلا تم نے یہ ساری باتیں مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ ڈالیں؟'' میرے خدشات ظاہر کرنے پر وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''اگر مجھے چارلس سے ذرا بھی محبت ہوتی تو بھلا میں تمہارے اس بے سروپا تخیل کی وجہ سے جو تمہیں آئینے میں نظر آیا، منگنی کیوں توڑتی......؟ یقین کرو مجھے بھی پہلی ہی نظر میں تم سے محبت ہوگئی تھی اور آج تک میں صرف اور صرف تمہیں چاہتی رہی ہوں۔''

ہم دونوں مسکرا اٹھے اور فضا ایک دم خوشگوار ہوگئی۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر ہماری شادی ہوگئی اور پھر خاصے عرصے تک کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ اس آئینے والے قصے کو ہم ایک دلچسپ مگر بے معنی واقعہ سمجھ کر فراموش کر چکے تھے۔

ہماری ازدواجی زندگی کی ابتدا تو نہایت خوشگوار تھی لیکن آہستہ آہستہ ہمیں ایک بڑی تلخ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جس کا ذمہ دار سراسر میں تھا۔ مجھے جین سے بے انتہا محبت تھی، لیکن اپنی ایک عادت جو مجھے خود شادی کے بعد معلوم ہوئی وہ شک اور حسد کی عادت تھی۔ جین اگر کسی شخص کی طرف مسکرا کر دیکھ لیتی تو میں کئی دن کڑھتا رہتا۔ وہ کسی مرد سے دو لمحے بات کرلیتی تو میری

راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔

شروع شروع میں جین اسے میری چاہت سمجھ کر خاموش رہی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا میری یہ عادت اس کے لئے نا قابل برداشت ہوتی گئی۔ روز روز کے جھگڑے زندگی میں زہر گھولتے چلے گئے اور یہ شکوک وشبہات جو یکطرفہ تھے ،ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب جین کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ محبت کا جو دریا چند ماہ قبل اس کے دل میں موجزن تھا۔ اب اتر چکا تھا اور اس محبت کا قاتل یقیناً میں تھا۔

پھر ڈیرک ٹامس ہماری زندگی میں آیا۔ اس شخص میں وہ سب کچھ تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ خوش نما ،نہایت ذہین اور خوش گفتار اس سے ملتے ہی یکا یک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جین کے لئے یہ شخص مجھ سے بہت بہتر ہے۔ جین نے ہر طرح سے اس کے خلاف احتجاج کیا،لیکن میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔

میرے دل میں حسد کا جوالا وا کھولتا چلا جا رہا تھا ،ایک دن اس کی تپش جین کی برداشت سے باہر ہوگئی اور اس نے مجھ سے ،اپنے نا کردہ گناہوں کے عذاب سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

میں جب ایک رات گھر لوٹا تو اس کا کمرہ خالی تھا۔ اور خاص روایتی انداز میں وہاں ایک الوداعی پیغام موجود تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے ،صرف اس لئے کہ وہ یہ سب کچھ نہیں سہہ سکتی۔ وہ پہلے اپنے آبائی قصبے فورٹ ٹاؤن پہنچے گی اور پھر اس شخص کے پاس چلی جائے گی جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہے اور اس شخص کو بھی اس کی ضرورت ہے اور یہ کہ مجھے اس کا یہ فیصلہ آخری فیصلہ سمجھنا چاہئے۔

شاید یہ جذبہ حسد ڈیرک ٹامس کے بارے میں اس قدر شدید نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جین ڈیرک سے مل سکے، مجھے کچھ کرنا تھا۔

میں اپنی کار میں جس قدر جلد فورٹ ٹاؤن پہنچ سکتا تھا، شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ میں انتہائی غصے کے عالم میں حویلی میں داخل ہوا۔ سونے کا کمرہ روشن تھا اور وہاں جین کھانے کا لباس تبدیل کر کے بال سنوار رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرانی اور کسی قدر خوف کے آثار پیدا ہوئے اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرے سوا کوئی بھی تمہارے قریب نہیں آ سکتا کوئی بھی نہیں۔'' میں نے اپنے کھردرے ہاتھ جین کے گلے پر جما دیئے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں اس کا گلا گھونٹنے لگا اور پھر یکا یک میری نگاہ آئینے پر پڑی۔ میں جین کا گلا دبا رہا تھا، اس کا چہرہ دہشت زدہ اور میرے دائیں گال پر گولی کا نشان واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

نہیں پھر میں نے اسے قتل نہیں کیا...... میں تو یہ منظر دوبارہ دیکھ کر گویا مفلوج ہو گیا اور بے حس وحرکت فرش پر گر پڑا۔ اور پھر جین نے مجھے سہارا دیا۔ ہاں جین نے خود مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور مجھے دلاسا دیا۔

میں بے اختیار رو پڑا اور شاید ان آنسوؤں کے ساتھ ہی حسد اور شک کا وہ سیلاب بھی اتر گیا جو ہماری خوشحالی کے جزیرے کو غرقاب کرتا چلا جا رہا تھا۔ جین نے وضاحت کی کہ ''وہ شخص جس کا پیغام میں ذکر تھا اور جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی تھی جین کے دوسرے بھائی ایلین کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خوشگواری ہماری زندگی میں لوٹ آئی۔

آج میں اور جین ایک نہایت پرسکون ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ زخم کا وہ نشان جو میرے دائیں گال پر تھا، مجھے آئینے میں بائیں گال پر نظر آیا۔ یقیناً چارلس پائن کے معاملے میں مجھ سے ایک نہایت سادہ سی غلطی ہوئی کیونکہ زخم کا نشان اس کے بائیں گال پر تھا۔



سرگوشی کے سے انداز میں احتشام کو تسلی دی تو ساتھ بیٹھے عادل نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''نہیں۔۔۔ وہ آ رہا ہے میری طرف۔۔۔ دیکھو وہ اپنے خاکی وجود سے الگ ہو رہا ہے خدا کے لئے اسے روک لو۔۔۔ وہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔'' چند لمحے بعد احتشام کی تیز آواز سن کر ثانیہ نے شیشے کے پار اسٹریچر پر پڑے احسن کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹتی چلی گئیں۔

احسن خود تو اسٹریچر پر بے سدھ پڑا تھا لیکن اس کے وجود سے بالکل اسی کا ہم شکل جدا ہو کر زمین پر اتر آیا تھا اور دھیرے دھیرے انداز میں ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

ادھر مانیٹر کی اسکرین پر دل کی دھڑکن بیان کرنے والی آڑھی ترچھی لکیر بالکل سیدھی ہو گئی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ مریض کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے۔

اسی لمحے ڈاکٹروں نے احسن کو بچانے کے لئے الیکٹرک شاک کا سہارا لیا اور جیسے ہی پہلا شاک دیا گیا ان کی جانب بڑھتا ہوا احسن کا باطنی وجود ایک جھٹکے سے وہیں رک گیا۔۔۔ ادھر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے احسن کے جسم نے بھی ایک جھٹکا سا کھایا تھا۔

اس کے بعد دوسرا جھٹکا لگا تو دل کی دھڑکن بتانے والی مشین کی اسکرین پر بھی بند دل کے دوبارہ دھڑکنے کے آثار پیدا ہوئے جب کہ احسن کا باطنی وجود جو ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا جھٹکے سے پیچھے کی جانب کھنچتا چلا گیا جیسے اسے واپس بلا لیا گیا ہو۔۔۔ یوں دو تین شاک لگنے کے بعد مانیٹر پر دل کی دھڑکن نارمل ہو گئی اور اس کا باطن ایک بار پھر ظاہر میں گم ہو کر یک جان ہو گیا۔

اب احسن کی نبض اور سانس معمول کے مطابق چل رہی تھی جب کہ احتشام، ثانیہ اور عادل تینوں کے چہروں پر سکون اور مسرت کے آثار تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کی محنت رنگ لے آئی تھی۔

اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا اور فائزہ بھی اپنے والدین کے ہمراہ ایمرجنسی وارڈ میں آن پہنچی۔ جسے دیکھ کر احتشام کے چہرے پر بھی مسرت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

انسپکٹر عادل کی زبان سے تفصیل سننے کے بعد فائزہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے تھے۔ اسی لمحے احتشام کی درخواست پر ثانیہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فائزہ کے قریب پہنچی اور اس کا ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے بولی:

''تم صرف احسن کی ہو فائزہ۔۔۔ کوئی دوسرا بھی تمہیں اس سے چھین نہیں پائے گا۔''

''ہاں۔۔۔ مگر آپ کون ہیں؟''

فائزہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ ثانیہ نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کی درخواست کی:

''زندگی میں بہت سے راز روزِ محشر ہی کھلیں گے اور ان میں سے ایک راز تمہاری محبت کا بھی ہوگا۔''

یہ کہتے ہوئے ثانیہ نے احتشام کی جانب دیکھا تو اس کے چہرے پر ممنونیت کے آثار تھے۔ اسی لمحے انسپکٹر عادل معاملے کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھا اور طریقے سے احسن کی بازیابی کو پولیس کی کارروائی قرار دے کر سب لوگوں کو مطمئن کر دیا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے ثانیہ اور عادل ہسپتال سے روانہ ہوئے تو گھر جانے کے بجائے تازہ پھولوں کا گلدستہ خرید کر اس تازہ قبر پر فاتحہ پڑھنے جا پہنچے جس کے مکین کو حقیقی معنوں میں آج ابدی نیند سونا نصیب ہوئی تھی۔

اس دن کے بعد احتشام کبھی ثانیہ کو دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن اس واقعہ نے عادل اور ثانیہ کی زندگی میں بہت سی مثبت تبدیلیاں رونما کیں اور ان کے دلوں میں مذہبی ذمہ داریوں کا احساس پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔ کچھ عرصہ بعد عادل کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو گیا اور وہ دونوں یادوں کا یہ انمول خزانہ سمیٹ کر اس گھر کو الوداع کہہ گئے۔



پراسرار لڑکی

ایس امتیاز احمد-کراچی

خوف کی وجہ سے اب اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے اور پھر اگلا منظر اس کے لئے روح فرسا ثابت ہوا، سرخ و سفید نازنین کا چہرہ اچانک بھیانک ہوگیا تو وہ آناً فاناً لرز کر رہ گیا۔

سبک سبک دل ودماغ کو فرحت بخشتی......اپنی نوعیت کی اچھوتی، انوکھی، خونی کہانی

قدموں کی چاپ کھٹ۔کھٹ۔کھٹ کے انداز میں ابھری اور ایک گرجدار آواز گونجتی چلی گئی۔

"جاگتے رہنا......جاگتے رہنا......"

آواز کے ختم ہوتے ہی پھر وہی سکوت طاری ہوگیا۔ چوکیدار نے ٹارچ کو بجھا کر اپنی گود میں رکھی اور اپنے بیٹھنے کی جگہ صاف کر کے کمبل اپنے پاؤں پر ڈال لیا اور بجھی ہوئی آگ کو کریدنے لگا۔ چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کسی سوچ میں کھوگیا۔ وہ ایک پختہ دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوا چاروں طرف چوکنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اچانک اس کے حساس کانوں نے ایک مدھم سی آواز سنی۔ جیسے یہ آواز کہیں دور سے آرہی ہو۔ پائل کی جھنکار کی آواز......

اس نے آنکھوں کو معنی خیز انداز میں گردش دی اور اس آواز کو سننے لگا۔ ابھی وہ کچھ بھی نہ سوچ پایا تھا کہ آواز بالکل قریب محسوس ہوئی۔ اس نے کمبل اتار پھینکا اور موٹا ڈنڈا ہاتھ میں سنبھال کر ٹارچ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ اس نے انگلی کی طرف رخ کیا اور اندازے سے آواز کی سمت بڑھتا گیا۔ لیکن پائل کی آواز دور ہوتی گئی۔ اس نے اپنے دماغ کو ایک بار پھر اس آواز کی راہ پر لگا دیا۔ اور ایک دم ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں چوراچکوں کی یہ کوئی چال نہ ہو کہ چوکیدار اپنی جگہ سے ہٹ جائے اور وہ اپنا کام کر جائیں۔

ایک دم اسے اپنے سامنے والے بینک کا خیال آ گیا وہ دبے قدموں بینک کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن وہاں پر چھائی طویل خاموشی نے اسے الجھن میں مبتلا کردیا۔ اسی وقت ایک بار پھر پائل کی جھنکار سنائی دی تو اس نے جھنجلا کر پھر زور سے آواز لگائی۔

"جاگتے رہنا......جاگتے رہنا......"

لیکن اب اس کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ اپنی جگہ کی طرف پلٹا۔ جیسے ہی وہ اپنی جگہ پر پہنچا۔ ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ اپنی جگہ پر کسی کو کمبل اوڑھے سوتا دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔

اچانک اس کی نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ پاؤں میں پائل دیکھ کر اس کے ماتھے پر سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔ اس نے زمین پر ڈنڈا دے مارا۔ لیکن پائل والی کے سونے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے بے خوف ہو کر کمبل اتارنا ہی چاہا تھا کہ سونے والی کو اٹھتے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور پھر اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک طویل چیخ نے پورے ماحول کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر جاتا کہ عورت نے اسے بڑھ کر تھام لیا اور جیسے ہی اس نے دوبارہ عورت کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ حیرت زدہ ہوگیا۔ کتنی خوب صورت عورت تھی وہ لیکن اس وقت تو اس کی شکل بہت ہی ڈراؤنی اور خوفناک نظر آئی تھی۔

''تم مجھ سے ڈر گئے ہو شاید......''

''میں تو......تت......'' وہ آواز کے جادو میں گم ہوتے ہوئے ہکلایا۔

''تو آؤ......اس سردی سے بچنے کے لئے کہیں اور چلیں۔ چلو نا میرے ساتھ......'' اس آواز میں ایک عجیب سا حکم تھا۔

''چلو......'' چوکیدار بے چوں چرا اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مبہوت سا اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اسے عورت کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف پائل کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ چلتا رہا اور پھر ایک ویران سے مکان کے قریب جا کر عورت رک گئی اور مسکراتی نظروں سے چوکیدار کو دیکھنے لگی۔

''اب تم آگے ہو جاؤ......''

چوکیدار آگے ہولیا اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اندھیرے کمرے میں اسے ایک طرف ایک چھوٹی سی موم بتی جلتی نظر آئی۔ جس کی روشنی اس اندھیرے کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ پائل کی جھنکار کی آواز اب معدوم ہوگئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عورت غائب تھی۔ وہ حیران پریشان خوفزدہ نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ پوشیدہ سی کچی عمارت جس کے در و دیوار پر منوں مٹی چڑھی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس میں برسوں سے کوئی نہ رہتا ہو۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر آوازیں دیں لیکن کوئی آواز بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

چوکیدار کا پھولا ہوا سینہ اب خوف سے پچکنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے تمام مکان دیکھ ڈالا۔ لیکن عورت اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور پھر اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھلکنے لگا۔ اس کی نظریں دیوار پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار پر ایک عجیب و غریب شے کو رینگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک سرخ چھپکلی تھی۔ جو اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ سرخ زبان بار بار باہر نکلتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔

چوکیدار نے خوفزدہ ہوکر اس سے نظریں ہٹالیں اور دوسرے کمرے کی طرف لپکا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر آ گرا۔ جس چیز سے وہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا اس پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی کیونکہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ اس نے اٹھنے کے بجائے ایک طرف کو سرکنا شروع کردیا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں روشنی ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اُس کمرے کی موم بتی اِس کمرے میں کیسے آ گئی؟

اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق سے باہر آ جائے گا۔

اسی وقت کمرے میں ستار بجنے شروع ہوگئے اور پائل کی جھنکار واضح ہوتی چلی گئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ دیوار پر پھر وہی چھپکلی نمودار ہوگئی۔ پائل کی جھنکار بند ہوگئی۔ اب کمرے میں وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ سرخ چھپکلی انتہائی پسندیدہ نظروں سے چوکیدار کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی اور پھر اسی وقت چوکیدار کے ذہن میں ایک خدشا ابھرا۔

''کہیں وہ اس سرخ مکان کے اندر تو نہیں ہے جس کے متعلق اخبارات میں بھی آچکا تھا کہ اس میں کوئی بدروح ہے۔ ہر جمعرات کو اس میں سے پائل کی جھنکار کی آواز اور چیخیں سنائی دیتی ہیں۔'' وہ خوفزدہ ہوکر مکان کے در و دیوار کو دیکھنے لگا۔

وہ حیران رہ گیا۔ واقعی وہ اس سرخ مکان کے اندر ہی تھا۔ اب اس کے ذہن میں ایک خوف ابھرا۔

''آج جمعرات ہے......آج جمعرات ہے۔''

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سوچ کر مکان میں چاروں طرف نظر دوڑائی ایک طرف کونے

میں خلا نظر آیا۔ اس نے ہمت کر کے ایک طرف پڑی ہوئی ایک انسانی ہڈی اٹھالی اور اسے ڈنڈے کی مانند ہاتھ میں پکڑے کونے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ کونے میں کچھ دور چلا۔ وہ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس لمبے سے صندوق کو دیکھنے لگا۔ جو اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔

ایک بار پھر اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس بکس پر وہی سرخ چھپکلی اسے گھورتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے ایک بار پھر حوصلہ کرتے ہوئے اس بکس کو گھسیٹ لیا اور کمرے میں لے آیا۔ اب سرخ چھپکلی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ نہ معلوم وہ کون سی قوت تھی جو اسے اس بات پر اکسا رہی تھی کہ وہ بکس کھول کر دیکھے اور پھر اس نے ڈرتے ڈرتے بکس کا تالا دیکھا اور اسے کھولنے کی ترکیب کرنے لگا۔ آخر اس نے پوری قوت سے اپنا لکڑی کا موٹا ڈنڈا تالے پر دے مارا۔ چرر کی آواز ابھری اور تالے کے ساتھ اس کی پوری پٹی اتر آئی لکڑی کا صندوق بہت خستہ نظر آیا۔ جیسے ہی اس نے صندوق میں جھانکا۔ ڈر کر چند قدم پیچھے ہٹا اور دیوار سے جالگا۔

صندوق میں اسی خوب صورت عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ خوف کی وجہ سے اب اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے اور پھر اگلا منظر اس کے لئے تقریباً روح فرسا ثابت ہوا۔ اسے اس عورت کی لاش کھڑی ہوتی نظر آئی۔ لیکن اب اس کا چہرہ بہت بھیانک نظر آرہا تھا۔

عورت کی آنکھوں کی جگہ گڑھے نظر آئے۔ وہ اس کی طرف بڑھی چوکیدار نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سرخ چھپکلی غائب تھی۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر عورت کے وجود پر پڑی تو وہ لرز کر رہ گیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی پائل کی جھنکار گونجنے لگی۔

اس نے گھبرا کر اپنے کانپتے ہوئے وجود کو دیکھا۔ پسینے سے اس کے کپڑے بھیگنے لگے۔

پھر جیسے ہی گھبرا کر اس نے سامنے دیکھا۔ عورت غائب تھی، اب وہی سرخ چھپکلی دیوار پر رینگ رہی تھی۔

خوف سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر اسی وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگ پر کسی نے دانت گاڑ دیئے ہوں۔ اس نے گھبرا کر ٹانگ کو دیکھا اسے اپنی ٹانگ پر وہی سرخ چھپکلی چمٹی نظر آئی۔ اس نے کوشش کی کہ اسے ٹانگ سے ہٹا کر دور پھینک دے لیکن اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر بری طرح چیخنے لگا۔

مسلسل دردناک چیخوں سے میری آنکھ کھل گئی۔

"وہ اس کا خون پی جائے گی۔ وہ اسے مار ڈالے گی۔" میں چلایا اور اپنے پلنگ سے اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ مگر اسی وقت میرے بڑے بھائی نے مجھے پکڑ لیا۔ چیخوں کی آواز اب مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ میری وحشت اب بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا بھیانک خواب تمام گھر والوں کو سنا دیا۔ ایک بھیانک اور سچا خواب۔

شاید قدرت میرے ذریعے اس پراسرار اور عجیب سرخ مکان کا راز ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ ان چیخوں کو معنی پہنانا چاہتی تھی۔ جو ہر جمعرات کو اس مکان سے سنائی دیتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے گھر والے میری باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں لیکن جب صبح پولیس چوکیدار کو ہر جگہ تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہ پا سکی تو انہیں میرے بھیانک خواب پر یقین کرنا ہی پڑا۔

اس بدنصیب چوکیدار کا آج تک کہیں پتہ نہیں یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ اس پر کیا گزری مجھے اب اپنے اس بھیانک خواب پر اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ میں زندہ ہوں۔

کاش میں دوسروں کو بھی وہ سب کچھ دکھا سکتا جو میں نے اس رات خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ لوگ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔



بڑھے اور نقاب پوش کا نقاب نوچ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے وہ زور سے اُچھلے۔ بیگم راشدی بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔

''تت... تو... تم...؟'' بیگم راشدی حیرت کی زیادتی سے گنگ رہ گئیں۔

خود انسپکٹر بابر کا بھی مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ صورت حال ہی چونکا دینے والی تھی۔ اُن کے سامنے زبیر راشدی کھڑا تھا۔

''تم... یہ سب کیا تھا؟'' بیگم راشدی اُلجھ کر بولیں۔

زبیر راشدی سُت چہرہ لیے کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پہ افسردگی کے تاثرات نمایاں تھے۔

''یہ کیا بتائیں گے بھلا... کوئی مجرم بھی اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے۔ دراصل یہ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے اور اگر میں غلط نہیں تو وہ دھمکی آمیز خط بھی یقیناً مسٹر زبیر راشدی نے ہی لکھا ہوگا۔'' انسپکٹر بابر نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''نن... نہیں۔ آ... آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' بیگم راشدی نے بے یقینی سے کہا۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی محترمہ۔ جس وقت یہ میرے پاس رپورٹ درج کروانے آئے تھے تو بیان قلمبند کروانے کے بعد انہوں نے جو دستخط کیے تھے۔ اُن دستخطوں کا انداز اور خط پہ لکھی تحریر کا انداز ایک جیسا تھا۔ احتیاطاً میں نے تحریروں کے ایک ماہر کو اِن کے دستخط اور وہ خط چیک کروائے تو میرے اِس خدشے کی تصدیق ہوگئی اور میں نے اِن کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر آج میں اِن کی نگرانی نہ کررہا ہوتا تو آپ کی زندگی کا چراغ اب تک گل ہو چکا ہوتا۔ اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اُس نے آپ کو بچالیا۔''

''اُف میرے خدا! لل... لیکن آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی کہ آپ میری جان کے ہی درپے ہوگئے۔'' بیگم راشدی روہانسے لہجے میں اپنے شوہر سے بولیں۔

''میں... میں تمام جائیداد کا بلاشرکت غیرے مالک بننا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تمہارے باپ نے اپنی کروڑوں کی ساری جائیداد مرنے سے پہلے تمہارے نام کردی تھی۔ میں نے دولت کے لالچ میں تم سے شادی کی۔ لیکن تم نے اپنی دولت کی ایک پائی بھی میرے نام نہ کی۔ پھر ایک دن مجھے تمہاری وصیت پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں لکھا تھا کہ تمہارے مرنے کے بعد یہ ساری جائیداد میرے نام ہوجائے گی۔ بس پھر کیا تھا...؟ دولت کے لالچ میں اندھا ہو کر میں نے یہ منصوبہ بنالیا تاکہ تمہاری دولت اپنے نام کرسکوں۔'' زبیر راشدی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولا۔

''مگر میری دولت تو آپ کے لیے ہی تھی۔ کیا ہوا جو میرے نام تھی۔ یہ ساری دولت آپ کے بغیر بے کار تھی۔ لیکن آپ نے دولت کے لالچ میں اتنا بڑا قدم اُٹھالیا کہ...'' اتنا کہتے ہی بیگم راشدی کی ہچکی بندھ گئی اور وہ زور زور سے رونے لگیں۔

''آپ کا رونا بے کار ہے۔ ایسا کرنے سے یہ چھوٹ نہیں جائیں گے۔ اپنے یہ قیمتی آنسو اِس بے کار اِنسان پہ ضائع مت کیجئے جو دولت کے لالچ میں قتل جیسے قبیح جرم کا ارتکاب کرنے جارہا تھا۔ اللہ پاک کا شکر ادا کیجئے کہ اُس نے آپ کو اِس کے شر سے بچالیا۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟ صبر کیجئے۔'' انسپکٹر بابر نے نرم لہجے میں بیگم راشدی سے کہا۔ اس کے بعد وہ زبیر راشدی کی جانب مڑے۔

''تمہارا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا مگر تم وہ دھمکی آمیز خط خود لکھ کر مار کھا گئے۔ افسوس...! تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہ دُنیا فانی ہے۔ جو کچھ اِس دُنیا میں ہے، یہیں پڑا رہ جائے گا۔ کیا یہ دولت تمہیں سزا سے بچاسکے گی؟ کاش...! اِس حقیقت سے تم بہت پہلے ہی آگاہ ہو جاتے۔''

اگلے ہی لمحے زبیر راشدی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ چکی تھیں۔





پھر وہی کتا

ایس امتیاز احمد۔کراچی

برسوں پرانی حقیقت جب سامنے آئی تو وہاں موجود سارے لوگ دانتوں میں انگلیاں دابے انگشت بدنداں رہ گئے، لوگوں کے تصور میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور جب......

اس کہانی کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اسے ہنری سلاسر نے لکھا ہے......

جولیا سالن نے صوفے پر کسی قدر نیم دراز ہوتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ڈاکٹر ایلن کے پاس آچکی تھی۔ اس کمرے میں بیٹھنے کا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کمرے کی بناوٹ قابل دید تھی۔ دیواروں پر خوبصورت مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ دوسری اشیاء کے انتخاب میں رنگوں کے امتزاج کو پیش نظر رکھا تھا اور اس وقت جولیا کی موجودگی سے اس کمرے کی خوبصورتی دوچند ہوگئی تھی۔ اس کے متناسب جسم پر ہلکے آسمانی رنگ کا اسکرٹ خوب سج رہا تھا بلاشبہ وہ خوبصورت تھی بے حد خوبصورت...... اگر وہ اداس نہ ہوتی تو شاید اور خوبصورت دکھائی دیتی اور یہ ممکن ہے کہ اداسی اس کے حسن میں اضافے کا سبب بن گئی ہو بعض چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حسن کو اداسی کے تاثرات

سے جلا مل جاتی ہے۔

وہ اپنے گلاب جیسے رخساروں پر اداسی کی جھلک لئے ہوئے کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے شوہر جارج سالمن کی طرف دیکھ رہی تھی جارج کے چہرے پر بے زاری کے آثار دکھائی دے رہے تھے یوں معلوم دیتا تھا جیسے وہ یہاں اپنی مرضی سے نہ آیا ہو۔ وہ جولیا کی طرف متوجہ نہیں تھا اچانک جولیا نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنی نشست پر پہلو بدلا اور سالمن اسے خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیوں! کیا ہوا!'' سالمن کا لہجہ بے حد خشک تھا۔

''نہ جانے ڈاکٹر نے اتنی دیر کیوں لگا دی''

جولیا نے الجھے الجھے سے انداز میں کہا۔

''عجیب بات ہے تم ذرا سا انتظار نہیں کر سکتیں''

سالمن نے برا سا منہ بنا کر کہا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ ''نہ جانے یہ عورتیں اتنی جلد باز کیوں ہوتی ہیں''

جولیا نے بڑی اداس نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو متنفرانہ انداز میں ہونٹ سیکڑ کر دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جولیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے یاد آ گیا کہ چودہ سال پہلے جب ان کی شادی ہوئی تھی تو سالمن اس پر جان چھڑکتا تا اس نے اس کی خوبصورت آنکھوں پر ایک طویل نظم لکھ ڈالی وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

''جولی! میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس میں بتدریج تبدیلی آتی چلی گئی۔ محبت کے آتشیں جذبات سرد پڑتے چلے گئے اور جولیا اپنی زندگی میں ایک خلاء محسوس کرنے لگی جو بڑھتا ہی چلا گیا۔

اس وقت جولیا کو ماضی کا ایک واقعہ یاد آ رہا تھا اور اس کے چہرے پر غم کے بادل دبیز ہوتے چلے جا رہے تھے وہ کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے تمہاری اکتاہٹ کا شدید احساس ہے سالمن!...... لیکن میں خود بھی اپنے اس کمپلکس سے بیزار ہو چکی ہوں۔ خدا جانے اس سے میرا پیچھا چھوٹے گا بھی یا نہیں''

اونہہ! سالمن نے ایسا منہ بنایا جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز اس کے حلق سے اتر گئی ہو اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت نرس کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔

''مسٹر اور مسز سالمن! ڈاکٹر آپ دونوں کو بلا رہے ہیں۔''

سالمن اور جولیا دوسرے کمرے میں پہنچے جہاں ڈاکٹر ایلن اپنی لمبی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کا استقبال کیا وہ بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا اس کی عمر بمشکل تیس پینتیس سال ہو سکتی تھی۔

''مسٹر سالمن! یہ بڑا اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے میں نے آپ کی اہلیہ سے کہا تھا کہ آج آپ کو بھی اپنے ساتھ لائیں دراصل آج آپ کی موجودگی اس لئے ضروری تھی کہ آپ کی اہلیہ پر ایک تجربہ کرنا ہے۔''

''میرے آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے ڈاکٹر جارج۔'' سالمن نے اپنی نشست پر پہلو بدل کر کہا ''میں ایسے لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہپناٹزم کو جادو یا طلسم سمجھتے ہیں مجھے علم ہے کہ اس فن کے ذریعہ طبی سائنس نے کافی ترقی کی ہے لہٰذا مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ جولیا کے کمپلکس کی وجہ معلوم کریں گے بلکہ اس کا مناسب علاج بھی کر سکیں گے۔''

ڈاکٹر ایلن پھر مسکرایا اور اس نے ایک اچٹتی سی نظر جولیا پر ڈالی جو میز کے بائیں طرف پڑی ہوئی کرسی پر مغموم مضطرب بیٹھی ہوئی تھی۔

''مسٹر سالمن! ڈاکٹر ایلن نے کہا'' میں نے سابقہ دو تین نشستوں میں آپ کی اہلیہ کے ذہن کو کافی حد تک پڑھ لیا ہے اور بڑی حد تک ان کی الجھن کا حل بھی تلاش کر لیا ہے اب میں ان پر عہد رفتہ کے تجزیئے کا

فر یہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس ضمن میں آپ سے چند وال کرنا بہت ضروری ہیں۔"

"یعنی...... کس قسم کے سوالات" سالمن کے چہرے پر ایک انجانا سا اضطراب نمایاں ہوگیا۔

"کوئی خاص نہیں" ڈاکٹر ایلین لاپرواہی سے بولا اور پھر قدرے توقف سے بولا۔ "آپ کی اہلیہ کتوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں آپ پر ان کے اس کومپلکس کا کیا ردعمل ہوتا ہے غالباً آپ ہی کے ایماء پر انہوں نے علاج کی طرف توجہ دی ہے۔"

"جی ہاں" سالمن جلدی سے آگے کی طرف جھکتا ہوا بولا "یہ میرا ہی خیال تھا کہ جولیا کو اپنے کومپلکس کے کے سلسلے میں ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا چاہئے ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چودہ سال قبل جب ہماری شادی ہوئی تھی تو جولیا کو کتوں سے اتنا زیادہ ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اب لگتا ہے...... ممکن ہے میں نے اسے محسوس نہ کیا ہو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ہی جولیا کا یہ کومپلکس شدید ہوا تھا اب ہمارا وہ بچہ بارہ برس کا ہے پھر دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد جولیا کی کتوں سے نفرت میں اور اضافہ ہوگیا تھا عجیب بات یہ ہے کہ گھٹن اور تاریک ماحول سے اسے اتنی الجھن نہیں ہوتی لیکن کتوں سے یہ اتنی بری طرح بھڑکتی ہے کہ میں بعض اوقات شدید کوفت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔" سالمن نے خوش ہو کر عجیب سے انداز میں شانے اچکائے۔

"کیا آپ اس کوفت کی تشریح کرسکتے ہیں" ڈاکٹر ایلین نے کہا۔

"تشریح" سالمن کچھ سوچتا ہوا بولا "میرا خیال ہے کہ میں اسے بیان نہیں کرسکتا۔"

"ہوں" ڈاکٹر ایلین نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

سالمن پھر بولا "جولیا کا یہ خوف اب اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ اگر اسے کوئی کتا ایک فرلانگ دور بھی نظر آئے تو اس پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگتے ہیں یہ سب کچھ ایک طویل عرصے سے جاری ہے لیکن اب یہ معاملہ کچھ اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے"

"وہ کیسے" ڈاکٹر ایلین نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل کو گردش دی۔

"اس سال ہم نے اپنی پرانی رہائش گاہ چھوڑ دی ہے اور ولسٹر کورٹ کے علاقے میں آگئے ہیں یہاں پر ہر گھر میں نصف درجن کتے موجود ہیں اور گلیوں میں بھی مارے پھرتے نظر آتے ہیں"

جولیا نے بڑی نفرت سے سالمن کی طرف دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر بڑبڑائی ڈاکٹر اور سالمن نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

"مسٹر سالمن" ڈاکٹر بولا "اس علاقے میں آنے سے پہلے آپ کو علم نہیں تھا کہ یہاں کے رہنے والے کتوں کو پالنے کے بے حد شائق ہیں"

جولیا نے اس وقت بڑے تیکھے انداز میں سالمن کی طرف دیکھا۔ سالمن کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں اور وہ گڑبڑا گیا اور بوکھلا کر میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ پر نگاہیں مرکوز کرتا ہوا بولا۔

"میں نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچا لیکن میں سمجھتا ہوں...... اور شاید آپ بھی میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز سے خوفزدہ ہو تو اسے اس چیز سے اور قریب کر دینا چاہئے تاکہ اس کا خوف دور ہو جائے کیا یہ نظریہ غلط ہے ڈاکٹر"

"میں آپ کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں"

"دیکھا؟" سالمن نے جولیا کی طرف مڑتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ ڈاکٹر کی رائے میری رائے سے مختلف نہیں ہوگی اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک کتا پال لیں تو تم اس سے مانوس ہو جاؤ گی اور تمہارا خوف جاتا رہے گا اس کے علاوہ ہمارے بچے اس کے ساتھ اچھا وقت گزار سکیں گے بچوں کو کتوں سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے۔

جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے پاس کتوں کی ایک باقاعدہ فوج ہوا کرتی تھی۔

کیونکہ ...... کتے...... بہترین دوست ثابت

ہوتے ہیں"

"دوست ہی نہیں جناب......" سالمن جلدی سے بولا "آج کے مشینی دور میں انسانوں سے زیادہ کتے معاون ثابت ہوتے ہیں اسی لیے میں ایک اچھی نسل کا کتا لے آیا تھا لیکن اس کا وجود جولیا کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں ہوا اس کے بعد ہی میں نے جولیا سے طبی مشورے کے لئے کہا تھا کہ شاید کوئی ذہنی پیچیدگی ہی اس کو مپلکس کا باعث ہو۔"

"بس اتنا ہی کافی ہے" ڈاکٹر ایلین اپنی نشست پر پہلو بدلتا ہوا بولا "ان باتوں سے مجھے آج کے تجربے میں کافی مدد ملے گی میں نے آپ کی اہلیہ کو ہپناٹزم اور اپنے اس تجربے کے سلسلے میں کافی کچھ بتادیا ہے میرا خیال ہے کہ ان کا...... کتوں سے خوفزدہ ہونا بچپن کے کسی واقعے سے تعلق رکھتا ہے وہ کوئی ایسا خوف یا جذبہ ہوگا جس سے ان کے ذہن میں گرہ ڈال دی اس گرہ تک پہنچنے کے لئے مجھے ان کے ذہن کے کئی پردوں کو کھولنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے یہی تجربہ کرنا ہوگا"

جولیا اس دوران میں خاموش بیٹھی ڈاکٹر کا منہ تکتی رہی تھی۔

پھر سالمن بولا "عہد رفتہ کا یہ تجربہ کس قسم کا ہوگا"

ڈاکٹر ایلین جو اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا میز کے ایک کونے سے ٹکتا ہوا بولا "دراصل میں آپ کی اہلیہ سے ان کی زندگی کے گزرے ہوئے سالوں کی کرید کروں گا اور اس طرح مجھے ان کا مرض معلوم کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اب میں اپنے تجربے کا آغاز کرنے جا رہا ہوں آپ سے درخواست ہے کہ باہر کے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ میں آپ کو تھوڑی دیر بعد بلالوں گا۔"

"اوہ! اچھا" سالمن کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"غالباً آپ جولیا کو انجکشن دیں گے"

"جی ہاں"

سالمن بیرونی کمرے میں آ بیٹھا لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا پانچ ہی منٹ بعد نرس آئی اور اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔

اب وہ روشن کمرہ نیم تاریک ہو چکا تھا صرف نیبل لیمپ کے ہلکے پاور کے بلب کی روشنی تھی جو اس کمرے کو روشن رکھنے میں کامیاب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جولیا آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی اس وقت اس کا چہرہ بے حد معصوم نظر آ رہا تھا اور وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔

ڈاکٹر ایلین اپنے چہرے سے پسینہ خشک کرتا ہوا بولا "آپ کی اہلیہ بہت جلد ٹرانس میں آ گئیں"

سالمن خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایلین نے جولیا کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

جولیا نے حسب ہدایت آنکھیں کھول دیں لیکن اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اور آنکھیں پتھرائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔

"جولیا" ڈاکٹر کی تیز آواز ایک بار پھر کمرے میں گونجی "کیا معلوم ہے کہ آج کونسا دن ہے؟"

"ہاں" جولیا کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی "آج بدھ ہے"

"بالکل غلط آج جمعہ ہے"

"اب بھی غلط" ڈاکٹر نے زور دے کر کہا "آج جمعہ نہیں ہے کیا تم جانتی ہو آج کونسا دن ہے"

جولیا کے چہرے پر ذرا دیر کے لئے سوچ کی لکیریں ابھر آئیں اور پھر وہ ہچکچاتی ہوئی بولی "نہیں...... مجھے نہیں معلوم"

ڈاکٹر نے سالمن کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "میں دانستہ ایسا کر رہا ہوں کہ آپ کی اہلیہ کو وقت اور جگہ کے تعین میں آسانی ہو اور ان کو اپنے اوپر اعتماد ہو جائے"

سالمن نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلادیا قدرے توقف سے ڈاکٹر ایلین نے جولیا کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "سنو جولیا میں تمہاری سابقہ زندگی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں تم اپنی پچھلی زندگی کی طرف واپس لوٹ جاؤ زندگی کے اس حصے میں جب تم

ایک چھوٹی سی بچی تھیں...... اس وقت کے سارے احساسات وواقعات مجھے بتاؤ......تم جو کچھ سوچو گی...... جو کچھ دیکھو گی......وہ من وعن بیان کردو گی۔

"اب اپنے بیان کے لئے تیار ہو جاؤ۔" ڈاکٹر چند لمحے جولیا کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اب تم دو سال کی ہو جولیا......

کیا اب تم کتوں سے خوفزدہ ہو۔"

"نہیں" جولیا کسی گہرے کنوئیں سے بول رہی تھی۔

"کیا تم ان سے مانوس ہو؟"

"ہاں"

"اچھا اب تمہاری عمر تین سال ہے کیا اب تم کتوں سے خائف ہو؟"

"نہیں"

ڈاکٹر ایلن عمر میں بتدریج اضافہ کرتا رہا اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھی بھاری ہوتی چلی گئی۔

"اب تم دس سال کی ہو" ڈاکٹر کہہ رہا تھا "کیا تم اب بھی کتوں سے مانوس ہو"

اچانک جولیا کے ساکت جسم میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے ایکبارگی اس کا جسم شدت سے کانپا اور چیخ پڑی۔

"ٹوپل......ٹوپل......واپس آجاؤ......"

"یہ ٹوپل کون ہے جولیا" ڈاکٹر نے تیزی سے پوچھا "کیا یہ کسی کتے کا نام ہے؟"

"ہاں...... یہ میرا پالتو کتا ہے بہت پیارا، سب کتوں سے پیارا......"

"ٹوپل اب کہاں ہے" ڈاکٹر نے پوچھا......

"ٹوپل......اوہ ٹوپل......مر گیا......وہ مر گیا......

جولیا روہانسی آواز میں بولی۔ "انہوں نے اسے مجھ سے دور لے جاکر مار ڈالا...... اوہ خدایا...... لیکن یہ میری غلطی ہے...... یہ سب کچھ میری ہی غلطی سے ہوا...... لیکن لیکن......اس میں بابی کی بھی غلطی ہے......"

"یہ بابی کون ہے جولیا......" ڈاکٹر ایلن نے اس کے خاموش ہوتے ہی پوچھا "کیا یہ تمہارا کوئی دوست یا

رشتہ دار ہے؟"

"میں اس سے نفرت کرتی ہوں" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔" اور وہ ہے بھی اس قابل وہ مجھے بے حد ہراساں کرتا ہے...... اسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ میرے ٹوپل کو مارتا ہے......خدا کے لئے اسے نہیں مارو"

جولیا یکبارگی چیخ پڑی اس نے اس طرح ہاتھ اٹھا رکھا تھا جیسے وہ کسی کو کسی کے حملے سے بچانا چاہتی ہو ڈاکٹر تیزی سے بولا" لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ بابی کون ہے"

"وہ میرا ہمسایہ ہے......میرا ہم عمر ہے......لیکن وہ مجھے بے حد پریشان کرتا ہے اسے جب بھی موقع ملتا ہے میرے بال کھینچ کر بھاگ جاتا ہے...... میرے کپڑوں پر کیچڑ مل دیتا ہے" جولیا جواب دیتے ہوئے ایکدم چیخ پڑی۔

"ممی......جلدی کرو ممی......جلدی کرو......"

"کیا بات ہے جولیا" ڈاکٹر نے پھر تیزی سے کہا۔

"تم اپنی ممی کو کیوں پکار رہی ہو؟"

"وہ اس کو مار ڈالے گا......وہ اس کو مار ڈالے گا"

جولیا کسی دس سالہ بچی کی طرح چلا رہی تھی۔

"کون ہے......" ڈاکٹر نے پوچھا "کون کس کو مار ڈالے گا؟"

"میں نے اس کو تنبیہہ کی تھی لیکن......" جولیا ایک دم خاموش ہوگئی وہ بہت ہراساں نظر آ رہی تھی سارا جسم کانپ رہا تھا چہرے پر خوف کی لکیریں گہری ہوتی چلی گئیں تھیں۔ یکبارگی وہ پھر جوش میں چلائی "ٹوپل...... مار ڈالو اسے ٹوپل......نوچ ڈالو اسے"

"پلیز" ڈاکٹر نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور پھر جولیا سے کہا "سنو جولیا کیا تم نے ٹوپل کو اشارہ کیا تھا کہ وہ اس پر حملہ کردے؟"

ایک لمحے کے لئے جولیا کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے اور پھر وہ پرسکون ہوگئی آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی" اس نے بابی پر حملہ کردیا تھا لیکن پہلے بابی ہی نے اسے مارا تھا غصہ میں آ کر ٹوپل اس پر ٹوٹ پڑا اس نے اس کی گردن ادھیڑ ڈالی لیکن بابی مرنے سے بچ گیا......البتہ انہوں نے ٹوپل کو ہلاک کرڈالا ہے...... لیکن غلطی میری تھی میں نے اس کو بابی پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا تھا" جولیا کی آواز بتدریج گھٹتی چلی گئی آخر میں اس نے ایک سسکی سی لی اور خاموش ہوگئی۔

ڈاکٹر ایلن اور سالمن خاموش کھڑے تھے پورے کمرے میں ایک بوجھل سا سکوت طاری تھا۔

"مسٹر سالمن" ڈاکٹر نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنے سوال کا جواب مل چکا ہے"

"ہاں......بالکل......" سالمن نے آہستہ سے کہا

"کیا اب آپ جولیا کو......"

"نہیں" ڈاکٹر نے کہا "ان کو یونہی چھوڑ دینا چاہئے خود ہوش آ جائے گا"

کوئی پندرہ منٹ بعد جولیا نے آنکھیں کھول دیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے طویل نیند سے بیدار ہوئی ہو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

اس کو بیدار دیکھ کر ڈاکٹر ایلن نے مسکرا کر کہا "آپ کے کمپلکس کی آپ کے بچپن کا ایک حادثہ ہے مس جولیا......ایک چھوٹا سا حادثہ جو آپ سے نادانستگی میں اور غیر ارادی طور پر سرزد ہوا حالانکہ اس سلسلے میں آپ کی کچھ غلطی نہیں تھی بلاوجہ آپ کے ذہن پر جرم کا شدید احساس طاری ہوگیا، بابی کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اسے آپ اپنی غلطی سمجھتے ہوئے احساس میں مبتلا ہوگئیں۔ دراصل آپ کے ذہن میں بابی کے خلاف جذبات کافی عرصے سے پرورش پا رہے تھے اور آپ چاہتی تھیں کہ بابی کو اس کی حرکتوں کی سزا ملے لہٰذا جب ٹوپل نے اس پر حملہ کیا تو آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں کہ یہ سب کچھ آپ کی خواہش کا نتیجہ تھا اور پھر آپ کے ذہن میں یہ خوف بھی پیدا ہوگیا کہ آپ کا کتا آپ پر بھی حملہ کردے گا آپ سمجھ رہی ہیں نا مسز ایلن"

جولیا نے پلکیں جھپکائے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بہرحال اب آپ کو یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے...... اب آپ پرسوں پھر آیئے گا''

جولیا کا علاج جاری رہا۔

کوئی تین ہفتے بعد جولیا ایک صبح سودا سلف خرید کر کمرے میں داخل ہوئی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی جلدی سے فون کی طرف بڑھی دوسری طرف سے ڈاکٹر بول رہا تھا۔

''مسز سالمن آپ نے گزشتہ رات کافی انتظار کروایا کیا آپ بھول گئیں کہ آپ نے مجھ سے ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا''

''اوہ...... واقعی میں تو بھول ہی گئی تھی'' جولیا نے بوکھلا کر کہا۔

ڈاکٹر آہستہ سے ہنسا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بتدریج روبصحت ہیں''

''ہاں ڈاکٹر......'' جولیا طمانیت سے بولی ''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں آپ نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے میں آج کل بڑا پرسکون محسوس کر رہی ہوں''

''بہت خوب'' ڈاکٹر نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

جولیا پھر بولی'' مجھے اٹیلا سے بڑی محبت ہوگئی ہے''

''اٹیلا؟...... کون......؟ کیا آپ نے کوئی نیا کتا پال لیا ہے؟''

''جی ہاں'' سالمن ایک کتا لے آئے تھے۔

چند اور رسمی سی باتوں کے بعد ان کی گفتگو ختم ہوئی جولیا ریسور رکھ کر اپنے شوہر کی خوابگاہ میں پہنچی جہاں ملازمہ اپنے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے لان صاف دکھائی دے رہا تھا وہاں ایک درخت کے نیچے لیٹے ہوئے بڑے سے شکاری کتے کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اس کے جسم پر چیتے کی سی دھاریاں تھیں وہ کسی اچھی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا۔

ملازمہ نے کھڑکی کی کارنس صاف کرتے ہوئے جولیا سے پوچھا ''کیا آپ بھی اس کتے کے پاس جائیں گی''

''ہاں کیوں؟'' جولیا نے حیرت سے کہا۔

ملازمہ کے چہرے پر سراسیمگی کی جھلکیاں تھیں وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''آپ کو محتاط رہنا چاہئے...... یہ کتا بڑا خطرناک ہے میری بہن جس گھر میں ملازمہ ہے پہلے یہ کتا بھی وہیں تھا اس نے ایک بار اپنی ملازمہ پر حملہ کر دیا تھا''

''اوہ'' جولیا کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔

''ایسا خطرناک کتا میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا''

ملازمہ کپڑا جھاڑتی ہوئی بولی ''مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی پر ضرور حملہ کرے گا''

جولیا نے کچھ جواب نہ دیا اس کی نظریں بار بار کتے پر مرکوز تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی ملازمہ کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اسی طرح کھڑی رہی اور پھر اچانک اپنے شوہر کے کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی اس کو کسی خاص کپڑے کی تلاش تھی جلد ہی اس کو اپنے شوہر کی پسندیدہ جیکٹ مل گئی چمڑے کی یہ جیکٹ سالمن بہت زیادہ استعمال کیا کرتا تھا۔

جولیا جیکٹ سنبھالے ہوئے تیزی سے چلتی اس جگہ پہنچی جہاں اٹیلا سر جھکائے بیٹھا تھا اس کی سرخ سرخ زبان اس وقت بھی باہر نکلی ہوئی تھی اس نے اپنے تیز نوکیلے پنجے نرم زمین میں گاڑ رکھے تھے۔

جولیا نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیکٹ کتے کی ناک کے قریب کر دی۔

''اٹیلا...... اٹیلا...... ہوشیار...... شاباش...... اس جیکٹ کی بو اچھی طرح ذہن نشین کر لو'' کتے نے گردن اٹھا کر ایک بار جولیا کی طرف دیکھا اور پھر جیکٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔





پراسرار مخلوق

ایس امتیاز احمد۔کراچی

منفی سوچ رکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی جانور کو عام جانور سمجھتے ہوئے اس پر سختی نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ جانور کوئی اور نادیدہ مخلوق ہو جو کہ......

ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ سبق بھی سبق ہے

یہ کہانی اس واقعہ سے متعلق ہے جو گزشتہ سال گرمیوں کے مہینے میں ہمارے ساتھ پیش آیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم کزنز اپنے آبائی گاؤں نور پور گئے تھے۔ جہاں ہمارے پردادا، دادی کا بہت بڑا مکان ہے، دراصل وہ شہر کی ہنگامہ پرور اور گرد آلود فضاؤں میں رہنے کی بجائے گاؤں کی سرسبز و تر و تازہ فضا اور ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تایا جان اور ابو کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شہر میں ہماری بڑی سی کوٹھی میں آ کر شہر کی آلودہ فضاؤں میں بیمار ہونا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ سو برس کی عمر کے باوجود وہ دونوں ابھی تک صحت مند اور چاق و چوبند ہیں چونکہ نور پور پنجاب کا ایک دور دراز مگر انتہائی سرسبز علاقہ ہے لہٰذا ہم سب ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نور پور آتے ہیں لیکن گزشتہ سال

نور پور میں پیش آنے والے واقعہ نے ہم سب کزنز کو بے حد خوف زدہ کردیا۔ بالخصوص مجھ سے چھوٹا فرحان جو مزاجاً چلبلا ہوا کرتا تھا اس واقعہ کی وجہ سے پورا سال گزرنے کے باوجود اب تک سہا ہوا رہتا ہے۔

دراصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہر سال کی طرح گزشتہ سال بھی نویں جماعت کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب کزنز یعنی میرے تایا ریاض احمد اور میرے ابو بشیر احمد شہر میں ایک ہی کوٹھی میں اوپر نیچے کے پورشن میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ رہائش پذیر ہیں اور ہمارا لیدر گارمنٹس کا کاروبار بھی ساتھ ہی ہے۔ چونکہ تائی جان اور امی آپس میں بہنیں بھی ہیں اس لئے دونوں خاندانوں میں مثالی محبت اور یگانگت ہے جس کے باعث ہم سب کزنز ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ تایا جان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جبکہ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن۔

بہرحال فائنل ایگزامز سے فارغ ہوتے ہی ہم سب کزنز چھوٹے ماموں جو ابھی کالج میں زیر تعلیم ہیں، کے ساتھ نور پور گاؤں روانہ ہوئے چونکہ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اس لئے ہم سب ماموں کے ساتھ بیٹھے سفر کو انجوائے کرتے ہوئے آپس میں گپیں لڑاتے ہوئے جارہے تھے۔ تینوں لڑکیاں یعنی میری بہن شمع اور تایازاد کی ثناء اور روشنی پچھلی سیٹوں پر اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ہم سب پہلے اسکول کے قصوں میں اتنے مگن تھے کہ سفر کٹنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ جب نور پور گاؤں کی حدود میں گاڑی داخل ہوئی تو ڈرائیور نے ہی ہمیں سرسبز لہلاتے کھیتوں کی جانب متوجہ کیا۔ صاف ستھری پکی سڑک کے دونوں اطراف گندم کی فصل لہلہارہی تھی اور بیچ پگڈنڈی نما سڑک سے ہماری گاڑی گزررہی تھی۔ تب ہی ڈرائیور کے کہنے پر ہم سب بے ساختہ کھڑکیوں کی جانب لپکے اور پردے ہٹا کر باہر کے خوب صورت سرسبز نظارے کی دلکشی میں محو ہوگئے تھے۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ سنہری بالیوں کے ڈھیر جیسے سورج کی روشنی میں سونے کی طرح دمک رہے تھے۔ حالانکہ یہ اور ایسے بے شمار دلکش مناظر ہمارے لئے نئے نہیں تھے لیکن قدرت کے ان دلکش فطری مناظر میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جتنی بار دیکھو یہ منظر آنکھوں کو بھلے اور دل کو تازگی بخشتے ہیں۔ جیسے صاف ستھری آلودگی سے پاک دھلی شفاف فضاؤں سے روح تر او رشفاف ہوجائے۔

بہرحال ڈرائیور کافی تیز رفتاری سے آگے کا سفر طے کررہا تھا کیونکہ دوپہر سر پر تھی اور ہم سب کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نور پور گاؤں کے داخلی پھاٹک پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں رک کر ماموں نے حلوائی کی دکان سے ڈھیر ساری مٹھائی اور دادی کی پسندیدہ مٹھائی رس ملائی خریدی تھیں۔ پھر گاڑی آگے روانہ ہوگئی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ہم ناریل، کیلے، امرود، آم اور چیکو کے سرسبز درختوں میں گھرے بڑے سے باغ کے درمیان بنے سرخ اینٹوں کے بڑے مکان کے سامنے موجود تھے۔ ڈرائیور کے برآمدے میں گاڑی پارک کرتے ہی گھریلو ملازمین نے آکر گاڑی سے سامان اتارنا شروع کیا اور ہم سب نے اندر کی جانب دوڑ لگادی۔ جہاں دادا، دادی اور گھر کے سب سے پرانے ملازم سلیم چاچا بے چینی سے ہم سب کی آمد کے منتظر تھے۔ ہم سب بڑے ہال میں پہنچے تو ساڑھے چھ فٹ کے لمبے چوڑے دادا اور نحیف دادی نے ہم سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ڈھیروں پیار کیا۔ جبکہ ملازمین ہماری آمد پہلے ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ تب دادی جان نے ہم سب کو مخاطب کرکے کہا۔

"چلو بچو! پہلے تم لوگ نہادھو کرتازہ دم ہوجاؤ۔ پھر سب مل کر بڑے ہال میں کھانا کھائیں گے۔" دادی کا با آواز بلند فرمان جاری ہوتے ہی سب کے فرمائشی پروگرام شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا فرحان بولا۔

"دادی میں نے گڑ والے چاول کھانے ہیں۔" کہنا فرحان کو دیکھ کر ذیشان اور عمر بھی پیچھے نہیں رہے۔
"اور دادی ہمیں کھانے میں آم کی کیفیتی چٹنی بھی کھانی ہے......"

ذیشان اور عمر کی اس معصومیت پر میں اور ماموں جی کھول کر ہنسے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بڑے ہال میں گاؤں کے رواجی کھانوں سے اٹھتی اشتہار انگیز خوشبوؤں نے سب کی بھوک بڑھادی تھی اور کچھ ضرورت سے زیادہ کھالینے کے باعث سب ہی قیلولہ کی غرض سے سونے مشترکہ کمرے میں آرام کے لئے چلے آئے جبکہ لڑکیاں بھری دوپہر میں اپنی دلچسپ سرگرمی کیفیتی آم اور پیپل کے گھنے درخت پر ڈالے گئے جھولوں پر جھولنے چل دی تھیں۔

شام کو پانچ بجے منہ ہاتھ دھوکر ہم سارے لڑکے ماموں کے ساتھ دادی اور دادا سے اجازت لے کر گاؤں کی نہر کی جانب چل پڑے تھے۔ جہاں ہماری ذاتی زمینیں ہیں چونکہ فصلوں کو پانی دیا جا چکا تھا اس لئے نہر میں پانی زیادہ نہیں تھا مگر ماموں کے منع کرنے پر ہم لڑکوں نے نہر میں نہانے سے گریز کیا۔ البتہ کھیتوں میں لگے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی سے سب خوب لطف اندوز ہوئے۔ وہاں موج مستی کرتے ہوئے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا اور ساڑھے چھ بجے ملگجا سرمئی اندھیرا پھیلتے ہی اردگرد کے گھروں سے دہکتے تندوروں میں پکتی روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک اور کھلی فضاء کی ٹھنڈک کے باعث ہلکی خنکی نے ہم سب کو گھر کی جانب چلنے پر مجبور کردیا۔ لہٰذا ماموں نے ہم سب لڑکوں کو بلا کے اکٹھا کیا، پھر پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ ابھی ہم گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھے کہ وہاں موجود ایک اندھے کنویں کے پاس ایک کالی بلی کو بیٹھے دیکھا۔ اس بلی کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں، جیسے کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی بولتی آنکھیں ہوں۔ میں نے بڑے غور سے رک کر اس بلی کو دیکھا تھا اور ماموں کو بھی بتایا تھا لیکن جواباً ماموں بولے۔

"دیکھو کاشان! یہ گاؤں ہے اور یہاں اب بھی پرانے زمانے کی توہم پرستی کے واقعات کو مانا جاتا ہے۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے بلی سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔ فرحان کے مزاج کو تم جانتے ہو، کہیں اس کی کسی شرارت سے ہم سب کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

ابھی ماموں نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ فرحان نے زمین سے پتھر اٹھا کے کنویں کے پاس بیٹھی کالی بلی کو مارا جو عین بلی کی داہنی آنکھ پر جا کے لگا اور وہ زور کی غراہٹ کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس سے پہلے کہ ماموں، فرحان کی اس حرکت پر سرزنش کرتے بلی کی خوف ناک غراہٹ سے سب نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

گھر پہنچ کر ہم سب راستے کے اس معمولی سے واقعہ کو بھول بھی چکے تھے کیوں کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ معمولی سا واقعہ ہمارے لئے بہت بڑی سبق آموز کہانی بن جائے گا۔

چونکہ گاؤں میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور سویرے اٹھ بھی جلد جاتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے بعد ہی سلیم چاچا نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تھی۔ لہٰذا ہم سب معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھوکر بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہوکر سب کی مشترکہ فرمائش تھی کہ آج دادی جان سے کوئی پرانے زمانے کا خوف ناک قصہ یا کہانی سنیں گے۔ لہٰذا سب نے اندر کمروں میں سونے سے انکار کردیا تھا اور کچھ اس روز فضا میں حبس بھی تھا لہٰذا ملازم سے کہہ کر ہم سب کے لئے گھر کے کھلے دالان میں چارپائیاں بچھادی گئی تھیں۔ ہم سب دالان میں پاس پاس چارپائیوں پر بیٹھے دادی کے عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے منتظر تھے حالانکہ وہ روز ہی ہمیں باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ فجر

میں باقاعدہ سر پر کھڑے ہو کر سب کو نماز کیلئے اٹھاتی تھیں جن میں سے میں اور ماموں ہی بمشکل اٹھ کر نماز پڑھتے تھے پھر دوبارہ لمبی تان کے سو جاتے تھے۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد چکن کے سفید براق سوٹ میں دادی اپنی مخصوص لاٹھی ہاتھ میں تھامے چلی آئیں۔ تو سب نے مشترکہ ''دادی کہانی سنائیں۔'' کا نعرہ بلند کیا۔ جواباً دادی اپنے پرنور چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئیں جبکہ کچھ فاصلے پر اپنے پلنگ پر بیٹھے دادا گرم حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری فرمائش سن کر دادی سے مخاطب ہو کر بولے۔

''سنو بھاگوان! کوئی بچ بچ کی خوفناک کہانی سنا کر بچوں کو پریشان مت کر دینا۔ بس اپنے اور میرے بچپن کا کوئی واقعہ سنا دو۔ ورنہ رات کا وقت ہے، بچے ڈر جائیں گے۔'' جانے دادا جان کی سرزنش میں کیا بات تھی کہ مجھے لگا انہوں نے دانستہ دادی جان کو کسی خاص بات سے روکا ہو۔ دادی نے جواب دیئے بغیر بس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا اور دادا سمجھ گئے تھے اس لئے پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو گئے۔

پھر دادی نے واقعی اپنے بچپن کا واقعہ سنانا شروع کیا جب وہ اپنے پھلوں کے باغ میں بھری دو پہری میں گھوما کرتے تھے اور کچے امرود اور کیریاں توڑا کرتے تھے۔ ابھی وہ ایسا ہی ایک واقعہ سنا رہی تھیں کہ میری نظر دالان کی منڈیر پر بیٹھی کالی بلی پر پڑی۔

چاندنی کی روشنی میں وہ بلی مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور بغور دیکھنے پر میں چونکا بلکہ اچھل پڑا تھا۔ یہ وہی بلی تھی جو آج نہر سے واپسی پر راستے میں کنویں کے پاس موجود تھی اور جسے فرحان نے پتھر مارا تھا۔ اس بلی کی آنکھ سے ابھی تک سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر بے اختیار خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ساتھ بیٹھے ماموں کو کہنی مار کے دیوار کی منڈیر پر بیٹھی کالی بلی کی جانب اشارہ کیا تب ماموں بھی بری طرح چونکے کیونکہ میری طرح انہوں نے بھی اس کالی بلی میں غیر معمولی پراسراریت محسوس کی تھی۔

دراصل وہ کالی بلی مسلسل دیوار سے ٹیک لگائے فرحان کو گھور رہی تھی اور تب ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ فرحان نے ہی اس بلی کو پتھر مار کے زخمی کیا تھا۔

''کہیں یہ بلی فرحان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔''

میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا اس لئے میں نے فوراً سے پیشتر سب کو مخاطب کر کے کہا۔

''بہت رات ہو گئی ہے، مجھے تو اس کھلے آسمان کے نیچے سردی لگ رہی ہے، چلو ہم سب اندر چل کے سوتے ہیں۔''

میرے یہ کہنے پر دادی کے بائیں گھٹنے پر سر رکھے ذیشان اور عمر نے منہ بسور کے مجھے دیکھا۔ وہ قصہ بیچ میں ادھورا چھوڑ کر وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ تھے اور فرحان بھی ان کا ہمنوا بن گیا تھا لیکن میرے اصرار پر بے اختیار دادی نے سامنے دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھا تھا اور اچھنبے میں رہ گئیں شاید انہوں نے کچھ محسوس کیا تھا۔ ورنہ ہم نے کالی بلی کی وہاں موجودگی کے بارے میں دادی کو کہیں بتایا تھا مگر جانے کیسے انہیں پتہ چل گیا تھا؟ اور انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی تھی۔ البتہ ان سب کی ضد کی وجہ سے مجھے اور ماموں کو بھی اس رات وہیں چار پائیوں پر سونا پڑا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا الارم دے رہی تھی اس لئے میں نے ذیشان، عمر اور فرحان کی ضد کی وجہ سے بالخصوص فرحان کو دادی کے ساتھ ان کے بڑے سے پلنگ پر سونے کے لئے کہا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا اور چونکہ سب گھر بھر کا لاڈلہ بھی تھا اس لئے جانے کیوں مجھے اس کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

جانے اس کالی بلی کی آنکھوں میں کیسی وحشت تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔ میں توہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا لیکن بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر فطری لگاؤ اور محبت کے باعث میرے دل میں فرحان کی فکر بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فرحان

نے اس کالی بلی کو پتھر مار کے اچھا نہیں کیا۔ جیسے وہ کالی بلی حقیقت میں جانور نہیں کوئی اور مخلوق ہو، کیونکہ جس وقت فرحان نے اس کالی بلی کو پتھر مارا تھا جب اسے اب تک اگر وہ بلی عام جانور تھی تو اس کا خون خشک ہوجانا چاہئے تھا مگر بلی کی آنکھ سے اب بھی تازہ خون ٹپک رہا تھا جس کے باعث مجھے خوف کے ساتھ ساتھ کسی انہونی کا بھی ڈر تھا۔ بہرحال دادی کے چونک کر دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھنے اور پھر خاموشی اختیار کرلینے پر مجھے بھی اچنبھا ہوا تھا۔ دادی نے بلی کو دیکھ کر انجانے پن کا تاثر کیوں دیا؟

اگر بلی ہمیں نظر آرہی تھی تو انہیں بھی نظر آئی ہوگی پھر انہوں نے اسے نظر انداز کیوں کیا؟ حالانکہ بلی کی جانب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اچانک اچنبھے کے ساتھ فکرمندی بھی امنڈ آئی تھی۔ ان کی خاموشی پر میں نے دانستہ فرحان کو دادی کے ساتھ سونے کی تاکید کی تھی۔ تب جاکر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ جانے کیوں؟ مجھے یقین تھا کہ دادی کی موجودگی میں وہ کالی بلی فرحان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد ہم سب گہری نیند میں چلے گئے، شاید کوئی رات تین بجے کا وقت ہوگا تب اچانک پیاس لگنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا اور ماموں کا پلنگ ساتھ ساتھ بچھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر بے ساختہ دادی کے پلنگ پر گئی تھی اور وہاں ان کو نہ پاکر میں بے اختیار اپنے پلنگ سے چھلانگ لگا کے اترا۔ فرحان کو قریب سے صحیح سلامت دیکھ کر میری جان میں جان آئی تو میں دادی کی تلاش میں آگے بڑھا اور تب میری آنکھیں خوف اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب میں نے دادی کو سامنے صحن کی دیوار کے پاس کھڑے دیکھا۔ میں میکانکی انداز میں چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو وہ کالی بلی سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ تیری آنکھ کو کیا ہوا؟ تیرے زخم سے تو خون بہہ رہا ہے کہ کہیں کسی شرارتی بچے نے تو نہیں مارا۔ دیکھ تو اس کو معاف کردینا۔ معصوم بچے فرشتے ہوتے ہیں۔ انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ پھر تجھے ضرورت کیا ہے، ادھر ادھر گھومنے کی۔ آ میں تیرا زخم صاف کردوں۔"

دادی اس کالی بلی سے باتیں کررہی تھیں جیسے کسی انسان سے باتیں کررہی ہوں۔ میری خوف سے گھگھی بندھ چکی تھی کیونکہ آناً فاناً دادی نے دونوں بازو پھیلا کے اس کالی بلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اس کا زخم صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ میں وہیں کھڑا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دادی

گوہر آبدار

اللہ تعالیٰ کی عبادت رات کے پہلے حصے میں پھول اور پچھلے حصے میں پھل ہوتی ہے کیوں کہ وہ وقت ہوتا ہے جب دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہیں۔

وہ بدبخت روح جس سے رب تعالیٰ نے منہ موڑ لیا ہو اب وہ خواہ جس قدر افسوس کرے اور غم میں گھلتی رہے رب تعالیٰ کو دوبارہ پانا اس کے نصیب میں نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ان ہی کو ملتی ہے جو راتوں کو جاگ کر فکر کے ساتھ ذکر الٰہی کرتے ہیں۔

بے زاری اور بے بسی کے عالم میں ترک دنیا کوئی کمال نہیں اصل کمال تو یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اللہ سے لو لگائی جائے۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

بار بار اسے ایک ہی تاکید کررہی تھیں کہ ”دیکھ شاموا! جس بچے نے بھی یہ شرارت کی ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا اسے کیا معلوم کہ تو کون ہے؟ اور ہاں شہر سے بچے آئے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ سب یہاں ہیں، تو یہاں مت آنا، وہ بے چارے خوف زدہ ہوجائیں گے۔“

دادی اپنی بات مکمل کرکے کالی بلی کو دوبارہ دیوار کی منڈیر پر بیٹھا کے کہہ رہی تھیں۔

”اب تو اپنے ٹھکانے پر جا۔ صبح ہونے والی ہے، کسی بچے کی آنکھ کھل گئی تو وہ طرح طرح کے سوال کریں گے۔“

دادی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور جانے کہاں سے میرے اندر اتنی طاقت آئی تھی کہ میں الٹے پاؤں وہاں سے تیزی سے آکر واپس اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واقعی صبح ہونے والی تھی کیوں کہ فجر کی نماز کے لئے دادی وضو کرنے اندر جاچکی تھیں۔ مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ مجھے فرحان کی فکر ستارہی تھی کیونکہ دادی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کالی بلی (جو کہ اصل میں پراسرار مخلوق تھی) اس کو فرحان نے پتھر مار کے زخمی کیا ہے۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ مجھے دادی کو بتادینا چاہئے کہ بلی کو فرحان نے پتھر مار کے زخمی کیا ہے۔

دراصل میرے دل میں اب بھی یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ پراسرار مخلوق فرحان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگرچہ دادی نے اس کالی بلی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس انجانے بچے کو معاف کردے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے لیکن میرے دل کو بے چینی لاحق تھی۔ اس لئے صبح ہوتے ہی میں نے دادی کو جالیا۔ وہ فجر کی نماز اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں ان کے فارغ ہوتے ہی میں نے ان سے سوال کرڈالا۔

”دادی! رات آپ اس کالی بلی سے جو باتیں کررہی تھیں وہ میں نے سن لی تھیں۔ دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کالی بلی کو فرحان نے پتھر مار کر زخمی کیا تھا۔ پہلے میں بھی اسے عام جانور سمجھتا تھا لیکن کل رات آپ کو اس سے باتیں کرتے سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی عام بلی نہیں بلکہ کوئی پراسرار مخلوق ہے آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہیں وہ فرحان کو نقصان نہ پہنچادے۔ پلیز آپ مجھے بتائیں آخر یہ ماجرا کیا ہے؟“

میرے اصرار پر مجبوراً دادی کو اس کالی بلی کی حقیقت بتانی پڑی۔

”کاشان جسے تم بلی سمجھ رہے ہو اور جسے فرحان نے پتھر مار کے اس کی ایک آنکھ ضائع کردی ہے وہ دراصل ایک ہندو بچے کی آتما ہے۔ شہر کے پڑھے لکھے لوگ جن، بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں کچھ نیک اور کچھ شرارتی، مگر یہ ہندو بچہ ہمارے گھر کا وفادار ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے گھر کے دوسرے بچوں کی طرح سمجھا۔ اسے ملازم سمجھ کر بدسلوکی یا تفریق نہیں کی۔ اسی لئے وہ مجھ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک رات وہ گاؤں میں لگے میلے سے واپس آرہا تھا، راستے میں کسی چور لٹیرے نے اسے لوٹ لیا اور اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین کر اسے زندہ کنویں میں پھینک کر فرار ہوگیا۔ جب وہ گھر واپس نہ لوٹا تو تمہارے دادا نے چاروں طرف ملازمین دوڑا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مایوس ہوکے واپس آگئے۔

تب چار دن بعد گھر سے قریب اندھے کنویں سے اس کی گلی سڑی لاش ملی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تمہارے ابو اور چچا بچے تھے۔ وہ ہندو بچہ ان ہی کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ اس کی بے بسی کی موت کا ہم سب کو بہت صدمہ تھا، بے چارہ اندھے کنویں میں دن رات زندہ پڑا جانے کب تک تڑپتا رہا ہوگا پھر جاکے بھوک پیاس اور زخموں سے چور بدن سے روح نکلی ہوگی۔ چونکہ ہندو دھرم میں دوسرے جنم کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے اس لئے گاؤں کے سب ہی لوگوں کا اس کی ناگہانی موت پر کہنا تھا کہ یہ بچہ دوسرا جنم لے کر اپنے

قاتل سے اپنی موت کا بدلہ ضرور لے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے پھاٹک پر ایک انجان شخص کی لاش پڑی ملی، جس کی آنکھیں کسی جانور نے پنجوں سے نکالی ہوئی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص کسی دوسرے گاؤں کا چور اچکا تھا۔ چونکہ دوسرے جنم میں اس نے بلی کی شکل لی تھی اس لئے تب ہی اپنی موت کے کچھ عرصے بعد سے اس کالی بلی نے مستقل پھر سے اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا جسے تم کالی بلی سمجھ رہے ہو۔

''دراصل یہ وہی ہندو بچہ ہے۔ وہ تمہیں بلی نظر آتی ہے مگر میں اسے اسی انسانی روپ میں دیکھتی ہوں جس میں وہ میرے گھر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ صرف مجھے انسانی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ شاید میری محبت اور انسانی ہمدردی کے صلے میں قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ سب کو ایک جانور بلی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے لیکن میری آنکھیں اسے اپنے شامو کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ بس یہی حقیقت ہے اس کالی بلی کی۔ لیکن فرحان کو اسے مارنا نہیں چاہئے تھا کیا ہوا جو وہ جانور کی شکل میں نظر آتا ہے پر ہے تو اللہ کی مخلوق!! اور اللہ کی بے زبان مخلوق کو کبھی جان بوجھ کر تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ کیا پتہ؟ کوئی دوسری مخلوق کے روپ میں موجود ہو۔''

تب میں نے فکرمند لہجے میں جواباً کہا تھا۔

''لیکن دادی اب فرحان کو وہ مخلوق نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ پلیز آپ کچھ کریں مجھے فرحان کی بہت فکر ہے۔''

میری پریشان صورت دیکھ کر دادی بھی فکرمند ہوگئی تھیں اور فوراً اٹھ کر میرے ساتھ باہر دالان کی جانب دوڑی تھیں مگر شاید ہماری باتوں میں بہت دیر ہوچکی تھی۔ جب ہم وہاں دالان میں پہنچے تو فرحان دادی کے پلنگ سے غائب تھا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی تھی اور انجانے دکھ نے میری آنکھیں اشکبار کردی تھیں۔

میری چیخ کی آواز سے سب اٹھ گئے اور آناً فاناً فرحان کی گمشدگی کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہم سب اسی وقت فرحان کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ تب اندھے کنویں کے قریب جہاں پر فرحان نے کالی بلی کو بیٹھے دیکھ کر پتھر مارا تھا۔ وہیں پر فرحان بے ہوشی کی حالت میں ملا۔ جب ماموں نے اس کی پشت پکڑ کے سیدھا کیا تو ہم سب کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں کیونکہ فرحان کی آنکھیں نکال لی گئیں تھیں اور اس کے خالی دیدوں کی جگہ گڑھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اور ماموں نے فرحان کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اسی وقت اسے لے کر گاڑی میں شہر کے اسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹرز کی بروقت ٹریٹمنٹ سے فرحان کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہوچکا تھا۔ بس ایک معمولی سی شرارت نے فرحان کو ہنستی مسکراتی دنیا کو اندھیروں میں بدل دیا تھا۔ اس دکھ اور صدمے نے ہم سب کو ادھ موا کردیا تھا۔ مگر دادی نے پڑپوتے کی محبت میں اس کالی بلی کو جو حقیقت میں وہ ہندو بچہ تھا جسے اپنے ہاتھوں سے دادی نے پال پوس کے بڑا کیا تھا ہمیشہ کے لئے گھر بدر کردیا تھا اور اپنی اس سزا کے بعد وہ کالی بلی پھر کبھی اس گھر تو دور گاؤں میں بھی دکھائی نہیں دی۔ اس نے فرحان سے اس کی شرارت کا بدلہ تو لے لیا تھا لیکن دادی کی محبت وشفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

بس تب سے خاندان کے سارے بچوں نے کسی بھی بے زبان جانور کو مارنے یا تکلیف پہنچانے سے گریز کیا۔

اگرچہ فرحان کی ذات کا اتنا بڑا نقصان ہوچکا تھا مگر اس مخلوق نے اس کی جان بخش دی تھی۔ ہم سب کے لئے یہی کافی تھا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد سے اس بلی کو سب نے پراسرار خونی بلی کے نام سے یاد رکھا۔





تم مرچکے ہو

ایس امتیاز احمد-کراچی

دونوں دوست ایک ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے کہ اچانک سامنے بیٹھے دوست نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ سامنے بیٹھے شخص کے چہرے سے گوشت غائب ہونا شروع ہوگیا جسے دیکھ کر دوست کی چیخ نکل گئی۔

حقیقت پر مبنی عشق کے ہاتھوں مجبور روح کی حقیقت جو اپنے محبوب کیلئے سرگرداں تھی

کبھی کبھی نہ معلوم کیوں یہ جی چاہتا ہے کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کہیں دور نکل جائے تنہا بالکل تنہا جہاں کوئی اسے پہچاننے والا بھی نہ ہو۔ آج کچھ میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی نہ معلوم کیوں جی بوجھل بوجھل سا تھا۔ ہر چند کہ بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جو میری اداسی کا سبب ہو۔

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔ میں ادھر سے نکلا اور یوں ہی بے مقصد ایک بس میں بیٹھ گیا۔ گولڈن مارکیٹ آیا تو مجھے کچھ ہوش آیا میں نے سوچا چلو یہیں اتر لیا جائے مگر یہاں تو کسی جاننے والوں کے ملنے کا امکان ہے پھر......؟ میں سوچتا رہا بس اپنے مین اسٹاپ تک پہنچ چکی تھی۔ میں اترنے لگا "بابو جی ٹکٹ!" کنڈیکٹر کی آواز سنائی دی۔

ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا یہ کہہ کر میں نے

جلدی سے ٹکٹ کے پیسے کنڈیکٹر کے ہاتھ پر رکھے اور تیزی سے اتر گیا۔ میں دانستہ کیفے تیریا والی فٹ پاتھ سے تیز تیز گزر رہا تھا کہ کہیں کوئی واقف کار نہ مل جائے۔ میں کیفے کے برابر والی گلی میں گھس گیا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے سنگل روڈ کی طرف نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ علاقہ شور غل سے پاک ہوگا اور اس وقت میں کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا، میں نے اپنی منزل متعین کرلی تھی۔ میں پولو گراؤنڈ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہاں اکا دکا کار گزرنے کے علاوہ قطعی سکون تھا، میں اب پریذیڈنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچ چکا تھا اس وقت یہاں سناٹا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہاں پہنچ کر کچھ خوف سا محسوس ہوا، میں اس سڑک پر بالکل تنہا تھا۔

میں نہ جانے کیوں اپنے پیروں کی چاپ ہی سے بار بار چونک پڑتا تھا۔ میری کیفیت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔ دل چاہا کہ فوراً گھر لوٹ جاؤں۔ آخر یہ وحشت کیا میں خوامخواہ اتنی رات گئے یہاں تنہا بھٹک رہا ہوں اور وہ بھی بے مقصد میں نے سوچا اور ابھی میرے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ کسی نے اچانک پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں ایک دم اچھل پڑا پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر مجھے یقین ہی نہ آیا کہ وہ ایلن تھا۔ میرا ایک دیسی عیسائی دوست۔ یہاں یہ کہاں سے آ گیا۔ میں نے سوچا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا وہ کچھ کہتا وہ بول پڑا ''کیوں پہچانے نہیں؟'' اس کی آواز میں ایک عجیب سوئی سوئی سی کیفیت تھی جیسے وہ نیند میں بول رہا ہو میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔ میں تمہیں اچھی طرح پہچان گیا ہوں ایلن...... مگر...... مگر میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ''ہاں ہاں کہو! تم غالباً یہی کہنا چاہتے ہو کہ میں اتنے عرصے کہاں رہا؟ کیوں'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بات تو یہی ہے تم شاید آج پورے پانچ سال بعد نظر آئے ہو آخر تھے کہاں؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو کہ میں لمبی باتیں صرف شراب کی میز پر کرتا ہوں۔ کیوں کیا خیال ہے؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''ہوں! تو ابھی تمہاری عادتیں نہیں بدلیں۔'' میں نے کہا۔

مگر پیارے میں تو شراب قطعی ترک کرچکا ہوں بہرحال تم اتنے دن بعد ملے ہو تو اس خوشی میں صرف تمہارا ساتھ ضرور دے سکتا ہوں۔ وہ بھی صرف بیٹھنے کی حد تک میں عہد کرچکا ہوں کہ اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔''

''ٹھیک ہے تم نہ پینا۔ تم پہلے بھی کون سی ایسی پیتے تھے آؤ چلیں۔ شاید ہوٹل اب تک کھلا ہو۔ اور تم تو وہاں کے مستقل گاہک تھے کسی زمانے میں اگر بند بھی ہوگا تو تمہارے لئے دروازہ کھل ہی جائے گا۔'' اس کی ان باتوں نے مجھے میرے ماضی میں دھکیل دیا۔ اور نہ جانے ہم نے کب ٹیکسی کی اور کب ہم دونوں اس میں بیٹھ کر چل دیئے۔

ایلن اور میں کسی زمانے میں ہم پیالہ ہم نوالہ تھے اب سے پانچ سال پہلے وہ اچانک غائب ہوگیا تھا کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے وہ جیکب لائن میں رہتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی نے اس کے بوڑھے ماں باپ کو نڈھال کردیا تھا۔ کچھ دنوں میں اس کی تلاش میں اس کے گھر آتا جاتا رہا مگر جب اس کی طرف سے قطعی ناامید ہوگیا تو میں نے اس سے صبر کرلیا۔ وہ ایک اچھا اور وفادار دوست تھا۔ مجھ سے اس کا کوئی راز چھپا ہوا نہیں تھا اور وہ بھی میرے ہر راز سے آگاہ تھا۔ اس کے غائب ہونے سے پہلے میرے علم میں تھا ایک لڑکی سے اس کا معاشقہ چل رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ وہ خودکشی کرلیتا یا شہر ہی چھوڑ جاتا۔ مجھے اس کے غائب ہونے کے بعد پہلے پہل یہی گمان ہوا تھا مگر بعد میں خود ہی میں نے اپنے اس خیال کی تردید کردی تھی اس لئے کہ مجھے وہ اپنے عشق میں اتنا سنجیدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے جب بھی اس لڑکی کا تذکرہ کیا بس یوں ہی سا جس سے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ بغیر اس کے وہ زندہ رہے...... آج پانچ سال بعد میرے اس خیال کی تائید ہوگئی تھی نہ معلوم مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور وہ واقعی زندہ تھا اس کا ثبوت یہ کہ وہ

اس وقت بیرے سے مراد سفر کر رہا تھا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ تمہارا ہوٹل آ گیا۔ اور میں بے خیالی میں ٹیکسی سے اترتے اترتے بولا بہت جلدی آ گئے اس کے بعد میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا ہم دونوں جلدی جلدی ہوٹل کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے میں ایک طویل عرصے بعد آیا تھا لیکن چند پرانے بیروں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ سمجھ گیا کہ مجھے پہچان لیا گیا ہے۔ ہم نے ایک میز کا انتخاب کیا اور بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی بیرا آ گیا۔

"جی صاحب! کیوں بھئی کیا پیو گے؟" کیرو چلے گی کہ ہر جینا؟ جیب میں ذرا پیسے کم ہیں ورنہ اسکاچ چلتی۔" اس نے میری بات سن کر کہا۔ "جو چاہے منگوا لو بیرا منتظر تھا۔ اس نے پھر مجھ سے پوچھا۔ ہاں صاحب کیا لاؤں...... ایسا کرو کہ ایک نپ کیرو وسکی لے آؤ۔ بیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے ایلن کو مخاطب کر کے کہا۔

ہاں بھئی اب شروع ہو جاؤ۔

"پہلے شراب تو آ لینے دو۔" اس نے جواب دیا بیرا شراب کی بوتل اور ایک گلاس رکھ گیا۔ میں نے سوچا کمال ہے۔ بیرے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں شراب پینا ترک کر چکا ہوں ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ میں اتنے عرصے شاید اسی لئے نہیں آ سکا کہ شراب ترک کر چکا ہوں۔ میں نے بیرے کو پھر بلایا اور کہا۔ "ایسا کرو میرے لئے ایک سیون اپ لے آؤ۔ وہ میری بات سن کر بولا۔ "تو سوڈا واپس لے جاؤں؟"

"نہیں نہیں سوڈا یہیں رہنے دو سیون اپ اور لے آؤ۔ میں نے کہا۔

بہتر ہے بیرا واپس چلا گیا اور کچھ دیر بعد ہی جب سیون اپ لے آیا تو میں نے اسے گلاس اور لانے کے لئے کہا۔ جب گلاس بھی آ گیا تو میں نے اپنے آگے سیون اپ گلاس میں انڈیل لی اور خود اپنے ہاتھ سے ایلن کے لئے پیگ بنانے لگا۔ پیگ بنا کر میں نے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لو پیو میں بھی تمہارا ساتھ دے رہا ہوں مگر میں صرف سیون اپ پیوں گا۔ یہ پورا پیگ تمہیں پینا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لئے زیادہ نہیں کیوں؟" میں نے ایلن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنا گلاس اٹھایا اور اسے سپ کر کے رکھ دیا اس نے بھی ایک ہلکی سی چسکی لے کر اپنا گلاس میز پر رکھ دیا۔ "تمہاری مسلسل خاموشی اب کھلنے لگی ہے اب بولو ناں۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں تمہیں یہی وعدہ کر کے ساتھ لایا کہ تمہیں اپنی پانچ سالہ غیر موجودگی کے بارے میں بتاؤں۔ ہاں تو سنو! یہ تو تمہارے علم ہی میں تھا کہ اب سے پانچ سال پہلے میرا ایک لڑکی کے ساتھ عشق چل رہا تھا۔ اور شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں مذہب پر یوں بھی اعتقاد نہیں رکھتا اس لئے مجھے اپنا مذہب تبدیل کر دینے میں بھی کوئی تامل نہیں اس لئے اگر میری محبوبہ کے والدین نے یہ شرط لگائی کہ مجھے مسلمان ہونا پڑے گا تو میں ہو جاؤں گا۔ اور پھر میں نے نگہت کے کہنے پر اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور اپنی تمام عادتیں ترک کر دیں۔ اس لئے کہ اس کی شادی مجھ جیسے آوارہ منش سے کر دیں۔ لیکن وہ ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

مجھے اس کے عشق کی صداقت کا اندازہ اس وقت ہوا جب اس نے یہ پیشکش کی کہ ہم دونوں کہیں کسی اور شہر میں جا کر شادی کر لیں اور وہیں رہنے لگیں مجھے اس سے اتنی امید نہیں تھی کہ وہ میرے لئے اتنی بڑی قربانی دے سکتی ہے کہ اپنے والدین تک چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے میرے دل پر اس کی بات نے بہت اثر کیا۔ اور اس اثر کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہو گیا میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے لے کر کسی اور شہر چلا جاؤں گا۔

لیکن میری راہ میں اگر کاوٹ ہے۔ تو میرے بوڑھے ماں باپ جن کے بڑھاپے کا واحد سہارا صرف میں تھا۔ میرے ارادے میں کچھ لغزش پیدا ہوئی مگر جب میں نے ایک لڑکی کی ہمت کا مقابلہ اپنے آپ سے کیا تو مجھے خود اپنے وجود سے شرم سی محسوس ہوئی میں نے سوچا کہ اگر وہ میرے لئے سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہے تو میں کیوں اس بزدلی کا ثبوت دوں۔

اور پھر ایک رات میں اور وہ چپکے سے اس شہر کو ہمیشہ

کے لئے چھوڑ گئے۔ میں اسے لے کر لاہور چلا گیا وہاں جا کر سب سے پہلے میں نے ملازمت کی کوشش کی جس میں اتفاق سے بہت جلد کامیاب ہوگیا۔ پھر سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ نجمہ سے شادی کرلی۔ اس کا اصل نام نگہت تھا مگر میں نے احتیاط کے طور پر اس کا نام بدل دیا اور اب میں بھی ایلن کے بجائے جبار بن چکا تھا۔

لیکن ابھی ہماری شادی کو مشکل سے تین مہینے ہی گزر رہے تھے کہ ایک حادثے نے میری زندگی تہہ و بالا کردی نجمہ ہر روز دفتر جاتے وقت زینے تک مجھے الوداع کہنے آتی تھی۔ میں اب اسے دل و جان سے چاہنے لگا ہم دونوں نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کیا تھا۔ میں نے جیسا کہ تمہیں ابھی بتایا کہ وہ دفتر جاتے وقت ہر روز مجھے زینے تک چھوڑنے آتی تھی۔

تو وہ ایک ایسا ہی بدنصیب دن تھا۔ میں نے جاتے جاتے اسے آواز دی کہ نجمہ میں دفتر جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت کچن میں تھی میری آواز سن کر وہ فوراً کچن سے نکلی۔ میں زینے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف بڑھی اس کا الوداعی بوسہ ہر روز مجھے دن بھر کام کرنے کے لئے تازہ دم رکھتا تھا۔ وہ اس وقت نیلی ساڑی میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ وہ جلدی سے زینے کی طرف بڑھی۔

اچانک اس کا پیر ساڑی میں الجھ گیا اور وہ اوندھے منہ زینے پر لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری یہ سب کچھ صرف چند لمحوں میں ہوگیا میں تیزی سے زینہ اترتا ہوا اس تک پہنچا اس کا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ "یہ کیا ہوگیا نگہت؟" اور پھر میری آواز بھرا گئی اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اس نے میری آواز سن کر ایک نظر میری طرف دیکھا مسکرائی اور بہت نحیف سی آواز میں بولی۔ "میری جان میں دوسری دنیا میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"نہیں! نہیں! نگہت ہم نے تو ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کیا تھا مجھے چھوڑ کر نہ جانا؟"

"نگہت! نگہت! نگ...... نگ......" اس کا سر ایک طرف ڈھلک چکا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ نگہت مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میرے کانوں میں اس کی آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ "میری جان! میں دوسری دنیا میں تمہارا انتظار کروں گی۔ انتظار کروں گی۔ انتظار کروں گی۔"

"میں چیخا نہیں انہیں تمہیں انتظا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں آرہا ہوں۔"

پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح زینے کی سیڑھیوں پر ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا تھا۔ میں مر چکا تھا۔" ایلن کہے جا رہا تھا۔

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ "کیا تم مر چکے ہو؟"

"ہاں میرے دوست میں مر چکا ہوں آج سے پانچ سال پہلے یہ دیکھو میرے سر سے اب تک خون بہہ رہا ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے سر سے واقعی خون بہہ رہا تھا جس سے اس کا چہرہ بڑا بھیانک نظر آرہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ اس کے چہرے سے گوشت غائب ہونا شروع ہوگیا۔ اور چند لمحے ہی میں میرے سامنے ایک ایسا چہرہ تھا جس پر برائے نام بھی گوشت نہیں تھا۔ وہاں صرف ہڈیاں تھیں لیکن کھوپڑی سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے طویل چیخ نکل گئی اور میں بے ہوش ہوگیا۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو میرے چاروں طرف بار کے بیرے کھڑے تھے۔ انہوں نے غالباً مجھے ہوش میں لانے کے لئے میرے منہ پر پانی کے چھینٹے بھی مارے تھے اس لئے کہ مجھے اپنا چہرہ بھیگا ہوا محسوس ہو رہا تھا میں کچھ دیر حیرت سے ان سب کو دیکھتا رہا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ان میں سے ایک بیرا بولا۔

"کیا ہوا صاحب! آپ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں اکیلے بیٹھے تھے۔ آپ نے شراب بھی نہیں پی پھر ایک دم چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے آپ کو کیا ہوگیا تھا صاحب؟"



جنات کا مہمان

ایس امتیاز احمد-کراچی

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، نوجوان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک باریش بزرگ اس کی چارپائی کے قریب کھڑے تھے انھوں نے نوجوان کا ہاتھ پکڑا تو نوجوان پر ایک عجیب سحر طاری ہوگیا۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی باذوق لوگوں کے لئے بہت ہی اچھی اور دلفریب کہانی

شاہد! پر جن کا سایہ ہوگیا......شاہد کے سر پر جن آنے لگا......لوہاری گیٹ سے شاہی مسجد تک چاروں طرف اسی بات کا چرچا تھا۔ خصوصاً عورتوں اور بچوں کے لئے یہ خبر بہت زیادہ اہم تھی...... گھر کے کام دھندوں کے بعد جہاں دیکھو دو چار خاتون بیٹھی ہوئی اسی تذکرے میں مصروف رہتیں۔

شاہد!ایک متوسط گھرانے کا سولہ سالہ لڑکا تھا......اس کے والد شاہی مسجد میں ملازم تھے، یہ مسجد اس قدر وسیع ہے کہ ایک وقت میں ہزاروں آدمی یہاں نماز ادا کرسکتے ہیں اس کے ایک جانب قلعہ اور دوسری طرف یادگار اور مغربی سمت بازار حسن اور جنوب کی طرف ایک میدان پڑتا اور پھر سڑک ملتی ہے۔

شاہد! مسجد میں اپنے والد صاحب سے قرآن شریف حفظ کرتا تھا...... قرأت بھی اس کی بہت عمدہ

تھی...... اس کے والد گھر زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے عموماً مسجد میں ہی رہتے البتہ ہفتہ، 15 دن میں گھر آ کر ضروریات گھر کی پوری کر دیا کرتے تھے...... شاہد ان کو روزانہ کھانا دینے جاتا اور رات میں کبھی گھر واپس آ جاتا یا کبھی والد صاحب کے پاس ہی رہ جاتا......

شاہد! پر جن کا اثر کیسے ہو گیا؟

یہ کسی کو معلوم نہ تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو گھر والے اس بات کو پھیلانا نہیں چاہتے تھے یا پھر کچھ اور بات تھی جس کی وجہ سے اگر کوئی اس سے ملنے گھر جاتا تو انہیں ملنے نہیں دیا جاتا...... والد کے لئے کھانا لے کر اب بھی جاتا تھا لیکن اب یادگار سے ہو کر جانے کے بجائے قلعہ اور میدان سے ہوتا ہوا شاہی مسجد پہنچا......

اس واقعہ کے بعد شاہد اکثر راستے میں مجھ سے ملتا تھا...... وہ چونکہ میرا دوست تھا، اس لئے حسب معمول میں نے پرانی بے تکلفی سے اس سے پتا کرنا چاہا لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر کترانے لگا اور مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیتا۔ آمنا، سامنا ہونے کی صورت میں بھی آنکھیں نیچی کئے رہتا...... اور بے تعلقی سے گزرنے کی کوشش کرتا...... مجھے اس کے اس رویہ پر بڑی حیرت تھی کئی دن تک سوچنے کے بعد میں نے اصلیت کا پتہ لگانے کا ارادہ کیا...... تاکہ معلوم ہو کہ وجہ کیا ہے؟

ادھر میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مجھے شاہد سے تنہائی میں ملنے کا موقع ملے، ادھر شاہد کے گھر میں ایک دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی، گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود عورتوں نے اس کے پاس پہنچنا شروع کر دیا...... جس کو دیکھو کوئی نہ کوئی حاجت لئے اس کے پاس پہنچتی رہتی لیکن شاہد کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی عورت گھر میں داخل ہوئی اس نے کہنا شروع کیا......

"ارے یہ کون غیر عورت گھر میں داخل ہوئی ہے۔ اسے روکو...... اسے روکو......"

اور پھر عورت کے داخل ہونے سے قبل ہی دوڑ کر کمرے میں چھپ جاتا...... باہر بلایا جاتا تو وہ یہی جواب دیتا۔ "میں غیر عورتوں کے سامنے کیسے آؤں؟"

آخر بڑے اصرار کے بعد وہ باہر آتا اور آنے سے قبل وہ اپنے سر پر کوئی چادر یا دوپٹہ ڈال لیتا اور جب عورتوں میں آ کر بیٹھتا تو اس کی حالت ایسی ہوتی جیسے کوئی شرمیلی دلہن گھونگھٹ کئے عورتوں میں بیٹھی ہو......

اس کے بعد پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا...... عورتیں جو کچھ پوچھتیں وہ گردن جھکائے بہت ہی آہستہ سے جواب دیتا...... لیکن جب سوالوں کی بھرمار ہوتی تو وہ آہستگی سے جواب دیتے ہوئے کہتا۔

"آپ لوگ کیوں پریشان کر رہی ہیں؟ دوبارہ میرے پاس آنے کی کوشش نہ کریں...... غیر مردوں کے سامنے عورتوں کو نہیں آنا چاہئے......"

اس کے اس جواب کا یہ مطلب ہوتا کہ اب مجلس برخواست کر دی جائے۔

آنے والی عورتوں کو کیا ملتا اور کیا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن دیکھا یہ گیا کہ آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی...... بعض عقیدت مند عورتیں مٹھائی یا دوسرے تحفے لے کر آتیں لیکن نہ تو شاہد ہی اور نہ گھر والے وہ لائے ہوئے تحفے قبول کرتے اور بڑے اخلاق اور معذرت کے ساتھ ان کو واپس کر دیتے......

پھر رفتہ، رفتہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان عورتوں کے گروہ ہو گئے۔ ان میں ایک مداحوں اور دوسرا مخالفوں کا تھا...... مداح عورتیں شاہد سے متعلق ہر ملنے جلنے والی سے نئے نئے قصے بیان کرتیں...... ان کے اس قصہ گوئی میں کچھ ملاوٹی حاشیہ آرائی بھی ہوتی جس سے مخالف گروپ کی عورتوں کو بات کرنے کا موقع ملتا اور وہ کسی نہ کسی طرح مداح عورتوں کو نیچا دکھانے کی تاک میں رہنے لگیں......

چنانچہ اب مجلس میں سوالات اور معمولات کے ساتھ ساتھ امتحانی سوالات کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اس کے علاوہ مخالف گروپ کی عورتوں نے پروپیگنڈہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اب وہ سب سے یہی کہتیں۔

"اے ہم تو جب جانیں کہ جو کچھ ہم کہیں وہ

ہمیں منگا کردے......''

اور پھر محفل فرمائشوں کا اکھاڑہ بن گئی......ایک عورت بولی۔

''ہمیں تو اسی وقت موگرے ''بیلے'' کے پھول چاہئے۔''

یہ آواز سن کر شاہد نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر فضا میں بلند کیا۔ ہاتھ کی مٹھی بند کی اور اسے دو، تین مرتبہ گردش دے کر نیچے کر کے مٹھی کھولی تو اس میں تازہ ،تازہ موگرے کی کلیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی توڑ کر لائی گئی ہیں......ایک روز!

ایک عورت نے الائچیوں کی فرمائش کی......وہ بھی اسی طرح پوری ہوئی لیکن مخالف گروپ اب بھی مطمئن نہ تھا......اس لئے ایک عورت نے تازہ تازہ گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس قسم کی فرمائش کے متعلق پہلے سے طے کر کے آئی تھی ،اس نے سوچا ہوگا کہ بند مٹھی میں مٹھائی کا آنا مشکل ہے مگر گلاب جامنوں کی فرمائش سن کر شاہد نے فضاء میں ہاتھ گھمایا اور پھر اس خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے آپ کے پاس گلاب جامن ہیں......''

شاہد کی بات سن کر وہ خاتون بہت زیادہ پریشان ہوئیں پہلے تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پر اپنے جسم کے آس پاس دیکھنے لگیں یکا یک ان کا ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے دوپٹے پر پڑا......خاتون ایک دم گھبرا کر اچھل پڑیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے سانپ پکڑ لیا ہو،اس اچھل کود میں ان کے دوپٹے کا پلو ہٹا تو سب کی نظروں کے سامنے ایک بانس کی بنی ہوئی چھوٹی سی ٹوکری کے اندر کاغذ میں لپٹی ہوئی گلاب جامنیں موجود تھیں......یہ دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ اتر گیا......دوسری عورتیں یہ کرشمہ دیکھ رہی تھیں اب سب حیرانگی کے عالم میں تھیں کہ شاہد نے آہستہ سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں جناتوں کا سردار ہوں......میں خود کسی کو پریشان کرنا پسند نہیں کرتا،اسی لئے آپ لوگ بھی آئندہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش نہ کریں، میں تو اس لڑکے کے پاس صرف قرآن شریف سننے آتا ہوں......''

اس واقعہ کے بعد پھر کسی عورت نے سوال کرنے کی ہمت نہیں کی......لیکن ایک دو روز بعد ایک دوسرا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک روز ایک صاحب نے اپنی لڑکی کے بارے میں پوچھا۔''جہاں لڑکی کی بات چیت چل رہی ہے کیا وہ جگہ مناسب ہے؟''

شاہد! ان کا سوال سن کر بڑی دیر تک سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہا......تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے سر تھوڑا اونچا کرتے ہوئے کہا۔

''جس جگہ لڑکی کی بات چل رہی ہے وہ جگہ مناسب نہیں ہے......لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔''

اور ہوا بھی یہی ان صاحب نے شاہد کا جواب سن کر جب اچھی طرح انکوائری حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہ بات صحیح ہے۔

اسی طرح! ایک محترمہ کا 15,14 سالہ لڑکا ایک ہفتے سے غائب تھا۔ پولیس میں بھی رپورٹ لکھوائی گئی اور لاہور سے باہر رہنے والے عزیزوں کو خط اور فیکس کئے گئے۔ لیکن ہر جگہ سے نفی میں جواب ملا ماں باپ پریشان تھے۔

ماں نے جب اپنے لڑکے کے متعلق شاہد سے سوال کیا تو وہ پہلے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

''آج شام تک لڑکا واپس آجائے گا۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن شام کو ان کے صاحبزادے صاحب تشریف لے آئے......ہوا یہ تھا کہ وہ ماں باپ کے لاڈلے تھے ،ایک دن ماں باپ نے کسی بات پر ڈانٹا......وہ اس چیز کو برداشت نہ کر سکے اور گھر سے نکل گئے اور پھر خود ہی گھر آگئے۔

لیکن! مجھے تو ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی

نہ تھی...... میں تو اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا...... اس لئے...... میں شاہد سے تنہائی میں ملنے کی فکر میں رہا...... ایک روز وہ مجھے میدان میں جاتے ہوئے ملا...... میں اسے بڑے تالاب کے کنارے لے گیا۔ اس لئے کہ اس قسم کی باتوں کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی......

چٹانوں! پر بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پورا واقعہ سنانے کو کہا...... پہلے تو وہ انکار کرتا رہا، آخر بڑی مشکل سے راضی ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں شاہی مسجد میں ابو سے قرأت سیکھ رہا ہوں۔ کبھی میں گھر واپس آجاتا ہوں اور کبھی رات میں وہیں رہ جاتا ہوں......''

یہ اب سے کئی مہینے پہلے کی بات ہے ایک رات میں مسجد کے باہر لان میں سو رہا تھا...... والد کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ حجرے میں تھے...... سوتے میں اچانک ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اٹھا کر بیٹھا دیا ہو، پہلے تو نیند کے خمار میں بات سمجھ میں نہ آئی لیکن پھر فوراً ایک عجیب قسم کا احساس ہوا جیسے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا تو مجھے اپنے سرہانے ایک بزرگ کو کھڑے ہوئے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ''یہ کون صاحب ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟''

اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا...... حلیہ بھی عجیب تھا...... سفید اجلا لباس پہنے ہوئے تھے، داڑھی بھی سفید تھی چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور تھا اور وہ میرے سرہانے خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔

اس حلیہ میں ایک اجنبی کو آدھی رات کے وقت اپنے سرہانے اس طرح کھڑے ہوئے دیکھ کر مجھے ڈر کی وجہ سے پسینہ آگیا۔ اس قدر خوف زدہ تھا کہ بھاگنے کا خیال کیا تو ٹانگوں میں طاقت نہ تھی...... چیخنے کی کوشش کی تو آواز نہ نکل سکی۔ مجھے اس طرح پریشان ہوتا دیکھ کر ان بزرگ نے دلاسا دیتے ہوئے شانے پر تھپکی دی۔

''گھبراؤ نہیں بیٹے! ڈرنے کی ضرورت نہیں؟'' انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں نے ان بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خوف کی وجہ سے باہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں ضرور دیکھ رہا تھا......

''تم اپنے دل سے خوف دور کرو...... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آؤ ذرا میرے ساتھ چلو۔'' بزرگ نے کہا۔

میرے لئے ان کا کہنا ماننے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اس لئے کچھ سوچے سمجھے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔

ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے مسجد کے صحن میں دیکھا، اس وقت چاندنی نکلی ہوئی تھی، ہر چیز واضح اور صاف نظر آرہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کچھ فاصلے پر ان بزرگ کی طرح کچھ اور لوگ بھی آجا رہے تھے۔ لیکن کہاں سے آرہے تھے اور کہاں جا رہے تھے، یہ میں بالکل نہ سمجھ سکا......

''آؤ! میرے ساتھ۔'' بزرگ میرا ہاتھ تھامے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں جا رہا ہوں؟ میری تو اس وقت ایسی حالت تھی جیسے مجھے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔

اب بزرگ اور میں دونوں ساتھ ساتھ مسجد کے صحن میں چل رہے تھے، ہمارا رخ موتیا تالاب کی جانب تھا جب پورا صحن پار کر کے آخری دالان کے قریب پہنچے تو ہمارا رخ اسلامیہ ہائی اسکول کی جانب ہوگیا، میرا ہاتھ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

مسجد کی چھوٹی برجی کے پاس پہنچ کر وہ بزرگ ایک لمحے کے لئے ٹھہرے، انہوں نے کچھ دیر تک برجی کی بنیادوں کو دیکھا پھر ہاتھ سے ایک لکیر بناتے ہوئے اشارہ کیا۔

یکا یک! میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ کے لئے غبار چھا گیا جس کی وجہ سے میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے غبار صاف ہونے کے بعد سامنے ایک دروازہ تھا، اس دروازے کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔

اس لئے کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ اس برجی کے نیچے اسکول کا باغ تھا۔ پھر یہ دروازہ کہاں سے آ گیا؟

جو کچھ بھی تھا...... بہر حال یہ بات میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

جب! ہم دونوں دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے دیکھا کہ نیچے جانے کے لئے بڑی خوبصورت سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میرے لئے یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے کہ پوری شاہی مسجد سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں کہیں بھی سنگ مرمر استعمال نہیں کیا گیا۔ لیکن اس دروازے میں سیڑھیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر میری سمجھ میں یہ مطلب آیا کہ شاید دروازے تک مسجد کی حد ہے اور سیڑھیوں کے بعد کچھ اور ہے......

ہم دونوں! دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے لیکن جتنے زیادہ نیچے اترتے جاتے تھے اتنی ہی زیادہ روشنی ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دن نکل آیا ہو۔ معلوم نہیں یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان یا چاند، سورج کسی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن میری نظروں کے سامنے ایک پورا شہر تھا۔ اونچے، نیچے کئی، کئی منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں کشادہ تھیں۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ تھے۔ کافی چہل، پہل تھی، لوگ چل پھر رہے تھے۔ ان چلنے پھرنے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی...... بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔

ہم دونوں! چلتے رہے...... بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ راستے میں ہر شخص ان کو سلام کر رہا ہے اور پھر ان کے گزرنے تک ایک جانب ہٹ کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ چلتے، چلتے آخر کار ہم ایک مکان کے سامنے رکے...... مکان بہت بڑا معلوم ہوتا تھا، مکان کیا تھا،

کباڑی

وہ دونوں ریستوران میں بے فکری سے چائے پینے میں مصروف تھیں کہ عمر رسیدہ عورت نے آگے جھک کر اپنی جواں سال ساتھی سے سرگوشی کی...... سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا آدمی بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے...... جواں سال لڑکی نے مڑ کر اس آدمی پر ایک نگاہ ڈالی اور بے نیازی سے بولی...... میں اسے جانتی ہوں کباڑی ہے...... ہر جگہ پرانے اور ناکارہ مال کی تلاش میں رہتا ہے۔

(شرف الدین جیلانی-ٹنڈو الہ یار)

بلکہ اسے قلعہ کہنا مناسب ہوگا...... صدر دروازے کے باہر سفید، سفید دھواں اٹھ رہا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا تھا اس لئے کہ آگ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن دھواں زمین کے مساموں سے نکل رہا تھا اور پھر بل کھا کر ایک جانب ہو جاتا، یہ دھواں صرف ایک جگہ سے نکل رہا تھا جگہ جگہ یہی حالت تھی، بزرگ نے قریب پہنچنے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر فوراً ہی دھوؤں میں زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ دیکھتے، دیکھتے دھوؤں کے بجائے کچھ لوگ انسانوں کے روپ میں کھڑے ہوئے نظر آئے بزرگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا

"یہ دروازے کے پہرے دار ہیں۔"

سب! نے جھک کر سلام کیا۔ بزرگ سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، جب ہم دروازے کے پاس پہنچے تو بہت بڑا دروازہ خود بخود کھل گیا! لیکن کھولنے والے کون تھے؟ یہ نہیں معلوم اس لئے کہ کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا جب ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ایک بہت بڑی عمارت تھی، لیکن اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے سامنے ایک کشادہ باغ تھا، وہ باغ کیا تھا جنت کا گمان ہوتا تھا، رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے، سبز

گھاس قرینے سے اگائی گئی تھی، پرندے چہک رہے تھے جگہ جگہ پھل دار درخت کھڑے ہوئے تھے، بڑے بڑے حوض تھے جن میں فوارے چل رہے تھے، میں نے اتنا خوبصورت باغ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، دل کررہا تھا کہ یہاں کی دل بھر کہ سیر کروں لیکن وہ بزرگ اب بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے چل رہے تھے۔

عمارت! میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ کافی تعداد میں مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں چل پھر رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب یا تو خدام ہیں یا نچلے درجے کے جن ہیں۔ اس لئے کہ بزرگ کو دیکھ کر جس طریقے سے وہ ان کا ادب کررہے تھے وہ ان کے خادم ہونے کا ثبوت تھا۔ کئی جگہ میں نے بچوں کو کھیلتے بھی دیکھا، وہ بزرگ کو دیکھ کر احترام سے کھڑے ہوگئے، کسی عورت یا لڑکی نے مجھے دیکھ کر نہ ہی کوئی پردہ کیا اور نہ چھپنے کی کوشش کی۔

ایسا معلوم ہورہا تھا کہ یا تو ان میں پردے کی رسم نہیں ہے یا پھر مجھ سے پردہ نہیں کیا جارہا ہے۔ ویسے راستے میں عورتیں ملی تھیں میں نے ان کے چہروں پر نقاب جیسی چیز دیکھی تھی مگر صورتیں نقاب میں ہونے پر بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم! ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں اچھے قسم کے قالینوں کا فرش تھا۔ ان پر چھوٹے چھوٹے موٹے گدے پڑے تھے اور سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں گاؤ تکیئے بھی قرینے سے لگے تھے۔ بزرگ نے مجھے ایک گدے پر لے جاکر بیٹھایا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

''بیٹا تمہیں تعجب ہوگا کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں کہاں لے کر آیا ہوں؟''

ان کے سوالات کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ایسا معلوم ہورہا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوچکی ہے، اس لئے خاموشی سے ان کی صورت دیکھنے لگا۔

''بیٹا، ڈرو نہیں بات کرو۔'' بزرگ نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

''سنو! یہ جناتوں کا شہر ہے اور میں ان سب کا امیر ہوں۔ یہ منصب ہمیں شاہ جنات کی جانب سے عطا ہوئی ہے۔ تم میرے مہمان ہو تمہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جنات میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن تم سردار کے مہمان ہو اس لئے سب تمہاری عزت کرینگے۔''

میں نے کئی بار تمہیں قرآن شریف پڑھتے ہوئے سنا ہے، مجھے تمہاری قرات بہت پسند ہے، میں اپنی بیوی اور بچوں کو بھی تمہاری قرات سنانا چاہتا تھا اس لئے تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھو، میں اپنے بچوں کو بلاتا ہوں، تم سے مل کر وہ خوش ہوں گے۔''

بزرگ نے زور سے کچھ کہا۔ دروازوں میں سے سراتی ہوئی ہوا اندر داخل ہورہی تھی۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ یکا یک مجھے سردی کی وجہ کپکپی محسوس ہونے لگی۔ خوف کی وجہ سے میرا رنگ پیلا ہورہا تھا اور میں آنکھیں پھاڑے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ابھی میں کپکپی پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرہی رہا تھا کہ چاروں طرف لرزتے ہوئے ہیولے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہیولے جسموں میں تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔ ایک لمحہ کے بعد ہی میرے سامنے عورتیں، لڑکے لڑکیاں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔

''یہی وہ بچہ ہے جس کے بارے میں میں نے تم لوگوں کو بتایا تھا۔ اس کا نام شاہد ہے اور یہ بہت اچھی قرات سے قرآن شریف پڑھتا ہے۔ آج میں تمہارے پاس اس لئے لایا ہوں کہ تم بھی اس کی قرات سن سکو۔ اچھا پہلے اس کی خاطر تواضع کرو، پھر یہ تمہیں قرآن شریف سنائے گا۔''

بزرگ کے اتنا کہنے پر پورا کمرہ سفید سفید دھوئیں سے بھر گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی لیکن جب ہوا کا زور کم ہوا تو کمرے

میں ایک بہت بڑا دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں قرینے سے پلیٹوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ پینے کے لئے ایک نئے قسم کا شربت تھا۔ اس کا رنگ نہ تو پوری طرح سفید ہی تھا اور نہ لال بلکہ عجیب طرح کا رنگ تھا۔ پینے میں اتنا اچھا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ پیتے ہی چلے جاؤں۔

مجھے اس وقت نہ تو بھوک تھی اور نہ ڈر کی وجہ سے کھانے کی خواہش تھی لیکن بزرگ کے اصرار پر کھانا پڑا۔ میرے کھانا شروع کرنے پر دوسرے لوگوں نے بھی کھانے میں میرا ساتھ دیا۔ مٹھائی بالکل تازہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے حلوائی کی دکان سے گرم گرم ابھی لائی گئی ہو۔ اسی طرح پھل بھی یہ معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے ابھی درختوں سے توڑ کر لائے گئے ہوں۔

کچھ دیر میں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر سب میری جانب دیکھنے لگے۔ اب کافی حد تک میرا ڈر بھی دور ہو چکا تھا۔ اس لئے بزرگ کی فرمائش پر سورۃ جن کا ایک رکوع میں نے قرات کے ساتھ سنایا۔ پڑھنے کے دوران سب نے مرحبا مرحبا کی تکرار کی کچھ دیر کے بعد بزرگ نے اپنے گھر والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا لڑکا کتنا اچھا پڑھتا ہے۔''

''ان کو یہاں بلایا کیجئے۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''ہاں میں ان کو یہاں لایا کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو بھی ان سے قرات سیکھنا چاہئے۔'' اچھا بیٹا، چلو میں تم کو چھوڑ آؤں لیکن ایک بات یاد رکھنا اب میرا سایہ تم پر رہے گا۔ مگر تم ڈرنا نہیں۔''

ابھی بزرگ نے بات ختم کی ہی تھی کہ یکا یک باہر سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی شخص پر سختی کی گئی ہو اور وہ اس اذیت پر کراہ رہا ہو۔ بزرگ نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ان کے منہ سے ابھی بات ختم ہوئی تھی کہ یکا یک کمرے میں دھما کہ ہوا اس دھماکے کے ساتھ ایک دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک جن نمودار ہوا لیکن وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک دوسرا جن بھی تھا جس کو پہلا جن مضبوطی کے ساتھ اپنے گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دوسرا جن ملزم ہے۔ جس کو پہلا جن پکڑ کر لایا ہے۔

''کیا بات ہے؟'' بزرگ نے پہلے جن سے پوچھا۔

''اس نے پھر شرارت کی ہے۔'' پہلے جن نے جواب دیا۔

''بتاؤ......'' بزرگ نے ملزم سے کہا۔

''میں راستے میں کھڑا تھا کہ ایک شخص نے مجھے لکڑی ماری۔''

''کس روپ میں کھڑے تھے؟''

''کالے کتے کے روپ میں۔''

''پھر تو نے کیا کیا۔''

''میں نے اس شخص کے گھر کو آگ لگا دی۔''

''تم نے شرارت کی ہے۔ اس آدمی کو کیا معلوم تھا کہ کتے کے روپ میں جن ہے۔ ویسے بھی کسی جن کو انسان کے ستانے کی ممانعت ہے لیکن تم نے ایک انسان کے گھر میں آگ لگائی ہے۔ اس لئے اب تمہاری یہ سزا ہے کہ چھ مہینے تک تم کتا بن کر انسانوں کی بستی میں گھومو گے اور اس عرصہ میں تم نے کسی قسم کی شرارت کی تو اس کی سزا تم کو ملے گی لے جاؤ۔''

''بزرگ کے لے جاؤ کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دونوں جن ہوا میں تحلیل ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئے۔

میں اس عجیب قسم کی عدالت اور فیصلے کو دیکھ کر بڑا تعجب کر رہا تھا۔ نہ وکیل نہ گواہ اور نہ کسی اور قسم کی عدالتی کارروائی۔ ایک منٹ کے اندر ہی ایک مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ ''ان کے لئے تحفہ لاؤ۔''

بزرگ نے ایک جانب دیکھتے ہوئے کہا لیکن جس جانب انہوں نے منہ کر کے کہا تھا مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ مگر ایک بار پھر ہوا زور سے چلنا شروع ہوئی اور چشم زدن میں ایک جن رومال میں کوئی چیز باندھے ہوئے کھڑا تھا۔

اس کی وضع قطع سے معلوم ہورہا تھا کہ یہ ملازم ہے۔

''لو بیٹے، یہ تمہارا تحفہ ہے۔'' بزرگ نے رومال کا بنڈل مجھے دیتے ہوئے کہا۔ میرے بنڈل لے لینے پر وہ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اچھا اب تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔''

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ ان کی آواز پھر سنائی دی۔ ''آنکھیں کھول لو۔''

میں نے آنکھیں کھولیں پہلے تو بڑی دیر تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں لیکن کچھ دیر کے بعد چاروں طرف دیکھا تو رومال کا بنڈل میرے ہاتھ میں تھا اور میں مسجد کے دالان میں اپنے بستر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

جو واقعات اب تک میرے ساتھ پیش آئے تھے ان کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ میں بڑی دیر تک رومال پکڑے ہوئے بستر کے پاس کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں اور کہاں جاؤں؟

آخر جب ہوش بحال ہوئے تو یہی مناسب سمجھا کہ والد کو جگا کر تمام واقعہ بتادوں میں نے اسی وقت اندر کمرے میں جا کر انہیں بیدار کیا اور پورا قصہ سناتے ہوئے وہ رومال کا بنڈل ان کو دے دیا۔ انہوں نے بنڈل کھول کر دیکھا تو اس میں تازہ بنی ہوئی مٹھائی تھی اور ساتھ میں چاندی کے سکے والے سو روپے بھی تھے۔ والد نے ان چیزوں کو ویسے ہی رومال میں باندھ دیا اور پھر ڈر دور کرنے کے لئے ہمت بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں بیٹا۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ میں بھی مسجد میں ان لوگوں کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ انہیں صرف تمہاری قرات پسند ہے۔ اچھا اب اذان ہونے والی ہے۔ تم بھی ضروریات سے فارغ ہوکر نماز کی تیاری کرو۔''

دن نکلنے پر میں ایک بار اس دروازے کی تلاش میں برجی تک گیا لیکن وہاں کسی دروازے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اس دن کے بعد کئی مرتبہ پھر میرا جانا ان بزرگ کے ساتھ ہوا۔ اور ہر بار پہلے کی طرح رومال میں انہوں نے مجھے مٹھائی اور روپے لپیٹ کر دیئے۔ اس کے بعد وہ گھر بھی اکثر میرے پاس آئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔''

شاہد کی کہانی بڑی تعجب خیز تھی۔ کہانی سننے کے بعد میرے لئے اب وہاں ٹھہرنا بے کار تھا اس لئے ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ لیکن کافی دنوں کے بعد ایک روز میری ملاقات شاہد سے پھر ہوگئی۔ میں نے ویسے ہی تذکرۃً اس سے پوچھا۔

''کیوں شاہد اب بھی ان بزرگ کے ساتھ تمہارا جانا ہوتا ہے۔''

''نہیں وہ سلسلہ ختم ہوگیا۔'' شاہد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے۔''

ایک روز والد نے حاضرات کے ذریعہ ان بزرگ کو بلایا۔ پھر بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتے ہوئے والد نے انہیں سمجھایا کہ ''ان کی وجہ سے لڑکے کی تعلیم و تربیت پر اثر پڑ رہا ہے۔ دوسرے ایک وقت آئے گا کہ اس کی شادی بیاہ بھی کرنی ہے۔ اس شہرت کی وجہ سے شادی میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ اپنا سایہ مجھ پر سے اٹھالیں۔ البتہ قرات سننا ہو تو مسجد میں جب شاہد پڑھے تو وہ آ کر سن سکتے ہیں۔''

پہلے تو بزرگ نے والد کی بات ماننے سے انکار کردیا بعد میں راضی ہوگئے اور اب ان کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہے۔ البتہ مسجد میں جب کبھی میں قرآن شریف پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی موجود ہیں لیکن مجھے نظر نہیں آتے ہیں۔

مجھے شاہد کی باتوں پر یقین تھا اور ویسے بھی مجھے معلوم ہے کہ اب اس کے گھر میں عورتوں کے آنے جانے کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے۔





خطرناک تجربہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ڈاکٹر کی آواز سنائی دی میں سچ کہہ رہا ہوں، تم مرچکے تھے میں نے تمہیں پھر سے زندگی دی ہے، دیکھو تمہارے جسم پر ابھی بھی کفن موجود ہے اور جب مردے کی نظر کفن پر پڑی تو اچانک......

حیرت انگیز تحیر انگیز عقل وشعور کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سائنس فکشن کہانی

ڈاکٹر نان نے مسکرا کر ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ اب وہ ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہورہا تھا۔

اس کا نام تجربہ نمبر 34 تھا۔ ڈاکٹر نان اپنے 33 تجربوں میں ناکام رہا تھا لیکن اس وقت وہ خوش تھا کیونکہ یہ پہلا تجربہ تھا جو کامیاب ہوا تھا۔

ڈاکٹر نان ایک بہت بڑا زولوجسٹ تھا اور پچھلے پچاس برسوں سے اس بات پر تجربہ کررہا تھا کہ انسان مرنے کے بعد زندہ ہوسکتا ہے۔ اس نے 33 مرے ہوئے انسانوں پر تجربہ کیا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

پہلی بار تو لاش جل کر کوئلہ ہوگئی تھی۔ اور ڈاکٹر کی جان کے لالے پڑگئے تھے۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ بری طرح جل گئے تھے۔ اس کے دوستوں نے اسی وقت کہا تھا "یہ ایک احمقانہ خیال ہے اور اسے اس خیال کو چھوڑ دینا چاہئے۔"

لیکن وہ نہ مانا تھا۔ دوسری، تیسری اور چوتھی بار لاشیں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

22ویں بار تو اسے بالکل تازہ لاش مل گئی تھی۔ یہ اس کی خوب صورت سیکریٹری کا جسم تھا جو ایک حادثہ میں مرگئی تھی۔

ڈاکٹر اس کی لاش فوراً تجربہ گاہ میں لایا۔ اس نے بہت دل لگا کر بہت سمجھ بوجھ کر اس پر تجربہ شروع کیا۔

لیکن لاش میں صرف تھوڑی دیر حرکت ہوئی تھی اور پھر ختم۔

پھر ڈاکٹر بالکل ناامید ہوگیا تھا لیکن تجربے کرتا رہا تھا لیکن بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی کہ لاش میں حرکت ہوتی اور اس کے آگے کچھ نہیں...... وہ شاید ارادہ ترک کردیتا لیکن اتفاق سے اس کے چھوٹے بیٹے کا نمونیہ میں انتقال ہوگیا اور ڈاکٹر کو اسے زندہ کرنے کا خبط سوار ہوگیا۔

وہ لڑکے کی لاش کو تجربہ گاہ میں اٹھا لایا۔ لوگوں نے اسے بہت روکا اور اسے سمجھایا کہ اس طرح لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

اس کے ایک دوست نے کہا...... ”تم پاگل ہوچکے ہو۔“

”مجھے پاگل ہی رہنے دو۔“

”ہم لوگ تم سے ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔“

”چھوڑ دو۔“

”تمہیں کامیابی کبھی نصیب نہ ہوگی۔“

”ہوگی اور ضرور ہوگی ایک دن آئے گا جب تم لوگ مانو گے۔“ یہ سن کر اس کے دوست خاموش ہوگئے۔

اس نے بیٹے کی لاش پر تجربہ شروع کیا۔ متواتر تین دنوں تک وہ تجربہ کرتا رہا۔ اور آخر میں وہ اچھل پڑا۔

لاش میں حرکت ہوئی۔ اور پھر اس نے آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی نحیف آواز میں اس نے کہا...... ”ڈیڈی...... ڈیڈی......“

ڈاکٹر نان خوشی سے پاگل ہوگیا اور اپنے بیٹے سے لپٹ گیا اور یہی اس سے غلطی ہوئی۔

وہ لاش سے لپٹا رہ گیا تھا کہ اس کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ اس کی چیخ سن کر اس کا فرسٹ اسسٹنٹ اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر بے ہوش ہوچکا تھا۔ اسسٹنٹ نے جلدی سے بٹن دبا کر لاش میں دوڑتی ہوئی بجلی ختم کردی اور ڈاکٹر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر جب ہوش میں آیا تو اس کا سارا جسم جیسے شل ہوگیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔

”میرا تجربہ......!“

”سر! وہ کامیاب نہ ہوسکا۔“

”کیا بکتے ہو، میں نے خود اپنے کانوں سے اپنے بیٹے کی آواز سنی تھی۔“

”لیکن سر......“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”آپ کو میں نے لاش سے لپٹے ہوئے دیکھا تھا لہٰذا میں نے کنکشن آف کردیا تھا۔ اور پھر......“

”واہٹ نان سنس تو کیا پھر وہ مرچکا تھا؟“

”جی ہاں۔ پھر اس کی لاش کوئلے میں تبدیل ہوچکی تھی۔“

”اوہ، یو فول!!“ ڈاکٹر نے کراہ کر کہا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

ڈاکٹر کو صحت یاب ہونے میں آٹھ ماہ لگے تھے۔ لیکن تندرست ہونے کے بعد اسے ایک لاش پھر مل گئی۔ اور اس نے اپنا تجربہ پھر سے دہرایا۔

اور اس بار لوگوں نے سمجھا کہ واقعی وہ کامیاب ہوگیا ہے۔ کیونکہ لاش زندہ ہوگئی تھی۔ اس نے لوگوں سے گفتگو بھی کی تھی۔ بہت سی باتیں کی تھیں...... لیکن تیسرے دن وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔

33 تجربوں میں ناکام ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر ناامید نہیں ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہوچکا تھا کہ وہ کامیاب ہوگا۔ اور ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اب 34ویں تجربے کے لئے اسے لاش نہیں مل رہی تھی۔

کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اپنے کسی عزیز کی لاش کو ڈاکٹر کے تجربے کی بھینٹ چڑھا دیں۔

شاید ڈاکٹر کو کوئی لاش مل ہی جاتی لیکن ایک دن حکومت کی طرف سے ایک کاغذ ملا جس میں تحریر تھا۔

''ڈاکٹر نان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب وہ کوئی تجربہ نہیں کریں گے اور اگر انہوں نے کوئی تجربہ کیا تو حکومت کی نظر میں وہ مجرم قرار دیئے جائیں گے۔''

ڈاکٹر نان پریشان ہوگیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن حکومت کی طرف سے اسے تجربہ کرنے کی اجازت نہ ملی۔

پھر وہ بہت بے چین رہنے لگا۔ بسا اوقات وہ اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیتا اور زور زور سے چیخنے لگتا۔

چھ ماہ کے اندر ہی اس کے اسسٹنٹ اسے چھوڑ کر چلے گئے، لوگوں نے اسے پاگل کا خطاب دے دیا۔

اور اب وہ اپنی کوٹھی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ہر وقت وہ یہی سوچتا رہتا کہ اپنے تجربے کو کس طرح پورا کرے، بغیر لاش کے وہ کوئی تجربہ نہیں کرسکتا تھا۔ اور لاش کیا اب تو زندہ بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔

ایک جاڑے کی سرد رات کو وہ گھر سے باہر نکل پڑا۔ اس کے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑا تھا۔ اس کے قدم ایک قبرستان کی طرف اٹھ رہے تھے۔

وہ بہت خاموشی سے قبرستان میں داخل ہوا۔ ایک قبر کے قریب پہنچا پھر اس کی کدال ایک قبر پر پڑ رہی تھی۔

وہ ساری رات قبر کھودتا رہا۔ تقریباً تین بجے اس نے قبر کھود لی۔ اور قبر کے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے بغیر دیکھے قبر سے لاش نکالی، کاندھے پر ڈال کر وہ بھاگتا ہوا اپنی کوٹھی پہنچا اور لاش تجربہ گاہ میں رکھ دی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اس کی سانس پھول گئی تھی۔ سارا بدن درد کر رہا تھا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان لاش کو دیکھتا رہا، باوجود اس کے کہ وہ بہت تھک گیا تھا اس نے اپنا تجربہ اسی وقت شروع کردیا......

وہ اٹھا اور اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ سارے کمرے میں الفا کیورویز دوڑنے لگی۔ پھر اس نے لاش کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا۔ بیس منٹ تک وہ لاش دیکھتا رہا۔

اچانک لاش میں حرکت شروع ہوئی۔ وہ جلدی سے میز کی طرف بڑھا۔ لاش کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ وہ جلدی سے گھوم کر دوسری میز پر آیا۔ جلدی جلدی چند فلاسکوں میں پڑی ہوئی دواؤں کو اس نے ایک گلاس میں ڈالا۔ ایک گاڑھا ہلکے نیلے رنگ کا سیال تیار ہوگیا تھا۔

وہ گلاس لئے ہوئے حرکت کرتی ہوئی لاش کی طرف بڑھا۔ اور دوسرے لمحے اس نے گلاس لاش کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند لمحوں میں گلاس خالی ہوگیا۔

اب وہ گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آٹھویں منٹ پر وہ لاش پر جھک گیا۔ لاش نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

''میں...... کہاں ہوں؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں تم ڈاکٹر نان کی تجربہ گاہ میں ہو۔'' ڈاکٹر بولا۔

''لیکن ...... لیکن ...... میں ......'' لاش کی آواز سنائی دی۔

''ہاں تم مر چکے تھے، میں نے تمہیں پھر سے زندہ کیا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز مسرت سے کپکپا رہی تھی۔

''ک...... ک...... کیا......؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں تم مر چکے تھے، میں نے تمہیں پھر سے زندگی دی ہے یقین کرو، دیکھو تمہارے جسم پر ابھی تک کفن موجود ہے۔''

زندہ ہونے والے نے اپنے کفن کی جانب دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، وہ ڈاکٹر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، اچانک اس نے کہا۔

''آ...... آپ کون ہیں؟''

''میں ڈاکٹر نان ہوں۔''

''اس وقت کیا بجا ہے؟''

''اس وقت دن کے ساڑھے دس بجے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب زندہ ہونے والے کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظریں ایک جگہ پر رک گئیں اس کی نظریں کلینڈر پر لگی ہوئی تھیں۔

کلینڈر پر 2036ء تحریر تھا۔ زندہ ہونے والے مردے نے مڑ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور پھر انگلی اٹھا کر

کلینڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''ی۔۔۔۔۔۔یہ کلینڈر۔۔۔۔۔۔؟''
''ہاں یہ 2036ء آج 21 نومبر ہے۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔''تم کب مرے تھے؟''
''میرا خیال ہے 1938ء میں۔'' زندہ ہونے والے نے سوچتے ہوئے کہا۔
''اوہ! ڈاکٹر میں باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں اتنے دنوں میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''
''ضرور جاؤ۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تم کسی سے نہیں کہو گے کہ تم پھر سے زندہ کئے گئے ہو۔''
''یس ڈاکٹر!''
''اور ہاں! تم کو واپس لوٹ کر یہیں آنا ہے۔ رات میں تم کو یہیں رہنا ہے۔''
''آپ مطمئن رہیں ڈاکٹر!''
''تم جاسکتے ہو۔ لیکن ٹھہرو! جانے سے پہلے لباس تبدیل کرلو۔'' اور پھر تجربہ نمبر 34 کمرے سے باہر نکل گیا۔
تجربہ نمبر 34 کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر نے ٹیلی گاما ویژن آن کردیا تھا۔ اور اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی نظریں پھر ٹیلی گاما ویژن پر جمادیں۔
تجربہ نمبر 34 ڈاکٹر کی کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا۔ سڑک پر اسے کسی قسم کا ٹریفک نظر نہیں آیا تھا۔ اور اسے اس پر تعجب ہوا تھا، وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک آدمی نے اس کے قریب آ کر کہا۔
''آپ کو کہاں جانا ہے؟''
''کیوں؟ آپ سے کیا مطلب؟''
''جناب آپ جس سڑک پر کھڑے ہیں یہ میری ہے۔''
''کیا بکتے ہو؟ سڑک بھی کسی کی ہوتی ہے؟''
''دن میں زیادہ شراب پی کر باہر نہیں نکلنا چاہئے جناب۔'' سڑک والے نے اس کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا بکواس ہے! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے شراب پی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے خود تم نے پی ہے۔''
شاید ان دونوں میں جھگڑا ہوجاتا۔ لیکن اس وقت ڈاکٹر نان نے اپنے ٹیلی الفافون پر سڑک والے سے گفتگو کر کے معاملہ رفع دفع کردیا تھا۔
ڈاکٹر نان سے گفتگو کرنے کے بعد سڑک والے نے تجربہ نمبر 34 کو گھور کر دیکھا اور ایک بٹن دبادیا تھا اور تجربہ نمبر 34 کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے سڑک کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ سڑک دوڑ رہی تھی۔ اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ بازار کھلے ہوئے تھے لیکن دکانوں پر کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ لوگ آتے تھے، بٹن دبا کر کاغذ مشین میں رکھ دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے لیکن وہ دیکھتا جارہا تھا۔ اچانک اسے ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ اور اس نے سڑک والے سے سڑک روکنے کو کہا۔ سڑک رک گئی تھی۔
اسے بہت زور سے بھوک لگی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا تھا۔ اور اب کیبن میں داخل ہوا۔ اور ویٹر نے مینو اس کی طرف بڑھادیا۔
''تجربہ نمبر 34 نے مینو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
''وہاٹ نان سنس! یہ کیا ہے؟''
''مینو!'' ویٹر نے گھبرا کر کہا۔
''یہ مینو ہے یا کسی دوا کمپنی کا اشتہار، یہ وٹامن کامپلیکس کاربوہائیڈریٹ الفا پروٹین یہ سب کیا ہے؟''
''سر! یہ سب کھانے کی چیزیں ہیں۔''
''کیا؟ کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ جاؤ کھانے میں روغن جوش ایک پلیٹ اور ایک پلیٹ چکن فرائی لاؤ۔''
''سر! میں نے تو ان کھانوں کا نام آج تک نہیں سنا، ہمارے یہاں مینو میں یہ کھانے نہیں ہیں۔''
''کیا بکتے ہو؟''
''سر! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''
''اوہ!! ارے بے وقوف میں کھانا مانگ رہا ہوں۔''
''سر! کھانے میں وہی مل سکتا ہے جو مینو میں ہے۔''
''اچھا جاؤ مٹن وٹامن ایک پلیٹ، وہیٹ کاربو

ہائیڈریٹ لے آؤ۔‘‘ ویٹر چلا گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ویٹر کتنا بے وقوف ہے کہ وہ کھانا نہیں سمجھتا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ اور آنکھیں بند کئے بیٹھا ہوا تھا۔

اچانک ایک تیز قسم کی خوشبو اس نے محسوس کی اور آنکھیں کھول دیں۔ سامنے 19,18 سال کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں ہے۔ وہ بالکل عریاں تھی، اس کے جسم کا ہر حصہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی بھرپور جوانی اس کے سامنے تھی۔ صرف چار گرہ کپڑا اس نے اپنی کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی بھرپور جوانی دعوت دے رہی تھی۔

اس نے شرما کر آنکھیں بند کرلیں۔ ’’کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟‘‘

’’آں......‘‘ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

’’میں نے کہا اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔‘‘

’’ضرور، ضرور۔‘‘

’’وہ بیٹھ گئی اس نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ ’’آپ بہت خوب صورت ہیں۔ مرا جی چاہتا ہے کہ آپ میرا ایک بوسہ لیں پلیز! کس می۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ہاں...... کیا حرج ہے آپ جیسے خوب صورت آدمی کا ایک بوسہ ہی مجھے سکون بخشے گا۔‘‘

’’سنئے مس! میں اس طرح کی گفتگو پسند نہیں کرتا۔‘‘

’’آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں، خیر جانے دیجئے۔‘‘ اس نے اداس ہو کر کہا۔ دونوں چند لمحوں تک خاموش رہے۔

’’تجربہ نمبر 34 کی عجیب حالت تھی۔ سامنے ایک خوب صورت جوان جسم تھا جو بار بار اس سے کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔ اتنا بھینچو کہ میرے نس نس میں درد کی لہر اٹھنے لگے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو قابو میں کئے ہوئے تھا۔

’’کیا میرا جسم خوب صورت نہیں؟ کیا میرا سینہ ٹھوس نہیں ذرا چھو کر دیکھئے۔‘‘ اچانک لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تجربہ نمبر 34 نے نظریں اٹھا کر دیکھا، لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ’’پلیز! مجھے اپنے سینے سے لگالو ورنہ میں مرجاؤں گی۔‘‘ لڑکی بولی۔

’’ذرا ادھر دیکھو۔‘‘ لڑکی نے اپنی ایک انگلی بائیں والی میز کی طرف اٹھائی اور تجربہ نمبر 34 کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک مرد اور ایک عورت بڑے اطمینان سے بوس و کنار میں مشغول تھے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی نظریں پھیرلیں۔

لڑکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ’’تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟‘‘ اور پھر اس نے تجربہ نمبر 34 کا ہاتھ اپنی سفید دہلی ہوئی گولائیوں پر رکھ دیا۔

تجربہ نمبر 34 نے جلدی سے گھبرا کر اپنا ہاتھ ہٹالیا لیکن اسے یہ احساس ضرور ہوگیا تھا کہ لڑکی عریاں نہیں ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ہاتھ گرم گوشت پر نہیں کپڑے پر پڑا تھا۔

’’اوہ......!‘‘ اس نے آنکھیں بند کرلیں...... ’’اتنا پتلا لباس! اس کے زمانے میں تو نائیلون کو ہی بہت پتلا سمجھا جاتا تھا۔‘‘ اس نے سوچا۔

’’ڈارلنگ......!‘‘ لڑکی کی آواز کانوں میں آئی ’’......آؤ......‘‘ اور پھر لڑکی نے اپنے بغل میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھلی نما کپڑا بھی اس کے جسم پر نہیں تھا، وہ اس کی طرف بڑھی۔

’’ڈاکٹر!‘‘ تجربہ نمبر 34 زور سے چلایا...... ’’میں زندہ نہیں رہنا چاہتا مجھے زندگی کی ضرورت نہیں...... ڈاکٹر! ڈاکٹر!‘‘

اور ڈاکٹر نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے دیکھا۔ اسٹریچر پر پڑی ہوئی وہ لاش بھی کوئلے میں تبدیل ہو چکی تھی۔



حسین روح

ایس امتیاز احمد - کراچی

آواز سنائی دی، تم کون ہو اور رات کی اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کیا کررہی ہو، میں ایک روح ہوں اور سو برس پہلے بھی اسی طرح کی تھی جیسے آج تمہارے روبرو ہوں، میں نوجوان کا خون پی جاتی ہوں مگر تمہاری نوعمری اور وجاہت کے پیش نظر......

ذہن کو فرحت بخشتی اور دل کو لبھاتی ہوئی ایک انمٹ کہانی..... جو اپنی مثال آپ ہے

ساون کی گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھ رہی تھیں یکا یک بجلی کی کڑک کے ساتھ ایک شعلہ سا چمکا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی، کائنات پر اندھیرا طاری ہوگیا اسے نور پور کے قلعہ کے کھنڈرات کی شکستہ چہار دیواری میں ایک سوار شکستہ حال پانی میں شرابور اس پناہ گاہ کو غنیمت سمجھ کر داخل ہوا اور ایک شکستہ دالان میں پہنچ کر گھوڑے پر سے اترا اپنے کپڑے نچوڑے اور خشک کرنے کو پھیلا دیئے پھر گھوڑے کو زین و بار سے آزاد کرکے چارے کی تلاش میں چھوڑ دیا۔ گٹھری میں سے نکال کر کچھ کھایا اور ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

بارش برس رہی تھی قلعہ کے کھنڈرات میں جا بجا پانی بھرا ہوا تھا، رات کی تاریکی میں کچھ نہ سجھائی دے رہا تھا، بس وہ اتنا اندازہ کرسکا کہ وہ کسی ویران غیر آباد مقام پر پناہ گزیں ہے۔ اس کا پستول اور خنجر اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔ بارش نے خنکی پیدا کردی تھی اور اس کا کمبل بھی بھیگا ہوا تھا اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس علاقہ میں قیام پذیر ہے۔

رات گزر رہی تھی، تھکان اور طویل سفر نے اس پر غنودگی طاری کردی اور وہ اسی ستون کے سہارے سو گیا۔

رات تقریباً آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی کہ ایک کھٹکے کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہ تھا، اب بارش تھم چکی تھی آسمان صاف تھا اور کہیں کہیں تارے بھی اکا دکا نظر آنے لگے تھے اس کا وفادار گھوڑا ابھی قریب ہی آرام کررہا تھا۔

مسافر نوجوان خوب صورت اور بہادر تھا اس نے اس کھٹکے کو محض وہم سمجھا اور مسکرا کر رہ گیا، وہ سوچنے لگا یہاں کون بدقسمت آسکتا ہے، سوائے مجھ جیسے مفرور انسان کے۔ اب کپڑے خشک ہوچکے تھے اس لئے وہ ستر پوشی کرنے کے بعد کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا، ابھی غنودگی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ پھر ویسا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی دستک دیتا ہو، مگر وہاں کوئی دروازہ نہ تھا جا بجا صرف ملبے کے ڈھیر نظر آرہے تھے تاریکی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس کو قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی وہ سمت کا تعین نہ کرسکا، البتہ خنجر ہاتھ میں اٹھالیا کہ شاید کوئی موذی جانور آنکلا ہو۔ یا یہ اس کا مسکن ہو۔

آواز پھر رک گئی۔ کھنڈرات میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ ”اوہ...... میں کہاں ہوں اس ویرانے میں بھی سکون نہیں۔ پھر چاپ سنائی دی۔ اب اس نے صحن میں ایک



سایہ دیکھا، انسانی سایہ ایک سفید چادر میں سر سے پیر تک لپٹا ہوا خاموش سامنے کھڑا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔

مسافر نوجوان حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سنبھلا اور چیخ کر کہا..... ''کون ہو تم؟'' وہ سایہ اب بھی خاموش کھڑا تھا۔

''میرے ہاتھ میں خنجر ہے اور میرا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ تم جو کوئی بھی ہو اپنا چہرہ کھولو اور میرے قریب آؤ۔ ورنہ مجھے آنا پڑے گا۔'' مسافر نے کڑک دار آواز میں کہا، سایہ حرکت میں آیا اور کچھ قریب آ کر کھڑا ہوا اپنا چہرہ کھول دیا چادر گرادی۔

مسافر ایک حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا جس کے سیاہ بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے اور وہ سنگ مرمر کے مجسمہ کی طرح کھڑی اس نوجوان مسافر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحہ یوں ہی بیتا نوجوان مسافر نے پھر سوال کیا۔ ''اے کھنڈر کی پری رو حسینہ تم کون ہو اور اس ویرانے میں سیاہ رات کی تنہائی میں کیا کر رہی ہو؟''

وہ مسکرائی اور اس کے خوب صورت موتی جیسے شفاف دانتوں کی لڑیاں کھل گئیں۔ مسافر بولا۔ ''تعجب ہے تم پری ہو یا کوئی روح قدرت نے تمہیں سراپا حسن سے نوازا ہے اور تم اس ویران کھنڈر میں بھٹک رہی ہو۔ کون ہو تم؟''

اس کے پیہم اصرار پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ انگلی کے اشارے سے کھنڈرات میں شمال کی طرف اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور خود چل پڑی، نوجوان نے اس کی پروقار چال کو دیکھا اور سحر زدہ سا ہو کر اپنا خنجر اور پستول اٹھا کر اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ دوسری راہداری سے گزر کر نشیب میں اتری اور ایک نیم شکستہ سائبان کے تلے رک گئی۔ وہ بھی اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ اس کے حسن کی خوشبو میں ایک لطیف اثر محسوس کر رہا تھا۔ وہ مسکرائی پھر جھک کر ایک وزنی پتھر سرکایا۔ اندر خلاء میں ایک زینہ نظر آیا وہ اس میں اتر گئی اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اجنبی نوجوان بے خوف وخطر سیڑھیوں پر اس کے پیچھے اترنے لگا اور وہ غار کی دراڑ خود بخود بند ہوگئی۔ مدھم سی روشنی میں سیڑھیاں ایک موڑ مڑ کر ختم ہوگئیں اب وہ ایک دیوان خانے میں تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اس میں ایک صاف ستھرا فرش اور فرش کے اوپر ایک چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ روشن دان میں سے صبح کے نور کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور صبح زندگی کا پیغام دے رہی تھی اور جب اس نے گھوم کر دیکھا تو وہ حسینہ غائب تھی۔ حیرت زدہ ہو کر وہ اس کو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جو پلک جھپکتے میں غائب ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ کوئی بلا یا آسیب ہے۔ خیر..... دیکھا جائے گا..... جو بھی ہو..... نمٹنا ہی پڑے گا۔

چند لمحات اسی حیرت کے عالم میں گزرے کہ یکایک پشت کی طرف ایک دروازہ نمودار ہوا اور وہ حسینہ ساڑھی میں ملبوس بہ صد ناز و انداز ایک تھالی میں خشک میوے اور اشیائے خوردنی لے کر سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''پہلے یہ بتاؤ یہ سب کیا اسرار ہے۔ تم کون ہو اس ویران کھنڈر میں تنہا کیوں رہتی ہو؟'' نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

حسینہ کے لبوں پر پہلی بار حرکت ہوئی اور کہا۔

''تم میری زندگی میں پہلے شخص ہو جس کو میں نے پسند کیا اور مہمان بنایا۔ تم خوب صورت اور جوان ہو تمہاری معصوم جوانی نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ مہمان بنانے پر مجبور ہوگئی ایک بھولی بسری کہانی یاد آ گئی..... وہ بھی ایسا ہی تھا.....'' چند لمحوں کے لئے رکی اور پھر بولی۔ ''تم کچھ کھالو رات سے بھوکے ہوگے؟''

''میں نہیں کھاؤں گا پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔'' مسافر نے ضد کے انداز میں کہا۔

حسینہ مسکرائی۔ ''بہت ضدی ہو بچوں کی طرح۔ کیا صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم تم اس وقت پاس پاس ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں..... یہ لمحات قیمتی ہیں ان کو ضائع نہ کرو پھر ہم کہاں اور تم کہاں..... یہ لو کھاؤ پھر کچھ جواب بھی دوں گی۔''

"تم بھی میرے ساتھ کھاؤ میں اکیلا نہیں کھاؤں گا۔" مسافر نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔

"بڑے ضدی ہو۔" یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ کھانے لگی۔ جب دونوں کھا کر فارغ ہوئے تو حسینہ نے کہا۔ "اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم کون ہو، تو کیا تم ایک اجنبی کو حقیقت بتا سکو گے اعتماد کر سکو گے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "اس کو حقیقت بتانے میں کچھ حرج نہیں اعتماد ہو یا نہ ہو ہم اجنبی ہیں اپنی اپنی منزل جدا ہے۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے کہ میں ایک قاتل ہوں اور قانون کی گرفت سے مفرور ہو کر یہ پہلی پناہ گاہ نظر آئی اور طوفانی بارش نے مجبور کر دیا کہ ان کھنڈرات میں پھر تم کو دیکھا اور تمہاری یہ جوانی اور حسن نے مسحور کر دیا اور اب تمہارے پاس ہوں۔"

حسینہ نے پوچھا۔ "کچھ ماضی اور خاندان، شکل سے تو قاتل معلوم نہیں ہوتے۔"

اجنبی نے جواب دیا۔ "ماضی میں تلخیاں ملیں میں تنہا ہوں...... قاتل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ دو فریق جب جنگ کرتے ہیں تو ایک کو شکست لازمی ہے۔ بہر حال میں قاتل گردانا گیا ہوں کوئی نہ جان سکے گا حقیقت کیا تھی اور اب نہ معلوم میری منزل کہاں ہوگی۔"

حسینہ نے کہا۔ "تم بھی میری طرح مظلوم ہو۔ تم اپنی زندگی بچانے کے لئے فرار کی جدوجہد کر رہے ہو جبکہ میں اس زندگی سے چھٹکارا پا چکی ہوں۔"

اجنبی بولا۔ "کیا مطلب؟" نوجوان چونک پڑا۔

حسینہ بولی۔ "اگر مطلب واضح کر دوں تو تم ڈرو گے تو نہیں نفرت تو نہ کرو گے مجھ سے۔"

نوجوان مسکرایا۔ "میں ڈر یا خوف کے لفظ سے نا آشنا ہوں۔ جو کچھ بھی تم ہو۔ میں یہ مہمان نوازی اور حسین چہرہ کبھی نہ بھول سکوں گا۔ آؤ میرے قریب آؤ۔"

حسینہ ایک لمحہ خاموش رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ اس نوجوان کو تکتی رہی پھر آہ بھر کر بولی۔ "افسوس کاش! میں تمہارے قرب کے قابل ہوتی۔ تم جب قلعہ میں داخل ہوئے تھے میں بہت خوش ہوئی تھی اور جب تمہاری نوعمر اٹھان کو دیکھا تو افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتی رہ گئی۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "ایسا کیوں ہوا؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ پیچھے ہٹی اور کہا۔

"میں ایک روح ہوں۔ میں سو برس پہلے ایسی ہی تھی جیسے آج تمہارے روبرو ہوں۔ یہ ہی حسن یہ ہی روپ جوانی کا عالم تھا جب میں بیس برس کے سن کی کنواری کنیا تھی...... ایک ظالم جس کو میں نے چاہا اور اپنا محبوب بنا کر پوجا اس نے محبت کا صلہ یہ دیا کہ یہاں لا کر مجھ کو دولت کی جھلک دکھائی میری عزت لوٹی اور پھر راز کے افشا ہونے کے خوف سے میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ جب سے میری روح انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ میرے کتنے ہی روپ ہیں۔ پہلے میں نے اس ظالم کا خون پیا، اس کے بعد ہر مرد کو جو بھی اس قلعہ کے کھنڈر میں آ گیا کبھی زندہ واپس نہ گیا اور میری روح اب بھی تشنہ ہے۔ میں تمہارا بھی خون پینے والی تھی مگر تمہارا حسن اور نوعمر بھیگی جوانی دیکھ کر ترس آ گیا۔ پھر تم مجھے اچھے لگے اور تم پر پیار آ گیا...... اب میرا اصلی روپ دیکھو......" یہ کہہ کر وہ دھواں بن کر تحلیل ہو گئی اور ایک لمحہ بعد ایک بوڑھی اور خوفناک شکل میں ظاہر ہوگئی۔ اپنے بڑے بڑے دانت نکال کر ہنسی اور قہقہہ لگا کر کہا۔ "ڈر گئے نا......" کیا اس اصلی روپ میں مجھے پسند کرو گے؟"

نوجوان بولا۔ "ہاں تم مجھے ہر روپ میں پسند ہو۔ چاہت دل سے ہوتی ہے ظاہری روپ سے نہیں۔ میرے قریب آؤ، لو میرا خون حاضر ہے تا کہ تمہاری روح تشنہ نہ رہ جائے اور میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ کاش کچھ کر سکتا۔" وہ نوجوان کے اس حوصلے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ حسینہ پلک جھپکتے ہی واپس جوانی کے روپ میں آ گئی۔ اور بولی۔ "کاش اس ظالم کے بدلے تم

میری زندگی میں آ جاتے تو میری دنیا جہنم نہ بنتی اور روح آوارہ نہ ہوتی۔"

نوجوان بولا۔ "میں تمہاری روح کو قید سے آزاد کراؤں گا۔ کاش تم زندہ ہوتیں۔"

حسینہ ایک آہ بھر کے اس کے سینہ سے آ لگی۔ دونوں سب کچھ بھول کر ایک لمحہ پیار کے سراب میں گم ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ علیحدہ ہوئی اور بولی۔ "یہ لمحات بھول جانا اور راز کسی سے نہ کہنا۔ اب تم کہاں جاؤ گے؟"

نوجوان نے کہا۔ "میری کوئی منزل نہیں۔ ہاں اگر وقت نے ساتھ دیا تو ایک بار پھر آؤں گا۔ تمہاری مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے، یہ کھنڈر قلعہ اور اس سے وابستہ یہ لمحات کی یادیں یاد رہیں گی۔"

"شاید میری روح بھی قید سے چھٹکارا پا کر صحیح مقام پر پہنچ جائے۔" حسینہ بولی۔

چند لمحے رکی اور کہنے لگی۔ "اوہ، باتوں میں کتنا دن چڑھ آیا۔ تم جاؤ کوئی دیکھ نہ لے۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "اچھا تمہارا حکم پا کر جا رہا ہوں ویسے دل تو نہیں چاہتا۔"

وہ چہرہ اسی لمحہ غائب ہو گیا اور وہ وہاں سے چل کر زینہ پر چڑھا۔ وہ راستہ خود بخود کھل گیا۔ پھر اس نے رونے کی سسکیوں کی آواز سنی۔ ایک لمحہ قدم رکے پھر باہر آ گیا اور وہ تہہ خانہ بند ہو گیا۔ وہ اسی بارہ دری میں آیا جہاں اس کا گھوڑا آرام سے گھاس چر رہا تھا۔

اس نے گھوڑے کو تھپتھپایا اور زین ڈالی۔ مگر اس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب اس نے زین کے ساتھ ایک تھیلی بندھی ہوئی دیکھی اور ایک طرف پوٹلی رکھی تھی جس میں خشک میوہ جات تھے اور تھیلی میں زر نقد بھری ہوئی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آواز بلند کر کے کہا۔

"میں تمہاری مہربانیاں سدا یاد رکھوں گا۔ میری پیاری محسنہ خدا حافظ۔"

دن کا پہلا پہر تھا ہر سو سناٹا کوئی آدمی نہ آدم زاد دور دور تک وسیع جنگل آبادی کا کوئی نشان نہیں۔ باہر کچھ دیر کھڑا سمت کا تعین کرنے لگا اور جنوب کی سمت ایک پتلی سی پگڈنڈی کو حد نگاہ تک بل کھاتے ہوئے دیکھ کر اس رہ گزر پر اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ وہ انجانی راہ پر سبک روی سے رواں دواں تھا۔ ماضی سے لے کر حال تک کے اوراق پلٹ رہے تھے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ "میری منزل کہاں ہے؟"

دن تین پہر پر ڈھل گیا۔ وفادار گھوڑا سبک خرامی سے پگڈنڈی کے نشیب و فراز طے کر رہا تھا۔ پھر شام کے سائے پھیلنے لگے۔ اس نے گھوڑا روکا ادھر ادھر دیکھا شاید پانی کہیں قریب ہو۔ گھوڑا ہنہنایا اور ایک ڈھلان کی طرف خود ہی چل پڑا۔ اب اس کو کچھ فاصلے پر ایک ندی نظر آئی اور کنارے پر دھواں سا اٹھتا نظر آ گیا۔ وہ مسکرا دیا شاید کوئی قافلہ شب گزاری کے لئے قیام پذیر ہو۔ مگر نہ معلوم کون ہیں کیسا سلوک کریں، وہ اس قافلے سے دور ہٹ کر کنارے پر پہنچا۔ کود کر خود پانی پیا اور اس کا گھوڑا پانی پینے لگا اور وہ دم لینے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے کہ اس نے چھم چھم کی آواز سنی۔ وہ چونکا حیران ہو کر مڑ کر دیکھا ایک سانولی سلونی لڑکی گھاگھرا سمیٹے ہوئے گھڑے میں پانی بھر رہی تھی اس کی سڈول پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں اور پازیب چمک رہی تھی۔ جب وہ گھڑا کر پر رکھ کر کھڑی ہوئی تو اس نے اس خوب صورت نوجوان اور اس کے گھوڑے کو دیکھا۔ وہ حیران ہو کر اس کو گھورتی رہی پھر آگے بڑھی اور اس کے قریب آ کر کولہے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کون ہے تو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بھولا بھٹکا مسافر ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ہاں وہ ہی تو میں کہوں ادھر اور کون آ سکے ہے۔ یہ گھوڑا تیرا ہی ہے نا؟"

"ہاں یہ ہی ایک زندگی کا ساتھی ہے جو میرے

ساتھ بھٹک رہا ہے۔"

"تو شہری بابو جان پڑتا ہے۔ کہاں جائے گا میں راستہ بتا دوں۔"

"میری کوئی منزل نہیں ہے۔ سب راستہ بتانے والے ملتے ہیں کوئی ساتھ دینے والا نہیں ملتا، پر یہ تو بتا تو کون ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

"وہاں ہمارے ڈیرے ہیں یہاں چارہ پانی کا آرام ہے زمین اچھی ہے کھیتی باڑی بھی کر لیتے ہیں۔ ہم بنجارے ہیں ایک برس ہوا جب آئے تھے۔ میرا بابا، ماں اور بھیا ڈیرے میں میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔" لڑکی نے جواب دیا اور جانے کے لئے مڑی۔

پھر کچھ سوچ کر کھڑی ہو گئی اور کہا۔ "تو رات کو یہاں اکیلا کیسے رہے گا۔ جنگلی جانور رات کو گھومتے ہیں اور تو بھوکا بھی ہوگا۔"

"پھر کیا کروں تو بتا؟" نوجوان شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

لڑکی نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ "اچھا ٹھہر۔ میں بھیا کو لے کر آتی ہوں وہ کچھ بتائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چل دی، پازیب کی جھنکار بند ہو گئی۔

وہ سوچنے لگا۔ "واہ میرے داتا۔ جس کو چاہے حسن سے نوازے وہ بلا قلعہ والی سرکر بھی حسین تھی اور یہ جنگلی پھول، بنجارن لڑکی کتنی حسین اور معصوم کلی ہے۔ جو صحراؤں میں پلی پھولی ہے۔"

وہ ٹھنڈی زمین پر لیٹ گیا اور آسمان کی طرف تکنے لگا تارے جھلملانے لگے تھے اسی وقت باتیں کرنے کی آواز سنائی دی وہ لیٹا دیکھتا رہا۔ ایک نوجوان بنجارا اور وہی لڑکی اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

بنجارا بولا۔ "ابھی میری بہن سروپی نے بتایا ہے کہ تم راستہ بھٹک کر آ نکلے ہو۔ اب رات ہو رہی ہے چلو ڈیرے پر چلو۔ رات بسر کر کے صبح چلے جانا۔ کھانا بھی کھانا۔ ہم لوگ غریب بنجارے ہیں پر آخر انسان ہیں۔ یہ جنگل اور تم اکیلے رات کیسے گزار سکو گے؟"

"اچھا بھائی تمہارا احسان ہے چلو۔" نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ ڈیروں کے سامنے آگ کے الاؤ جا بجا لگ رہے تھے۔ اس اجنبی کو دیکھنے کے لئے لڑکیاں عورتیں اور مرد آ گئے۔ وہ حیرت سے اس خوب صورت نو عمر اجنبی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی جس کا نام رامی تھا نوجوان کو ساتھ لانے والی لڑکی سے بولی۔ "اری سروپی اس پھول کو کہاں سے پکڑ لائی۔ بھگوان کی قسم کیسا اچھا روپ ہے جوان اور حسین مسافر کہ دیکھتے ہی رہو۔ ہائے رام مالا دیکھا تو نے۔"

"ہاں، رامی کتنا سندر ہے۔ پر جی للچانے سے کیا ہوتا ہے۔" مالا نے جواب دیا۔

وہ اپنا گھوڑا باندھ کر ڈیرے کے اندر داخل ہو گیا۔

سروپی کی ماں اور اس کا بابا ڈیرے کی مرمت کر رہے تھے۔ دونوں نے اس نوجوان لڑکے کو دیکھا اور بوڑھی عورت نے مسکرا کر کہا۔ "آؤ بیٹا بیٹھو۔ ستالو، میں ابھی کھانا تیار کرتی ہوں۔" پھر اپنے بیٹے سے کہا۔

"جامو۔ تو مہمان کے پاس بیٹھ جا اور اپنے بابا کا حقہ بھر لا۔ سروپی تو آٹا گوندھ لے میں دودھ نکال لاؤں۔" دونوں ماں بیٹی چلی گئیں۔

بوڑھا بنجارا بولا۔ "اچھا ہوا بیٹا سروپی تم کو یہاں بلا لائی۔ مسافر اس زندگی کے سفر میں راستہ بھول ہی جاتے ہیں راستہ دکھانے والے بھی مل جاتے ہیں اور منزل بھی۔ ہم لوگ غریب بنجارے ہیں ہماری بھی کوئی منزل نہیں۔ مگر انسانی ناطے تو ہیں نا اسی ناطے سے تم کو مہمان کیا رات میں جانور تم کو نقصان پہنچاتے اچھا ہوا سروپا نے دیکھ لیا...... جو حاضر ہے کھاؤ پیو اور آرام کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ کھانسنے لگا اور کھانستے ہوئے بے دم ہو گیا۔ نوجوان فوراً اٹھا پانی کا کٹورا بوڑھے کو دیا اور خود اپنا سہارا دے کر اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ اسی وقت سروپا اور اس کی ماں دوڑ کر آ گئیں اور یہ پیار بھرا منظر دیکھ کر قدم جم کر رہ گئے۔ جامو اس کے پیر دبانے لگا۔ بوڑھا

بنجارہ تسکین محسوس کررہا تھا۔ ایک لمحہ بعد بولا۔ ”جا تو فکر نہ کر یہ دو نوجوان موت کو نہ آنے دیں گے۔“ اور مسکرادیا۔ ”جا میں ٹھیک ہوں۔“

کھانے میں مکئی کی روٹی اور بکری کا دودھ تھا۔ اس نے سیر ہو کر کھایا...... پھر باہر نکلا اور گھوڑے کے پاس گیا اور تھپتھپایا اس کے سامنے گھاس کا ڈھیر تھا اور خوب شکم پوری کررہا تھا۔

جامو بھی آ گیا اور بولا۔ ”سروپی نے گھاس ڈالی ہے تم فکر نہ کرو۔“

نوجوان نے کہا۔ ”کتنا سنسان جنگل ہے رات بھی اندھیری ہے بھیانک منظر ہے۔“

جامو بولا۔ ”ارے بھیا ہم لوگ تو جنگلوں کی پیداوار ہیں۔ چلو آرام کرو۔ تم تھکے ہارے ہو۔ رات ہو چکی ہے تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔“

وہ ایک چٹائی پر سو رہا تھا اور قلعہ کے کھنڈرات نور پور کی اسی حسین بلا کو خواب میں دیکھ رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

سروپا جو کہ جاگ رہی تھی اس کے پاس آ گئی...... اور بولی۔ ”کیوں کیا پیاس لگی ہے؟“

”ہاں...... مگر تم کیوں جاگ رہی ہو؟“ نوجوان اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

سروپا شرما گئی...... پانی کا کٹورا لا کر دیا۔ ”لو پی لو۔“

نوجوان نے دو گھونٹ پانی پیا اور باقی پانی سروپا نے پی لیا۔

”میرا جھوٹا پانی تم نے پی لیا۔“ نوجوان حیرت سے بولا۔

”آہستہ بولو، ماں سن لے گی تمہارے جھوٹے پانی سے مجھے سکون مل جائے گا نیند آرہی ہے۔“ سروپا سرگوشی میں بولی۔

دونوں پھر لیٹ گئے۔ رات گزرتی رہی۔

صبح کا سہانا سماں اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب لے کر طلوع ہوا۔ دور تک جنگل سبزہ ہی سبزہ اونچے نیچے ہرے بھرے ٹیلے تھے ڈیروں میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اب اس کو یاد آیا۔ اس حسین بلا نے دو تھیلیاں زین سے باندھ دی تھیں۔ وہ کھول کر دیکھنے لگا ایک میں خشک میوے بھرے تھے۔ دوسری تھیلی میں بادشاہی دور کے سونے کی اشرفیاں اور چاندی کے سکے تھے وہ مسکرادیا...... واہ قلعہ کی رانی خوب نوازا۔ مگر کس کام کی جبکہ میں خود دربدر ہوں۔ اس نے ان کو وہیں زمین میں چھپادیا اور اندر آ گیا۔

بابا، جامو، سروپا اور اس کی ماں بیٹھے ہوئے تھے اور سروپا کہہ رہی تھی۔ ”ماں میں جا کر رامی کے ڈیرے سے چائے کی پتی لے آؤں اس بابو کے لئے۔“

اسی وقت نوجوان اندر آ گیا اور بولا۔ ”نہیں یہ تکلیف نہ کر، میں تو ان چیزوں کو بھول چکا ہوں۔ مانگنا بری بات ہے۔“

”بیٹا ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مانے گا۔“ سروپا کے باپ نے پوچھا۔

”یہ تیری کم سنی اور نئی اٹھتی جوانی میں کیا زخم کھایا کہ دربدر ہو گیا۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے بابا۔ انقلاب حادثات زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ نوجوان بولا۔

بوڑھے نے کہا۔ ”اگر تم کچھ سناؤ تو شاید یہ بوڑھا تم کو کوئی راستہ دکھا سکے۔“

”میری کہانی ایک خاندانی المیہ ہے بابا۔ دنیا میں انصاف کہاں یہ دنیا سوائے دکھوں کے اور کیا دیتی ہے۔ میرا نام اکبر خان ہے۔ رانی پور کا باشندہ ہوں، اچھی خاصی زمین داری اور باغ میرے باپ نے ورثہ میں چھوڑا تھا ماں پہلے ہی مرچکی تھی میں کمسن تھا۔ ایک چچا نے اپنی سرپرستی میں مجھے لے لیا۔ میں تعلیم پاتا رہا اور ان کی ظاہری شفقت اور حریص ذہنیت کو نہ سمجھ سکا۔ میں ناسمجھ تھا اور وہ تمام ملکیت سے خوب دولت سمیٹ رہے تھے۔ جب میں سن بلوغ کو پہنچا تو ان کی لڑکی نے اپنی جھوٹی محبت کے دام میں پھانس لیا۔ یہ چچا چچی کی

سازش تھی کہ اس کے ساتھ مری شادی کر کے ملکیت کے وارث بن جائیں۔ میں انجان تھا اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آ گیا اور شادی کرنے کو رضامند ہو گیا۔

وہاں میرا ایک دوست ہم عمر جماعت جمیل رہتا تھا۔ جب اس نے یہ سنا تو مجھے بلا کر کہا۔ ''اکبر کیا تو اندھا ہے یا احمق ہے کہ انجم کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ آخر تو نے اس میں کیا خوبی دیکھی ہے سوائے اس کے کہ رنگ اچھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تم کو کیا اعتراض ہے۔'' اس نے کہا۔

''ایک دوست کے ناطے سے میں تجھے ڈوبنے سے بچانا چاہتا ہوں۔ انجم آوارہ لڑکی ہے تم شام کو میرے پاس چلے آنا ثابت کروں گا کہ وہ کیا ہے اور اس کی محبت کیا ہے؟ تمہارے چچا تم کو لوٹ رہے ہیں وہ تمہارے باغ بھی فروخت کر چکے ہیں اور تم کو اس طرح شادی کر کے ختم کرا دیں گے خود مالک بن جائیں گے۔ کچھ ہوش میں آ جاؤ برباد ہونے سے پہلے شام کو ضرور آنا میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ثابت کر دکھاؤں گا۔'' میں حیران رہ گیا۔

شام کے وقت میں جمیل کے گھر پہنچا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا ہم دونوں کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انجم وہاں سے اٹھلاتی ہوئی گزری اور تھوڑا آگے بڑھ کر زمیندار کے بیٹے کی بیٹھک میں داخل ہو گئی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد جمیل مجھے ساتھ لے کر باہر نکلا اور بیٹھک کے دروازے پر لے کر پہنچ گیا۔ زمیندار کا بیٹا عالم خان اس سے زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے دروازہ کے سوراخ سے دیکھا اور سننے لگے۔

عالم کہہ رہا تھا۔ ''انجم تو میری محبوبہ ہے میں تجھے پیار کرتا ہوں اور تو بھی پیار کرتی ہے پر تیرا باپ اکبر سے تیری شادی کر رہا ہے۔ میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔''

انجم نے جواب دیا۔ ''تم پاگل ہو۔ پیار ہمارا تمہارا ہے، میں تمہاری ہوں، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے۔ یوں چھپ کر ملنا ایک دن بدنام کر دے گا۔ مگر تم بزدل ہو۔''

عالم بولا۔ ''میرا باپ راضی نہیں ہوتا وہ ضدی ہے صفیہ سے رشتہ طے کر رہا ہے۔''

انجم نے کہا۔ ''پھر میری شادی پر تم کو کیوں اعتراض ہے میں جائیداد کی حق دار بن جاؤں گی۔ وہ احمق سا آدمی ہے ہم دونوں عیش کریں گے۔'' اس کے بعد وہ شرمناک حرکتیں کرنے لگے۔ ہم شرمسار ہو کر نہ دیکھ سکے واپس آ گئے۔ میں یہ دیکھ کر نفرت اور غصہ میں دیوانہ سا ہو گیا۔ جمیل کے پاس سے رخصت ہو کر میں گھر گیا اور چچا کو انجم کے کارنامے سنا کر کہا۔ ''چلو تمہاری لاڈلی کو تم کو دکھاؤں کہ عالم کے ساتھ کیا کھیل رچا رہی ہے......؟''

چچا میرے ساتھ گئے دروازہ کھلوا کر اندر گئے اور عالم کو شراب کے نشہ میں اور اپنی بیٹی کو بے ڈھنگے لباس میں دیکھ کر گردن جھکالی۔ مگر عالم بپھر کر حملہ آور ہوا۔ لڑائی ہوئی میں نے اس کو زمین پر گرا دیا اور گردن دبادی۔ وہ تڑپا اور مر گیا۔

میں بھاگا اپنا گھوڑا لیا اور قانون سے بچنے کے لئے راہ فرار اختیار کی۔

سروپا کے باپ نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جو کچھ ہوا برا ہوا، اب تیرا چچا اور عالم کا باپ دو دشمن ہیں اور پولیس تیری تلاش میں ہو گی۔'' پھر ایک آہ بھر کر بولا۔ ''تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے...... میں سوچوں گا کہ تیرے لئے کون سا راستہ مناسب رہے گا۔''

دوسرے دن اکبر خان ندی کے کنارے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے شام کا سورج ڈھل کر پہاڑیوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا وہ تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ سروپا اس کو تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور بولی۔

''یہاں اکیلے بیٹھے ہو میں تم کو تلاش کر رہی تھی۔ کیا سوچ رہے ہو؟''

اکبر بولا۔ ''سوچنا تو بہت ہے سروپا۔ ایک

فریب نے مجھے در بدر کردیا۔ اب کیا ہوگا۔ انسان کی کوئی منزل کوئی ٹھکانہ تو ہو...... یہ زندگی کیسے کٹے گی؟"

سروپا نے جواب دیا۔ "ہاں یہ تم ٹھیک ہی سوچتے ہو بابو، منزل۔ زندگی کے لئے سہارا۔ مگر یہ سب کچھ تم نے خود ہی ختم کردیا۔ کیونکہ تم بزدل تھے۔ ڈر گئے۔"

"تو بھی مجھے طعنہ دے رہی ہے۔" اکبر جھلا کر بولا۔

سروپا مسکرائی۔ "طعنہ نہیں یہ حقیقت ہے۔ یہ سب اس مکار عورت کا کیا دھرا ہے جو آج بھی عیش کررہی ہوگی۔ اس کے بدمعاش ماں باپ بھی اور تم در بدر ہوگئے۔ تمہارا وہ دوست اس موڑ پر لے جانے کے بعد تم کو بچا بھی سکتا تھا وہ انجم بھی جھک سکتی تھی۔ مگر تم بھاگ نکلے تم نے جرم نہیں کیا تھا حملہ اس نے کیا تھا اور بچاؤ میں مارا گیا۔ ایسا تو ہماری قوم میں آئے دن ہوا کرے ہے۔ میں ایک گنوار بنجارن بھی تو اتنا جانتوں ہوں۔"

اکبر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ "تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"تو بھیا کو اپنی چٹھی دے کر اپنے دوست کے پاس بھیج کر خبر تو منگا کہ وہاں کیا ہورہا ہے۔ بھیا بڑا چالاک ہے بندر کا تماشہ دکھاتا ہوا خبر لے آئے گا۔ پھر آگے سوچیں گے۔ چل ڈیرے پر چل رات ہوجائے گی۔" سروپا نے اسے تسلی دی۔

اکبر کو یہ لڑکی اس وقت عظیم نظر آرہی تھی۔ کتنی دور اندیش اور مدبر ہے یہ بنجارن، وہ اس کے قریب چل رہا تھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑلیا ایک جذبہ کے تحت اس پر گرفت مضبوط ہونے لگی۔

سروپا رک گئی۔ "تو نے میرا ہاتھ پکڑا ہے بابو۔ ہماری قوم میں یہ ہاتھ وہی پکڑتا ہے جو جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا عہد کرلے۔"

اکبر بولا۔ "سروپا تو کتنی اچھی ہے۔ کیا ہم تم جنم جنم کے ساتھی نہیں بن سکتے۔"

"اس بندھن کا باندھنے والا تو کوئی اور ہے بابو...... ویسے کہاں میں ایک بنجارن کہاں تو بابو......"

سروپا نے نظریں جھکالیں۔ پھر نظریں اٹھائیں اور بولی۔ "پر ایک بات ہے جب سے تو ندی پر ملا تھا کچھ ایسا من بھایا کہ پہلی رات ہی میں بے چین سی ہوگئی اور نہ جانے کیا ہے تجھے نہ دیکھوں تو جی بے کل ہوجاتا ہے۔"

"کیا تو میری ساتھی بن سکے گی۔ ایک قاتل مفرور اجنبی کی۔" اکبر نے پوچھا۔

سروپا بولی۔ "تیری باتیں سن کر، دیکھ میرا دل کتنا زور سے دھڑک رہا ہے۔"

وہ آگے آئی...... اکبر نے اس کو سینہ سے لگالیا۔ اب دو دھڑکنیں مل رہی تھیں، جذبات نے ہنگامہ برپا کردیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ "کوئی دیکھ نہ لے چلو۔" دونوں خاموش چلتے رہے، ڈیرے میں آکر وہ مسکرائی اور بھاگ گئی۔

بابا کو سروپا کی تجویز پسند آگئی۔ اکبر نے جمال کو خط لکھا اور جامو کو کچھ خرچ دیا...... جامو اپنے وعدہ کی تکمیل کے لئے صبح ہوتے ہی روانہ ہوگیا اور جلدی لوٹنے کا وعدہ کیا۔

جامو بھی اچھی صحت اور اچھی شکل کا نوجوان تھا رامی اس کو پسند کرتی تھی دونوں اکثر ملتے تھے۔ آج جامو چلا گیا تھا اس لئے رامی اداس تھی۔

آٹھ دن گزر گئے پر جامو نہ آیا۔ بابا اور سروپا کی ماں سروپا اور اکبر کی خاموشی کو دیکھ کر کچھ اور ہی سوچ رہے تھے دونوں ہی جوانی میں بھرپور کہیں بھٹک نہ جائیں اور سروپا کی الہڑ جوانی میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ اکبر مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا اور تعبیر میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔

ادھر جامو کو جمیل کا پتہ مل گیا وہ اس سے ملا اکبر کا خط دیا۔ دونوں ایک تنہا مقام پر تھے۔ جمیل اس کی سلامتی پاکر خوش ہوگیا۔ اور کہا۔ "تم میرا خط لے جانا۔ اب میں اس کی خاطر ایک قربانی دوں گا پھر تم کو خبر دوں

گا اور تمام راستے صاف کر کے اکبر کو بلاؤں گا۔ پھر قانونی طور سے اسے آزاد کرا لوں گا، تم میرے پاس اگلے مہینہ ضرور آنا میں انتظار کروں گا۔''

دوسرے دن جامو یہ خوشی کا پیغام لے کر آ گیا۔ سروپا کی دانائی کا یہ پہلا کامیاب قدم تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اکبر کی بے تابیاں بڑھنے لگیں۔ دوسرا مہینہ آ گیا۔ وہ گرمی کی چلچلاتی دھوپ تھی جامو پھر جمیل کے پاس اس کے گھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ جمیل نے کہا۔ ''میں نے قربانی دے دی ہے۔ اب تھوڑی کمی ہے۔ تم ایک دو دن میرے مہمان رہو۔ کام پورا ہو جائے گا تو واپس چلے جانا۔''

''کیسی قربانی بھیا۔'' جامو نے حیرت سے پوچھا۔

جمیل بولا۔ ''وہی لڑکی انجم بدچلنی سے حاملہ تھی۔ میں نے ان پر احسان کر کے اس کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ اب وہ میری بیوی ہے اور عدالت میں خود گواہی دے گی اس کا باپ بھی مجبور ہے۔ میدان صاف ہے اب تم اکبر کو یہاں بھیج دینا، یہ خط تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ میں اس کی دوستی کا حق آخری سانس تک نبھاؤں گا۔ وہ آزاد ہو گا۔ بس اس کے آنے کی دیر ہے تم جاؤ اللہ مدد کرے گا۔''

جامو کی واپسی پر سروپا اور اکبر اس جمیل کی دوستی اور قربانی کی عظمت پر حیران رہ گئے۔ سروپا نے اکبر سے کہا۔

''دیکھ میں نہ کہتی تھی تیرے دوست نے صرف تیرے بچاؤ کے لئے اس خراب عورت سے نکاح کر کے گواہی محفوظ کر لی خود کو قربان کر دیا۔ اب میری بات مان تو جمیل کے پاس جا جیسا وہ کہے ویسا کر پھر تو آزاد ہو کر اپنی زمینداری سنبھال تیرا حق ہے۔''

''تو اتنی باتیں کیسے جانتی ہے سروپا۔'' اکبر نے حیرت سے پوچھا۔

''عقل پر شہر والوں کا موروثی حق تو نہیں ہے ہم بنجارے بھی عقل کے حق دار ہیں۔ ایسا ہی جھگڑا ہمارے ڈیروں کے ایک نوجوان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ بابا سنایا کرتا ہے اس کی بھی قسمت جیت گئی تھی۔'' سروپا مسکرائی۔

اکبر نے کہا۔ ''تو میں کل چلا جاؤں، میرے لئے دعا کرتی رہنا۔ دن اچھے آ جائیں تو تیرے پاس منہ دکھانے آؤں گا اور تجھ سے کچھ مانگوں گا بھولی پیار کے ورنہ تو صبر کر لینا ایک قاتل مجرم تھا اپنی سزا کو پہنچا۔''

''میں تجھے ہر سانس میں یاد رکھوں گی بابو۔ میں تو اب بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑتی مگر کیا کروں تیری عزت کا خیال ہے دنیا کیا کہے گی کہ ایک گنوار بنجارن کو بھگا لایا...... میں صبر کا دامن آخری سانس تک نہ چھوڑوں گی۔ جامو کو بھیجتی رہوں گی بابو تو جیت جائے گا۔'' سروپا نے اداس لہجہ میں کہا۔ اکبر آگے بڑھا اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولا۔

''اچھا سروپا اب ایک بات راز کی سن لے۔ میرے پاس کچھ پونجی ہے اس کو کہاں لئے پھروں گا نہ معلوم میرا کیا حشر ہو۔ پہلے جیل خانہ پھر مقدمہ۔ اور جو فیصلہ ہوا اچھا یا برا میں قسمت داؤ پر لگا کر تیرے کہنے پر جا رہا ہوں۔ یہ پونجی تو سنبھال کر رکھ لے میں نے چھپا رکھی ہے۔ کچھ ضرورت کے لئے جمیل کو دے دوں گا۔ باقی تو رکھ لے۔''

''میں تو گنتی بھی نہیں جانوں بابو میں کیسے سنبھالوں گی۔'' سروپا بولی۔

''اری پاگل وہ بابا سنبھال لے گا پر تیری امانت میں چھوڑوں گا۔ اب میں تم الگ تو نہیں ہیں۔ پھر کیسی غیریت جو میرا ہے وہ تیرا ہے باؤلی۔'' اکبر نے کہا اور زین میں سے تھیلی نکالی پھر سروپا کو لے کر اور ماں کے پاس آ گیا۔ تھیلی بابا کی گود میں ڈال دی اور سب کچھ کہہ سنایا۔

''یہ دولت سونا چاندی کہاں سے لایا سچ بتاؤ اکبر۔ ہم غریب ضرور ہیں پر محنت کی روزی کھاتے ہیں۔'' بابا نے تشویش بھرے لہجہ میں پوچھا۔ اکبر مسکرایا اور بولا۔

''مجھ پر بھروسہ کرو بابا اکبر چور نہیں ہے یہ کسی کی بخشش اور آخری نشانی ہے مگر کہانی بھی ایسی ہے کہ کوئی یقین نہ کرے گا وہ ایسی ہی ہستی تھی اگر زندگی رہی تو تجھے واپس آ کر وہ کہانی سناؤں گا اور تجھے ملانے کی کوشش کروں گا۔''

''یہ تو بہت بڑی دولت ہے کیسے حفاظت کروں گا'' بابا نے حیرت سے کہا۔

''اکبر نے کہا'' تھوڑی سی مجھے دے دیں بابا۔ میں صبح آزادی کی جدوجہد کے لئے جا رہا ہوں، دعا کرنا کہ عزت رہ جائے یہ سروپا کی امانت میں ہے۔ تمہارا احسان اور تم کو کبھی نہ بھولوں گا۔'' پھر جامو کو گلے لگا کر بولا۔ ''تو میرا بھائی ہے۔ سروپا کا خیال رکھنا اسی نے مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔ یہ سب کچھ اس کا ہے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ماحول اداس ہو گیا تھا۔

دوسری صبح جدائی کی گھڑی آ ہی گئی۔ اکبر گھوڑے پر سوار ہو گیا..... وہ ان روتی ہوئی ہستیوں کے آنسو نہ برداشت کر سکا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر آہیں بھرتا ہوا اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

شام کے سائے تاریک ہونے لگے اکبر کا گھوڑا سبک خرامی سے آبادی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ چراغاں ہونے لگا تھا کہ جمیل کے گھر کے سامنے وہ رک گیا اور گھوڑے پر سے اتر کر مکان کے ایک طرف جا کر گھوڑا باندھا اور آ کر دروازے پر دستک دی۔

جمیل باہر نکلا اور اکبر کو دیکھ کر لپٹ گیا۔ ''آہ، اکبر میں نے تم کو کتنا یاد کیا۔ وہ بنجارا نوجوان کتنا اچھا تھا اس نے تمہاری اطلاع دی تھی اور اسی دن سے میں نے تمہارے لئے راہیں ہموار کرنا شروع کر دیں۔ شکر ہے تم آ گئے۔ چلو اندر چلو۔''

''اور یہ گھوڑا..... اس کا کیا بنے گا؟''

''اس کو رحمت تانگے والے کے اصطبل میں پہنچا دوں گا آرام سے رہے گا۔'' جمیل نے کہا۔

اور دونوں اندر جا کر بیٹھ گئے۔

''تم منہ ہاتھ دھولو، میری قمیض شلوار پہن لو، میں چائے منگاتا ہوں پھر آرام سے باتیں ہوں گی۔'' جمیل بولا۔

''جب اکبر کپڑے بدل کر باہر نکلا تو دیکھا انجم جمیل کے ساتھ بیٹھی ہے وہ ٹھٹکا اور حیرت سے انجم کو دیکھنے لگا۔ جمیل مسکرایا اور بولا۔

''پریشان حیران نہ ہو دوست۔ یہ وہی انجم یعنی انجمن آرا تمہاری چچازاد ہیں جو اب ایک ہفتہ گزرا میری ہمسفر بن چکی ہیں۔ آؤ چائے پیو، اب کوئی تکلف نہ کرو۔ گزرے حادثہ کو بھول جاؤ یہ اب بھی تمہاری ہم نوا ہیں۔''

اکبر کرسی پر بیٹھ گیا۔ انجم نے چائے کی پیالی بنا کر دی۔ پھر شرما کر کہا۔ ''خدا جانتا ہے اکبر کہ مجھے تمہارے در بدر ہو جانے کا کتنا صدمہ ہوا تھا اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ میں گمراہ ہو گئی تھی۔ تم محبت کرتے تھے میرے والدین فریب دے رہے تھے اور میں بھی میرا گناہ قابل معافی نہیں ہے مگر میں نے تلافی کرنے کا عہد کر لیا ہے خدا کی قسم میں تم کو بچاؤں گی، جمیل نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے میں ان کی کنیز ہوں۔ اور تم سے نادم ہوں۔''

اکبر نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔

''بھول جاؤ انجم جو گزر گیا۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے تم سے بھی ہو گئی مگر اب کیا کرنا ہے؟''

''انجم پر اعتبار کرو اکبر تمہارے چچا چچی نادم ہیں اور موافقت میں ہیں۔ تمہارے وکیل سے مل چکا ہوں، جائیداد تمہاری ہے صرف زمیندار اپنے بیٹے کی موت پر دشمن جانی ہے وہ راضی نہ ہوا وہ مقدمہ دائر کر چکا ہے اور تمہارے لئے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ وکیل سے میں نے طے کر لیا ہے اور شہادت چشم دید بھی۔ پریشان نہ ہونا۔ صبح خود کو جا کر حوصلہ کر کے پولیس کے حوالے کر دو..... باقی ہم پر چھوڑ دو۔'' جمیل نے اکبر کو تسلی دی۔

اکبر نے رقم نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقم رکھ لو دوست کام میں لینا میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ خدا

ایسا دوست سب کو دے۔ تم نے بڑی قربانی دی ہے۔"

جمیل نے کہا۔ "انجم بہت اچھی ہے تم کو ہر قربانی دے کر بچائے گی۔"

"رات کو کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

اکبر بنجاروں کا احسان اور اپنی داستان بیان کرتا رہا صرف قلعہ کہانی راز میں رکھی اور سروپا کی محبت کا راز دل میں چھپائے رکھا۔

دوسرے دن پوری بستی میں اکبر خان کی گرفتاری کا شور تھا۔ زمیندار قائم خان بہت خوش تھا کہ اس کے بیٹے کا قاتل پکڑا گیا۔

شہر کوتوال اپنی کارگزاری پر فخر کر رہا تھا۔ مگر اکبر نے جرم سے انکار کر دیا تھا۔ مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اکبر کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

پیشیاں ہونے لگیں۔ گواہ چشم دید زمیندار کے پاس کوئی نہ تھا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے کہ انہوں نے اکبر کو بھاگتا ہوا دیکھا تھا۔

آخری بحث کے بعد اکبر کو قاتل گردانا گیا۔

جمیل کے وکیل نے کہا۔ "مائی لارڈ یہ قتل کا کیس ہے اکبر کے خلاف چشم دید شاہد بھی موجود ہے جو اس قتل کی بنیاد بھی ہے۔ جس کی بنا پر وہ قتل ہوا تھا اس راز کو پولیس بھی نہ جان سکی وہ ہے اکبر خان ملزم کی چچا زاد بہن انجمن آرا اور اس وقت عدالت میں حاضر ہے۔

عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ جیوری حیران تھی۔ جج منہ دیکھ رہا تھا۔ پھر جج کی آواز گونجی۔ "انجمن آرا کو حاضر کیا جائے۔"

انجمن برقعہ پہن کر کٹہرے میں آ کھڑی ہوئی.....اور بیان شروع کیا کہ کس طرح قائم خان کے بیٹے نے زبردستی اس کی آبرو ریزی کی وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ میرے کپڑے پھٹ گئے اور بچاؤ کی جدوجہد کرتی رہی۔ وہ گر پڑا میں نے پیر رکھ کر اس کا گلا دبا دیا۔ اس کشمکش میں اس کا چاقو ہی اس کی پسلیوں میں پیوست ہو گیا۔ یہ اکبر خان مجھے تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ میں خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ مجھے اٹھا کر لے گیا، یہ قاتل نہیں ہے قاتل میں ہوں میں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی میرے والدین نے مجھے بچانے کے لئے اکبر کو پھنسا دیا اور ڈر کر روپوش ہو گیا۔ اگر قاتل مجھے گردانا جاتا ہے تو میں سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ مائی لارڈ مقتول نے میری عصمت لوٹ لی۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

عدالت میں ہنگامہ سا بپا تھا۔ فیصلے بدل رہے تھے جیوری نے رائے بدل دی۔ اکبر اور انجم کو رہا کر دیا گیا۔

اخباروں کی سرخیاں عالم خان مقتول کی برائیوں کا پردہ اٹھا رہی تھیں کہ دولت مند جو چاہے کرے گا گناہ سے پاک رہتا ہے، خدا کے یہاں انصاف ہے۔ انجمن آرا ایک کمزور عورت تھی جو لٹ گئی مگر انتقام لے لیا اور وہ جواں مرگ واصل جہنم ہوا۔ یہ عورت کا صلہ تھا جو قابل تعریف ہے۔

ایک ماہ بعد آج اکبر خان چین کی نیند سویا تھا کہ رات کو خواب میں سروپا اس کی یاد میں روتی نظر آئی وہ بے چین ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی اس نے جمیل سے کہا۔ "بھیا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے کون یاد آ گیا۔ ابھی بہت کام ہیں چچا سے ملنا ہے وکیل سے ملنا ہے جائیداد پر جانا ہے۔" جمیل نے کہا۔

"اب یہ تم اور انجم کر لینا۔ میں نہیں رک سکتا کوئی میرے لئے رو رہا ہوگا۔ میں ڈیروں میں جا رہا ہوں۔ میں نے رات خواب میں اس کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔" اکبر نے جواب دیا۔

جمیل بولا۔ "اچھا چلے جانا اور ان کو لے آنا، کہنا اب ڈیرہ ختم ہوا اور اب حویلی میں رہنا۔ میں لال حویلی کی بات کر رہا ہوں۔ جلد آ جانا۔"

انجم نے کہا۔ "مجھے بہت خوشی ہے بھیا۔ جلد سب کو لے کر آ جاؤ میں خدمت کروں گی۔"

اکبر مسکرایا۔ "ہاں جلد آؤں گا خدا نے اچھے دن

دکھائے ہیں دعا کرنا۔''

اکبر چلا گیا جمیل اور انجم پریشان تھے۔

بنجاروں کے ڈیروں میں رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بابا مرگیا تھا مجمع لگا ہوا تھا اور اس کی آخری رسوم کی تیاری کررہے تھے۔ اکبر نے گھوڑا باندھا جامو آکر لپٹ گیا۔ ''بھیا بابا چلا گیا۔ تجھے یاد کرتا چلا گیا۔''

بابا کو مرے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا وقت تمام غموں کا مداوا ہوتا ہے مگر جامو اور سروپا بابا کی یاد میں گم سم ہوکر رہ گئے تھے اور ان کی ماں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ڈیرے میں اداسیوں کا راج تھا۔ اکبر کو سوچتے سوچتے ایک ہفتہ گزر گیا کہ وہ اب کیا کرے آخر ایک شام جبکہ ماں اور سروپا کھانا پکارہی تھیں اکبر ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور کہا۔

''ماں تم نے مجھ کو بیٹا کہا تھا نا۔''

''ہاں اکبر تو بھی بیٹا ہی ہے کیوں تو نے کیوں پوچھا۔ کیا شبہ ہے۔ اگر بیٹا نہ ہوتا تو کیوں ہماری یاد رکھتا اور مصیبت کے وقت کیوں آتا، پر کیا بتاؤں کہ ہم پر کیا بیت گئی اور تجھ سے کچھ پوچھ نہ سکے، البتہ تیرے آجانے سے کچھ ایسی ہمت سی بڑھ گئی جیسے اندھیرے میں ایک کرن پھوٹی ہو...... تو بھی میرے لئے جامو سے زیادہ ہے۔ مگر اب کیا ہوگا؟'' اس نے ایک آہ بھری۔ ''تو بتا تجھ پر کیا گزری دیکھ سروپا کا کیا حال ہوگیا اسے چپ لگ گئی ہے۔''

اکبر بولا۔ ''ماں جامو کہاں گیا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''وہ مچھلی پکڑنے گیا ہے کچھ پکانے کو نہیں تھا۔ پر میں نے پوچھا تھا کہ تجھ پر کیا گزری اور ہم غریب بنجاروں کے ڈیروں کی کیونکر یاد آگئی۔ سروپا اور تیرے بابا روز تجھے یاد کرتے تھے۔''

اسی وقت جامو بھی ایک بڑی مچھلی لئے ہوئے آگیا اور سن کر بولا۔

''ماں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اکبر میرا بھائی ہے اس کا دل نہ توڑ۔ وہ بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔'' وہ مسکرادی۔ جامو بھی بیٹھ گیا۔

اکبر بولا۔ ''مجھ پر جو گزرنی تھی سب گزر گئی سب ہوگیا۔ قیدی بن گیا جیل خانہ بچا تھا اس کی سیر بھی کرلی۔ مقدمہ چلا مگر دنیا میں ایسی ہستیاں ابھی زندہ ہیں۔ جمیل جیسا دوست جس نے اپنا وقار عزت قربان کرکے میرے بچاؤ کا راستہ ہموار کیا اس بدکار عصمت باختہ انجم کے ساتھ عقد کرکے میرے دشمن چچا کو رسوائی سے بچایا اور انجم کی لاج رکھ لی۔ اور اس انجم کا ضمیر جاگ اٹھا اس نے میرے احسان کے بدلے میں قتل کا جرم عدالت میں اپنے اوپر لے لیا۔ جمیل نے شہادت دی۔ اپنی عصمت کے بچاؤ کی جدوجہد میں وہ کمزور عورت لٹ گئی اور موقعہ پاکر انتقام لے لیا وہ نشہ میں تھا اور اس نے اس کی گردن دبا کر ہلاک کردیا۔ عدالت نے اس کو بھی رہا کردیا اور مجھ کو بھی آزاد کردیا۔ اب میں آزاد ہوں ماں اور فوراً تیرے پاس دوڑ کر آگیا۔ مگر افسوس جب خوشی کے دن آئے تو بابا ساتھ چھوڑ گیا۔''

سروپا پہلی بار مسکرائی اور اکبر کی طرف دیکھا۔ اس کا محبوب اکبر کتنا مخلص تھا۔ اور اکبر نے اس کی مسکراہٹ کو آنکھوں میں سمولیا۔ وہ بنجارن دوشیزہ کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا۔

اکبر پھر بولا۔ ''ماں اب میں تم کو اکیلا نہ چھوڑوں گا۔''

''کیا کہہ رہا ہے اکبر ہم غریب بنجارے تو ایک زمیندار کا بیٹا کتنے فاصلے ہیں، ہماری نسلیں تو ڈیروں میں ہی پرورش پاتی رہی ہیں دنیا کیا کہے گی۔ یہ کیسے ممکن ہے پاگل لڑکے۔'' ماں نے حیرت سے کہا۔

اکبر نے جواب دیا۔ ''اس دنیا نے مجھے کیا دیا ہے۔ اپنوں نے مجھے برباد کردیا۔ میرا کوئی نہیں ہے تو ہے جامو ہے سروپا ہے، یہی میرا کنبہ ہے، جمیل نے مکان خرید لیا ہوگا وہ اور انجم ہمارا انتظار کررہے ہوں گے؟''

ماں نے حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا مطلب۔''

اکبر بولا۔ ''یہ ڈیرہ اور سامان رامی کو دے دو اور

میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاؤ...... اب میں تمہارا سہارا ہوں گا۔ بیٹا ہوں نا...... مجھ پر اعتماد کرو ماں۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ جاموز میںداری میں میرا ہاتھ بٹائے گا اور تم ماں بن کر راج کرنا۔“

”جیسی تیری مرضی بیٹا۔ ہم بے بس ہیں۔“ ماں نے بے بسی سے کہا۔ ”اچھا تو میں صبح نور پور جا رہا ہوں تم تیاری کر لینا واپسی پر اپنے گاؤں چلیں گے۔“ اکبر اٹھ کھڑا ہوا اور جانا چاہتا ہی تھا کہ سروپا جلدی سے آگے بڑھی۔

”میں تمہیں نور پور نہ جانے دوں گی۔ کیوں خطرے میں ٹانگ پھنساتے ہو۔“

اکبر مسکرادیا۔ ”جیسا کہ تم سے لوٹ آنے کا وعدہ کر کے گیا تھا اس طرح کسی اور سے بھی کیا تھا۔ وہ وعدہ پورا کرنا ضروری ہے۔ میں جلد آؤں گا۔“

دوسری صبح اکبر گھوڑے پر سوار ہو کر نور پور کے کھنڈرات کا رخ کر رہا تھا، شام ڈھلے تک وہ اسی راہ سے گزر کر اسی مقام پر جا پہنچا۔ جہاں اس کی ملاقات اس روح سے ہوئی تھی۔ وہی بارہ دری کا شکستہ سائبان تھا۔

رات چاندنی تھی۔ چودھویں کا چاند کھنڈرات کو منور کر رہا تھا۔ تمام رات ستون کا سہارا لئے جاگتا رہا مگر وہ روح جس نے اکبر کو پیار کی نظر سے دیکھا اور نوازا وہ نظر نہ آئی آخر صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ اٹھا اور اسی غار کی طرف گیا جہاں وہ اس کو اندر لے گئی تھی۔ پتھر ہٹا ہوا تھا اور راستہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ہمت کر کے زینہ پر قدم جما کر اندھیری میں اترنے لگا۔ آخر اس کے قدم زمین سے جا لگے۔ وہ اپنی ٹارچ نکال کر دیکھنے لگا۔ غار کے ایک گوشے میں ایک جسم سفید لباس میں پڑا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھا اس بے جان جسم پر روشنی ڈالی اور وہ بھیانک چہرہ دیکھ کر کانپ گیا۔ اس نے اس کا چہرہ ڈھک دیا...... اور کہا۔

”اے پیاری روح میں نے اپنا وعدہ پورا کیا پر تو انتظار نہ کر سکی۔ شاید قدرت نے تجھے سکون بخش دیا ہے اور اب تو سکھ کی نیند سو رہی ہے۔“ وہ کچھ دیر رکا اور سلام کر کے الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ صبح کا اجالا پھوٹنے سے پہلے وہ سوار ہو کر باہر نکلا اور اپنی راہ لی۔ وہ بہت اداس تھا کہ اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ وہی خوشبو محسوس ہوئی وہ رکا جھونکا گزر گیا۔ شاید وہی تھی۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ڈیروں کے قریب تھا۔ ندی کے کنارے سروپا بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی تھی، آنسو بہہ رہے تھے۔ گھوڑے کی چاپ سن کر وہ دوڑی...... ”آ گیا بابو۔“

اکبر مسکرایا۔ ”ہاں آ گیا سروپا۔ تو رو رہی ہے؟“

”یہ خوشی کے آنسو ہیں بابو چل ڈیرے پر ماں فکر کر رہی ہے اور ہاں وہ تجھ کو ملی۔“ سروپا خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں سروپا، وہ ایک روح تھی اپنے مقام پر پہنچ گئی۔ میں نے وعدہ پورا کر دیا مگر وہ نہ مل سکی۔“ اکبر نے جواب دیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا نظروں کا تبادلہ ہوا اور مسکرا پڑے۔

دوسرے دن اپنی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ چلے جا رہے تھے۔ سروپا کے لئے نئی زندگی کا موڑ تھا۔ اس کی ماں اور جاموڈیروں کی زندگی میں صحراؤں میں پروان چڑھے تھے اور اب وہ ڈیرے اور بنجاروں کا قافلہ دور تپتے صحراؤں میں چھوڑ آئے تھے اور ایک اجنبی نوجوان نے زندگی کا رخ موڑ دیا تھا اور وہ اس پر ایک اعتماد کے ساتھ اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے...... اب وہاں رکھا بھی کیا تھا سوائے بابا کی یادوں کے۔

آخر شام بھی ڈھل گئی دور مدھم روشنیاں نظر آنے لگیں...... اکبر نے گھوم کر کہا۔ ”ماں یہ ہمارے سفر کا اختتام ہے۔ یہ روشنی ایک بچھڑے ساتھی کو خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ یہ ہمارا گاؤں ہے ماں کتنی سوندھی خوشبو ہے اس سرزمین کی مٹی کی...... یہ جامو جیسے بہادر کی منتظر ہے جو اس کا سینہ چیر کر سرسوں کے پھول کھلائے گا۔ وہ بستی میں داخل ہو گئے اور راستے ہی میں جمیل اور انجم ان

کو خوش آمدید کہنے کے لئے مل گئے۔ انجم اس بنجارن لڑکی کے معصوم حسن کو دیکھ کر سوچ رہی تھی واہ ری قدرت یہ حسن بھی تیری ہی بخشش ہے خواہ محل ہوں یا جھونپڑے پھر اس نے سروپا کو اس بنجارن کے لباس میں دیکھا۔ ''اوہ! حسن کسی آرائش کا محتاج نہیں۔ وہ بڑھی اور سروپا کے گلے میں ہار ڈال دیا۔'' چل میری بہن بہت انتظار دکھایا تم نے، آؤ ماں جی یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ آپ میری بھی تو ماں جی ہیں۔''

وہ سب ایک صاف ستھرے مکان میں داخل ہوگئے۔ جامو نے سامان اٹھالیا اور ایک گوشہ میں رکھ دیا۔ یہ جمیل کا کمرہ تھا، سب کرسیوں پر بیٹھ گئے اور انجم اپنے کمرے میں سروپا اور ماں جی کے پاس بیٹھ گئی۔ فوراً ہی جمیل آ گیا اور کہا۔ ''انجم پہلے سب کے لئے چائے بنا لاؤ تاکہ تھکان رفع ہو۔ باتیں کرنے کو رات پڑی ہے دیکھو آج ہمارے گھر میں بہار آ گئی ہے۔''

انجم مسکرائی۔ ''چائے تیار ہے میں لے کر آتی ہوں آپ مہمانوں کے پاس جائیں۔ آج میں کتنی خوش ہوں۔'' پھر اس نے دو جوڑے اپنے نکالے اور سروپا اور ماں جی کو دے کر کہا۔ ''آپ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیں ابھی بستی والی عورتیں آئیں گی آپ سے ملنے کے لئے جب تک میں چائے لاتی ہوں۔''

رات ہوگئی سروپا اور ماں جی ضد کر کے انجم کا ہاتھ باورچی خانے میں بٹا رہی تھیں اور جب سب کھانے پر یکجا ہوئے اور دستر خوان پر بیٹھے تو ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جامو شلوار پہنے بیٹھا ہوا تھا اور اپنی ماں اور بہن کو مسکرا کر نئے لباس میں دیکھ رہا تھا۔ کھانا ختم کر کے سب ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ جمیل نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بابا کا غم اب بھول جاؤ۔ اکبر بہت عظیم انسان ہے اور ماں جی نے اس کو بیٹا کہا ہے یہ مقدس رشتہ ہے اس کو اکبر نبھائے گا۔ خدا نے بڑا فضل کیا ورنہ اس نوجوان کی زندگی برباد ہو جاتی۔''

اکبر بولا۔ ''ماضی کو بھول جاؤ جمیل تم نے میرے لئے بہت بڑی قربانی دے دی اور انجم نے جس حوصلے اور خلوص کا ثبوت دیا ہے وہ بہت بڑا احسان ہے کہ آج میں آزاد اور سرخرو بیٹھا ہوں۔''

انجم مسکرائی۔ ''تم نے مجھ سے دل سے محبت کی تھی اکبر۔ کیا بہن اتنا بھی نہ کرتی۔''

بہن کا رشتہ سن کر سروپا کے ذہن کے شکوک رفع ہوگئے اور وہ اس کو ایک فرشتہ نظر آنے لگی۔

اکبر نے سروپا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی اور انجم سے لپٹ گئی۔ ''باجی آپ بہت اچھی ہیں۔''

''میں اچھی نہیں ہوں سروپا جمیل نے اپنی آن قربان کر کے مجھے یہ درجہ دیا اور قربانی کا درس دیا۔'' انجم نے نظریں جھکالیں۔

جمیل نے کہا۔ ''اب سنو تمہارا مکان تیار ہے۔ تمہارے چچا، چچی اپنے مکان میں جا چکے ہیں۔ زمین وہ جائیداد تمہاری ہے وکیل نے ان کو بے دخل کرا دیا ہے۔ البتہ باغ کا افسوس ہے وہ انہوں نے فروخت کر دیا اور اچھی رقم وصول کرلی ہے۔ اپنی زمین سنبھالو اور نئی زندگی کا آغاز کرو۔ قائم خان زمیندار بہت شرمندہ ہے وہ تم سے معافی مانگنے کو تیار ہے۔''

اکبر بولا۔ ''میں تمہارا بہت ممنون ہوں جمیل بھائی۔ کل مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔''

جمیل نے کہا۔ ''انجم اور میں تمہارے دم کے ساتھ ہیں۔''

اکبر نے پوچھا۔ ''وہ باغ کیا واپس مل سکتا ہے۔''

جمیل نے کہا۔ ''کیوں نہیں مگر ملک صاحب کو رقم ادا کردو۔ وہ راضی ہیں وہ جانتے ہیں یہ تمہارا موروثی باغ ہے۔''

رات ملن کی یوں ہی گزر گئی۔ دوسری صبح اکبر معہ ماں جی سروپا اور جامو کے اپنے آبائی مکان میں آ گیا۔ انجم اور جمیل بھی ساتھ آئے تھے۔

انجم کو شک تھا کہ اکبر کے پاس اخراجات کے لئے رقم نہ ہوگی اس خیال سے اس نے پوچھ لیا۔ ''بھیا روپیہ کی فکر نہ کرنا میرے پاس کافی زیور ہے تم اس کو

کر تم لے لو زمینداری کے لئے ضرورت ہوگی۔

اکبر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''خوش رہو انجم اتنی ہی قربانی بہت تھی۔ خدا کا شکر ہے میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ دینے والا اللہ ہے یہ سب اسی کا کرشمہ ہیں۔ اور ہاں چچی نے جو کچھ بھی کیا اللہ ان کو معاف کرے مگر میں ان کو تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ تم ان کو مطمئن کر دینا۔''

ایک ہفتہ بعد اکبر نے گاؤں والوں کی دعوت کی۔ سب کا تعارف ہوا قائم خان زمیندار گلے مل کر گلے شکوے دور کر چکے تھے۔ جامو نے سارا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ وہ صبح سے شام تک زمین اور باغ کو نئی طرز سے سرسبز کرنے کی تدابیر میں خود ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ گاؤں والے اس کا احترام کرتے تھے۔

سروپا کبھی انجم کے پاس چلی جاتی تھی کبھی انجم آ کر رہ جاتی تھی، سروپا کی ماں کے پاس تمام دن گاؤں کی جوان لڑکیاں اور عورتیں اس کو گھیرے رہتی تھیں۔ وقت گزرنے لگا۔ انجم کے ایام زچگی قریب تر ہوتے چلے گئے۔ سروپا اور اس کی ماں اس کے پاس چلے گئے تھے۔

ایک صبح خوشخبری تمام بستی میں پھیل گئی۔ انجم ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی۔ مگر سروپا حیران تھی کہ انجم اور جمیل خوش نظر نہ آتے تھے مگر وہ اس راز کو نہ سمجھ سکی۔ صرف اکبر انجم اور جمیل جانتے تھے کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ مگر یہ راز اب دفن ہو چکا تھا۔

انجم ماں کا فرض پورا کر رہی تھی یہ سوچ کر کہ اس معصوم کی کیا خطا ہے اس کے وجود کو جمیل بھی یہ ہی سوچ کر برداشت کرنے لگا۔ انجم کو جمیل محبوب تھا اور جمیل نے بھی کبھی ماضی کو نہ کریدا۔

جامو کا نام اب جمشید تھا اور جمشید کی جوانی پر حسین خان کی لڑکی زبیدہ اپنا دل دے بیٹھی۔ حسین خان کا باغ اور اکبر خان کا باغ ملا ہوا تھا۔ زبیدہ نے جمشید کو دیکھا تھا اور جمشید نے بھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے مگر دوریاں طے نہ ہو سکیں۔ حسین خان بہت سخت قسم کا زمیندار تھا۔ زبیدہ بھی مایوس تھی کہ یہ ناؤ کس طرح پار لگے گی۔ محبت بڑھتی گئی مگر یہ کیسی محبت کہ دور ہی دور اپنی اپنی آگ میں جلتے رہیں۔

جامو خاموش رہنے لگا وہ اپنے دل کا راز کس کو بتاتا صرف ایک انجم باجی کا سہارا تھا۔ مگر وہ اپنے محسنوں سے کس طرح کہتا وہ اپنی حقیقت کو بھولا نہ تھا۔ وہ ایک بنجارہ تھا کوئی حسب نسب پوچھے گا تو...... کیا جواب دوں گا۔ کہ میں کیا ہوں وہ دل کے پردوں میں اس لگن کو چھپائے ہوئے فاصلے طے کر چکا تھا اور زبیدہ کا بھی یہ ہی حال تھا مگر عورت کس قدر بے بس اور مجبور ہے ماں باپ کو اس کی اٹھتی جوانی کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ ماں سوتیلی تھی اور جوان تھی وہ اپنی تشنگی سے سیراب نہ ہو پاتی تھی۔ اس کا کون خیال کرتا اس کا باپ اس کو بھگا کر لے آیا تھا نہ معلوم کون تھی۔

ایک شام حسین خان اور جامو باغ میں نئی قلمیں لگا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ بارش ہونے لگی۔ حسین خان کا گھر قریب تھا۔

اس نے کہا۔ ''اب بارش میں کہاں جائے گا جمشید۔ چل گھر چل بارش تھم جائے تو چلا جائیو۔ بارش زور کی ہو رہی ہے۔''

وہ اس کے ساتھ تمام تر آرزوؤں کو سمیٹے ہوئے زبیدہ کے دیدار کی خاطر چل پڑا۔

حسین خان کی بیوی شریفاں نے اس اچھوت جوانی کو دیکھا اور اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔ اف کیسا اچھا جوان ہے۔ چوڑا سینہ سڈول جسم اور وہ بے نیاز ہو کر حسین خان کے چھپرے میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حسین خان حقہ لے کر آ گیا۔ دونوں بارش کا نظارہ کر رہے تھے رات ہو گئی مگر بارش اور تیز ہونے لگی۔ زبیدہ کھڑکی میں سے جمشید کو دیکھ رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ یہ بارش نہ تھمے آج موقعہ پا کر وہ اپنے دل کا حال کہہ دے گی۔

دوسری طرف شریفاں بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی اور اپنی چوٹی سنبھال کر آنکھوں میں کاجل ڈال رہی تھی تاکہ اس کو لبھا سکے تاریکی بڑھنے لگی زمین جل تھل ہو گئی

بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے ساتھ دل دہل رہے تھے۔

حسین خان بولا۔ ''چلو جمشید اندر چلیں روٹی کھالو یہ بارش نہ تھمے گی۔''

''بھائی پریشان ہوگا۔'' جمشید نے پریشانی سے کہا۔

حسین خان بولا۔ ''وہ سمجھ جائے گا کہ بارش کی وجہ سے رک گیا ہوگا۔ چلو۔''

وہ اندر آ گیا شریفاں بڑے ناز سے گرم روٹی اور بھجیا ان کو کھلا رہی تھی مگر زبیدہ تڑپ رہی تھی وہ اپنی ماں کی وجہ سے کیسے آتی۔ کھانا کھا کر جامو چھپرے میں آ کر لیٹ گیا، چراغ بھی بجھ گیا اور ہر سو خوفناک اندھیرا تھا۔ وہ لیٹا رہا رات ڈھلنے لگی۔ آدھی رات گزر گئی اس کو نیند نہ آئی۔ پھر قدموں کی چاپ سن کر وہ چوکنا ہو گیا شاید زبیدہ آئی ہو۔ گھر میں اندھیرا پڑا تھا کوئی نظر نہ آیا پھر یکایک کوئی اس کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا گہری سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کہا۔

''زبیدہ تم؟''

''چپ رہو کوئی سن لے گا۔ یہ رات پھر کبھی نہ آئے گی دیکھو ساون بھادوں کیسے گلے مل رہے تھے۔'' اس نے اپنا ہاتھ جمشید کے شانے پر رکھ دیا اور چارپائی پر بیٹھ گئی اور سرک کر اس کے جسم سے لگ گئی۔ جمشید کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ ''ارے چپ کیوں ہو تم۔'' اندھیرے میں کسی نے سرگوشی کی اور جمشید بوکھلا کر بولا۔

''کون ہو تم اور اس وقت یہاں۔''

کسی نے پھر سرگوشی کی۔ ''میں شریفاں ہوں شام کو تم کو دیکھا اور دل ہار بیٹھی۔ اب دیر نہ کر بڑے ارمان لے کر آئی ہوں تیری جوانی کی قسم۔''

جامو کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو چاچی تم میری ماں کے برابر ہو۔''

اسی وقت زبیدہ کی آنکھیں کھلیں ماں کو چارپائی پر نہ دیکھ کر وہ چونکی...... یہ کہاں چلی گئی وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور دروازے سے جھانکنے لگی پھر اس سوتیلی ماں کو جامو کی چارپائی کے پاس کھڑے دیکھا اور چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

حسین خان بھی پانی پینے کے لئے اٹھا مگر بیٹی اور بیوی کو غائب دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور لالٹین لے کر باہر نکلا۔

''ارے تم زبیدہ یہاں کیوں کھڑی ہو۔'' حسین خان زبیدہ سے بولا اور پھر جیسے ہی بیوی پر نظر پڑی چلا اٹھا۔ ''ارے تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟''

شریفاں بڑی چالاک عورت تھی، فوراً جواب دیا۔ یہ جمشید خواب میں چیخ پڑا تھا اس کو دیکھنے آ گئی کہ کیوں ڈر گیا۔''

حسین خان نے کہا۔ ''ہوں چلو اس کو آرام کرنے دو۔ جوانی میں خواب دیکھا ہی کرتے ہیں۔ تم جا کر سو جاؤ۔'' جامو چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور گھبراتے ہوئے بولا۔

''چاچا۔ بارش بند ہو گئی ہے میں جا رہا ہوں۔ وہاں سب فکر کر رہے ہوں گے تمہارا شکریہ چاچا۔''

حسین خان بولا۔ ''پانی بھرا پڑا ہے۔ اندھیرا ہے۔ صبح چلے جانا۔''

جامو نے کہا۔ ''ہاں اندھیرا اور پانی مجھے ڈبونا چاہے تو بھی نہ ڈوبوں گا۔ اور اب تو بارش بند ہو گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سلام کر کے چل دیا۔

شریفاں شوہر کی مداخلت پر غصہ میں جل رہی تھی ارمان تڑپ کر رہ گئے تھے وہ اچھوت جوانی سے سیراب نہ ہو سکی تھی اور موقعہ نکل گیا تھا، زبیدہ نے اپنی ماں کے کرتوت سن لئے تھے اور اس کے جواب کو سن کر اس کے دل میں جامو کی عزت بڑھ گئی تھی اور ماں ڈائن کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا باپ کتنا بھولا تھا کہ اس کی باتوں میں آ گیا تھا۔ وہ جل بھن کر رہ گئی اور اپنے باپ کو کچھ بھی نہ بتا سکی۔

اکبر خان کو اپنی ملکیت سنبھالنے میں تین مہینے لگ گئے وہ بھی جمیل اور جامو کی بھاگ دوڑ سے ورنہ وہ

تنہا کیا کرتا......اب اس کو سکون میسر ہوا تھا۔

سروپا یہ محسوس کررہی تھی کہ انجم اور جمیل کو اس نوزائیدہ معصوم سے قطعی لگاؤ نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے اور وہ بچہ بجائے انجم کے بنجارن سے مانوس ہورہا تھا۔ سروپا کی ماں بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ مگر اکبر خان نے تمام ذمہ داریوں خانہ داری سے لے کر روپیہ پیسہ تک اس کو سونپ دی تھیں۔ ایک ملازمہ ایک نوکر مقرر کر لئے تھے اور وہ اس کا بہت ادب کرتے تھے۔ گاؤں والی عورتیں اس کی عزت کرتی تھیں۔ زمیندار قائم خان سے لے کر غریب کسانوں تک وہ ان کے ہر دکھ درد میں شریک ہوتی ان کی مدد کرتی سب اس کو ماں جی کہتے تھے اور اتنی عزت پا کر وہ زندگی کے اس انقلاب کو دیکھ رہی تھی۔ ایک خانہ بدوش بنجارن سے زمیندارنی ماں بن چکی تھی۔

آج وہ انجم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جمیل بھی گھر پر ہی تھا۔ اور انجم نے اس وقت وہ ہی ذکر چھیڑ دیا جس کو وہ دبائے بیٹھی تھی۔

''اماں جی، ایسی بھی کیا مشغولیت کہ آج اتنے دن بعد آسکی ہو۔''

''کیا بتاؤں بیٹی اکبر نے جنجال میں پھانس دیا ہے۔ بھلا میں حساب کتاب کیا جانوں۔ روپیہ کا آنا جانا میرے ذمہ گھر کا انتظام میرے ذمہ ہے فرصت نہیں ملتی اور سروپا کا وقت تمہارے پاس صرف ہوتا ہے گھر پر کوئی نہیں ہوتا آج اکبر گھر پر تھا تو میں آ گئی۔ سروپا تمہارے بچے کو لئے کھیل رہی ہے۔ اس کا یہی شغل ہے۔''

انجم بولی۔ ''تم نے سروپا کے لئے کچھ سوچا۔ جوان بیٹی کے لئے۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''میں کس منہ سے سوچوں بیٹی کون قبول کرے گا۔ ذات پات خاندان تم کو تو معلوم ہی ہے۔ کون ایسی ماں ہوگی جو نہ سوچے گی۔ مگر ماضی کا سوچ کر آہ بھر کر رہ جاتی ہوں۔ جا مو بھی جوان جودھا ہے پر کیا کروں؟''

جمیل نے کہا۔ ''اگر ہم پر اعتماد کریں تو ہم یہ مشکل آسان کر سکتے ہیں ماں جی یوں چٹکی بجاتے ہوئے ڈھونڈنے والوں کو سب مل جاتا ہے۔''

ماں جی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تم کو اختیار ہے بیٹے اکبر کی بھی تم نے ہی مدد کی تھی۔''

''بس تو ہم پر چھوڑ دیجئے اللہ مالک ہے۔'' انجم نے جواب دیا۔

''اچھا میں چلوں اب۔ اکبر کو شاید ضرورت پڑ جائے۔'' ماں اٹھتے ہوئے بولی۔ لیکن انجم نے روک لیا۔ ''نہیں ماں کھانا تیار ہے کھا کر چلیں گے۔ وہاں سروپا ہے فکر نہ کرو۔''

آج تین ماہ بعد اکبر کو تنہائی کا موقعہ ملا تھا۔ سروپا انجم کے بچے کو سلا کر اکبر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے دونوں مدت کے بعد ملے ہوں۔ دھڑکنیں بڑھ گئیں اور سروپا شرم سے گردن جھکائے اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اکبر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''کتنی بدقسمتی ہے کہ قدرت نے مجھے کہاں سے کہاں لا کر تمہارے پاس پہنچا دیا، منزل دکھادی، پھر انقلاب زندگی ہوا اور اس انقلاب نے زندگی کا رخ موڑ دیا۔ ہم تم یکجا کر دیئے گئے۔ دل ملے مگر وقت نے فاصلے رکھے۔ میں نے تمہارے تصورات میں اتنا وقت گزارا، اب میں برداشت نہیں کرسکتا سروپا کیا تم میری بن سکو گی؟''

سروپا شرما گئی۔ ''میں تو تمہاری ہی ہوں پہلے ہی دن سے تمہاری ہو چکی تھی تم میری زندگی ہو اکبر۔ کیا اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ مجھے منہ سے کہنا پڑا۔ میں تمہاری کنیز ہوں۔'' یہ سن کر اکبر نے اس کو سینے سے لگا لیا۔ ''میں کتنا خوش نصیب ہوں میری رانی مجھے سب کچھ مل گیا ہے اللہ نے خوشیاں لوٹا دی ہیں۔'' چند لمحوں بعد وہ بولا۔

''اب میں انجم سے کہہ کر ماں جی کو پیغام دوں گا اور ہم دونوں پیار کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ اور تم دلہن بنوگی میں گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔''

سروپا شرما کر بھاگنے لگی کہ اکبر نے پکڑ لیا۔ تو سروپا تلملاتے ہوئے بولی۔

''کوئی نوکر دیکھ لے گا ایسی بھی کیا بے شرمی۔''

پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''ہاں ایک بات تو بتاؤ یہ انجم باجی اور جمیل بھائی اس خوب صورت بچے سے دور کیوں بھاگتے ہیں؟''

اکبر نے آہ بھر کر جواب دیا۔ ''یہ ایک دل سوز کہانی ہے عورت کے بہکے ہوئے قدم کی سزا جمیل نے اس کو صرف میرے بچاؤ کی خاطر قبول کر کے قربانی دے دی اور اب نبھا رہا ہے۔ یہ بچہ اس ڈگمگائے قدموں کا ثمر ہے۔ جس کو دیکھ کر ہر لمحہ اس کا ماضی جھنجھوڑتا رہتا ہے۔ دیکھو جمیل کتنا عظیم ہے اب انجم بھی پشیمان ہے اور جمیل سے محبت کرتی ہے وہ ٹھوکر کھا کر سنبھل چکی ہے۔''

سرو پا بولی۔ ''افسوس ہوا، اکبر مگر ایسا کیونکر ہوا۔ ماں باپ نے نہ روکا۔''

اکبر نے جواب دیا۔ ''اس کی ماں سوتیلی ہے باپ عیاش مزاج، اس کو بگاڑ دیا آزادی دے کر اس کی طرف سے لاپروا ہو کر اپنی رنگ رلیوں میں مصروف رہتا۔ نتیجہ یہ ہی ہونا تھا جو ہوا۔ مگر جمیل نے رسوائی سے بچا دیا۔ کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور جامو گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''کیوں پریشان ہو؟'' اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ جامو نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا بتاؤں بھیا تمہارے چچا نے آ کر باغ میں مجھے بڑی گالیاں دیں۔ حسین خان نے سمجھا کر ان کو بمشکل رفع کیا۔ وہ کہتے تھے۔ 'باغ میرا ہے پودا مت لگاؤ۔'

''اچھا ابھی دماغ صحیح نہیں ہوا ہے۔ میں سمجھ لوں گا تم پریشان نہ ہو۔'' اکبر کو غصہ آ گیا۔

''میں صبح قائم خان کو لے کر جاؤں گا سمجھ جائیں تو بہتر ہے ان کو کاغذات دکھا دوں گا ورنہ ان کا علاج کرنا پڑے گا ان کا وظیفہ بند کر دوں گا۔ افسوس کیسے کیسے احسان فراموش اس دنیا میں ہیں۔ تم جاؤ اور آرام کرو اور ہاں ماں جی کو بلا لاؤ صبح سے انجم کے گھر گئی ہیں ان سے کچھ کہنا نہیں ورنہ ان کو دکھ ہو گا۔''

شام کے وقت انجم جمیل بھی ماں جی کے ساتھ آ گئے تھے۔ جمیل نے موقعہ پا کر اکبر سے کہا۔

''سرو پا تم کو پسند ہے اکبر یہ مجھ کو معلوم ہے اور تم دونوں محبت بھی کرتے ہو یہ بھی۔ میں اور انجم چاہتے ہیں کہ تم دونوں کو یہ زنجیریں پہنا دیں۔''

اکبر مسکرایا۔ ''میں تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں جمیل میں تمہارے حکم سے انکار نہیں کر سکتا، ہاں ہم دونوں محبت میں دور نکل چکے ہیں ویسے ماں جی کی رائے ضروری ہے۔''

ماں جی کی فکر نہ کرو یہ مسئلہ حل ہوا سمجھو ایک فکر اور ہے۔ جمیل بولا۔

''وہ کیا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''اپنے جمشید کے لئے حسین خان کی لڑکی زبیدہ کیسی رہے گی۔'' جمیل نے پوچھا۔

''خوب صورت بھی ہے معصوم بھی بہت مناسب جوڑ ہو گا مگر اس کی ماں کیا مان جائے گی۔'' اکبر نے کہا۔

''ارے اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کون انکار کرے گا۔'' جمیل نے جواب دیا۔

''میں کوشش کروں گا۔ جامو جوان ہے حسین ہے اور تمہارا بھائی جو ہوا۔''

انجم بھی آ کر گفتگو میں شریک ہو گئی اور یہ کڑیاں سلجھ گئیں۔ ایک ماہ اور گزر گیا اور اس دوران میں سب کچھ طے پا گیا۔ زمیندار قائم خان نے دل کھول کر حصہ لیا پھر ایک دن شہنائیاں بجیں اور بچھڑے دل مل گئے۔ سرو پا اب زہرہ بیگم بن گئی تھی۔ اکبر اور زہرہ ایک جان دو قالب جمشید اور زبیدہ نے جو چاہا وہ پا لیا۔

اللہ کی نوازشیں ہیں جس کو چاہے نوازے وہ دل کی پکار سنتا ہے۔ اجڑے خاندان آباد ہو گئے۔ اکبر آج بھی اس قلعہ کے کھنڈرات کو اور اس حسین روح کو نہ بھولا تھا جس نے محبت کی راہ دکھائی۔ دولت بھی دی اور ان بنجاروں کے ڈیروں کی راہ بتائی۔



خونخوار

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانک کمرے میں بلا کی آواز گونجی۔ "میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں، میں ہر روز آئوں گی اور تم سے نزدیک تر ہوتی جائوں گی...... پھر ایک رات تم اپنے مکان کے پاس میری غراہٹ سنو گے اور پھر تمہارے چیخنے سے پہلے میں تمہیں دبوچ لوں گی۔

دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتی اور سطر سطر رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، چار سالہ ٹیڈ بستر سے اٹھا اور پیشاب کیلئے باتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آ کر ابھی وہ بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ اسے خوابگاہ میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور یہی وہ وقت تھا۔ جب پہلی بار اس نے خوابگاہ کی الماری میں ایک پراسرار بلا کا چہرہ دیکھا۔ الماری کے پٹ نیم وا تھے۔ ایک نہایت خوفناک شے اس میں سے جھانک رہی تھی۔ اوپر اٹھے ہوئے بڑے بڑے کندھے بڑا سا سر اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ ٹیڈ کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ ساتھ والے کمرے میں محو خواب اس کے ممی ڈیڈی بھاگتے ہوئے پہنچے۔ ننھا ٹیڈ یک ٹک الماری کو گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا۔ ممی نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے چلانے کی وجہ پوچھی۔ ٹیڈ نے انگلی سے الماری کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "وہاں ایک...... بلا ہے۔"

ڈیڈی کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ممی اسے پچکارنے لگیں۔

ڈیڈی نے آگے بڑھ کر روشنی کر دی۔ الماری کے قریب رکھی کرسی پر دو کمبل اونچے نیچے پڑے تھے۔ کمبلوں کے اوپر ایک کھلونا رکھا تھا۔ یہ چمکتی ہوئی آنکھوں والا سیاہ رنگ کا ریچھ تھا۔ اب ٹیڈ کی سمجھ میں آیا کہ جسے وہ "بلا" کے بڑے بڑے کندھے سمجھ رہا تھا وہ کمبلوں کا ڈھیر تھا۔ ٹانگیں درحقیقت کرسی کی ٹانگیں تھیں اور چمکدار آنکھیں کھلونے کی تھیں۔ ڈیڈی نے بھی اسے یہی بات تفصیل سے سمجھائی۔ ممی نے کہا کہ "بھوت اور بلائیں صرف کہانیوں اور کتابوں میں ہوتی ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا...... اس گھر میں ایسی کوئی شے نہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔"

ننھے ٹیڈ کو تسلی دینے کے بعد ممی ڈیڈی واپس اپنی خوابگاہ کی طرف چلے گئے۔ ٹیڈ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائیں لیکن آخر تو انہیں جانا ہی تھا۔ اور ان کے جاتے ہی الماری کا بند دروازہ پھر کھل گیا۔ وہ پراسرار شے دوبارہ کرسی پر نظر آنے لگی۔ ٹیڈ نے آنکھوں کی درز سے دیکھا دو چمکدار خونی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

اس کے گھر سے باہر قصبے کی کسی تاریک گلی میں کوئی بلی کریہہ آواز میں رورہی تھی اور ٹیڈ کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کرسی پر براجمان خوفناک بلا کی آنکھیں اس سے ہمکلام تھیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "ٹیڈ! میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں، میں روز آؤں گی اور ہر دفعہ تمہارے سے



نزدیک تر ہوتی جاؤں گی...... پھر ایک رات جب تم ممی ڈیڈی کو پکارنے کے لئے منہ کھولو گے تو اپنے کان کے بالکل قریب ایک غراہٹ سنو گے۔ ہاں یہ میں ہی ہوں گی۔ تمہارے چیخنے سے پہلے میں تمہیں دبوچ لوں گی...... پھر میں تمہیں کھا جاؤں گی...... اور تم میرے اندر چلے جاؤ گے...... یہ میرا وعدہ ہے۔"

اب پتہ نہیں یہ آواز ٹیڈ کے اپنے سانسوں کی تھی یا اس ہوا کی تھی جو قصبے کے گلی کوچوں کے چکر لگا رہی تھی یا یہ صرف اس کا وہم تھا۔ بہر حال ٹیڈ نے خوابگاہ میں گونجتے ہوئے الفاظ صاف سنے تھے۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور بستر کی چادر کو منہ پر کھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں سفید چمکدار دانتوں والے ایک بدشکل جانور کو دیکھا جو اونچی نیچی گھاٹیوں اور گھنے درختوں میں مسلسل اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

صبح جب ڈونا ٹرینون اور وک ٹرینون اپنے بیٹے کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ الماری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کمبل جو اس کے اندر رکھ دیے گئے تھے پھر کرسی پر پڑے ہیں اور ریچھ کمبلوں کے ڈھیر پر رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ سب کچھ ٹیڈ نے کیا ہوگا لیکن کچھ دیر کے بعد جب وک دفتر چلا گیا اور ڈونا کو ٹیڈ نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے کمبل کرسی پر نہیں رکھے تھے۔ ڈونا نے کہا۔

"عجیب بچے ہو تم۔ اگر کمبل میں نے نہیں رکھے، تمہارے ڈیڈی نے نہیں رکھے اور تم نے نہیں رکھے تو پھر الماری سے کرسی پر کیسے پہنچ گئے؟"

ٹیڈ نے بڑی معصومیت لیکن یقین سے جواب دیا ۔"یہ بلا کا کام ہے۔"

ڈونا چند لمحے بیٹے کو گھورتی رہی پھر اسے سینے سے لگا کر بولی۔ "ٹیڈ! تم سمجھتے کیوں نہیں، تمہاری خواب گاہ میں کوئی بلا وَلا نہیں۔"

سہ پہر کے وقت وک دفتر سے واپس گھر روانہ ہوا۔ مئی کے اوائل ہی میں گرمی اپنا زور دکھانے لگی تھی۔

اس قصبے یعنی، کاسٹل داک، کی سب سے عمر رسیدہ شخصیت چچی ایوی نے پیشن گوئی کی تھی کہ اس دفعہ غیر معمولی گرمی پڑے گی اور قصبے کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ موسم کے بارے میں چچی ایوی کا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا، چچی ایوی نے اس بار پڑنے والی گرمی کو شدید بلکہ خطرناک قرار دیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ "بستی کے کئی عمر رسیدہ افراد ان گرمیوں میں دار فانی سے کوچ کر جائیں گے۔"

سیاہ سیدھی سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے وک کی نگاہ جنوب کی طرف اٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے سال انہی دنوں اس نے ڈونا اور ٹیڈ کے ساتھ ایک لمبی ڈرائیو کی تھی۔ دراصل اس کی کھٹارہ جیگوار کے پچھلے پہیے سے آواز آنے لگی تھی۔ اس نے قصبے کے ایک دو مستریوں کو دکھایا تھا لیکن وہ نقص دور کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر اس کے دوست روجر نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ گاڑی کو جو کیمبر کے گیراج میں لے جائے۔ جو کیمبر کی ورکشاپ قصبے کے مضافات میں واقع تھی اور گردونواح میں اس کی کاریگری کی بڑی شہرت تھی۔ اب کی نسبت پچھلے سال گرمی کافی کم تھی۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں سفر کرتے جو کیمبر کے گیراج میں پہنچے تھے۔ یہ ایک کم آباد اور دور افتادہ مضافاتی علاقہ تھا۔ وہ ورکشاپ کے احاطے میں داخل ہوئے تو ایک سات آٹھ سالہ لڑکا تنہا بیس بال کھیلتا نظر آیا۔ وہ جو کیمبر کا بیٹا تھا۔ وک نے اسے کیمبر کو بلانے کا کہا۔ وہ کیمبر کو بلانے گیا تو ایک جانب سے ایک بہت بڑا کتا نمودار ہوا، وک اور ڈونا کتے کی غیر معمولی جسامت دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ ایک لمحے کیلئے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ کتا ہے۔ ڈونا نے غیر ارادی طور پر ٹیڈ کو ٹانگوں سے لپٹا لیا۔ کتا اپنی طویل دم کو حرکت دیتا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈونا نے خوفزدہ نگاہوں سے وک کی طرف دیکھا۔ اسی وقت کیمبر کا بیٹا ورکشاپ کے دروازے سے نمودار ہوا۔ اس نے کتے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اسے لیتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹیڈ بڑی

کی سے کتے کو دیکھ رہا تھا۔
"ممی! میں ڈوگی سے کھیلوں گا،، میں ڈوگی کو پیار کروں گا۔" وک نے لڑکے سے پوچھا کہ یہ کتا خطرناک تو نہیں۔ لڑکے نے یقین دلایا کہ یہ بڑا بھلا مانس جانور ہے اور خاص طور پر بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ ٹیڈ، ماں سے جدا ہو کر کتے کے قریب پہنچ گیا۔ کتے کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ ہی ننھا منا لگ رہا تھا۔ وک نے سوچا کہ یہ دیو ہیکل کتا ٹیڈ کو ایک نوالے میں ہڑپ کر سکتا ہے۔ لڑکے نے ٹیڈ کو بتایا کہ اس کا نام "کوجو" ہے۔

ٹیڈ نے کوجو کہہ کر پکارا تو کتا آگے بڑھا اور اس کے کندھے سے اپنا منہ رگڑنے لگا۔ ٹیڈ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، وہ بے تکلفی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا، پھر وہ اپنی معصوم خوشی میں ممی کو شریک کرنے کیلئے اس کی طرف بڑھا لیکن اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ کوجو تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے گردن کے قریب سے ٹیڈ کی قمیض منہ میں دبالی۔ ڈونا اور وک کا دل دھک سے رہ گیا۔ وک اضطراری کیفیت میں آگے بڑھا لیکن اس وقت اس نے دیکھا کہ کوجو نے ٹیڈ کو ہوا میں اٹھا لیا ہے، ٹیڈ کی عمر اس وقت تقریباً تین سال تھی۔ اور وہ خاصا ننھا منا تھا۔ کوجو نے اسے اٹھا کر پھر پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ کتے کی اس ادا پر تو ٹیڈ جیسے فدا ہو گیا۔ وہ بے تکلفی سے کوجو کے ساتھ لپٹ گیا اور کھیلنے لگا۔ اس دوران ایک مرتبہ وک کی نظر کوجو کی نظر سے ٹکرائی، نجانے کیوں وک کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا جیسے ..... کتا مسکرا رہا ہے، بلکہ وہ پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ کتا مسکرا رہا ہے۔

ان ہی خیالوں میں گم وک اپنی جیگوار چلاتا ہوا گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گرمی بہت زیادہ تھی وہ جلد از جلد ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں گھسنا چاہتا تھا۔

کوجو ایک خرگوش کا پیچھا کر رہا تھا۔ خرگوش نہایت پھرتیلا اور لمبی گھاس میں بار بار اسے چکمہ دے جاتا تھا لیکن کوجو بھی ایک کائیاں تھا۔ آخر وہ خرگوش کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا پنجہ آزماتا خرگوش اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دراصل ایک گہرے سوراخ میں گر گیا تھا۔ یہ سوراخ بڑے عرصے سے یہاں موجود تھا۔

جو کیمبر کا بیٹا برٹ اکثر جھاڑیوں میں گھومتا رہتا تھا لیکن یہ سوراخ لمبی لمبی گھاس میں چھپا ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں سے بھی اوجھل رہا۔ سوراخ نیچے سے کم وبیش ایک غار کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس میں گر کر کسی جانور کا زندہ باہر نکل آنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس تقریباً ۲۰ فٹ گہرے شگاف کی تہہ میں بہت سے ننھے منھے جانوروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ کیمبر کی پالتو بلی جو دو سال قبل گم ہو گئی تھی اس کا پنجر بھی تہہ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس چوہے کی ہڈیاں بھی تھیں جس کا تعاقب بلی کر رہی تھی اور بھی کئی پنجر یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے، جب جنگلی خرگوش شگاف کے اندر گرا تو کوجو نے بھی بلاتوقف اپنی تھوتھنی اس میں گھسیڑ دی۔ یہ تھوتھنی شگاف کے منہ میں فٹ بیٹھ گئی۔ کوجو زور زور سے بھونک رہا تھا اور اس کی آواز غار کے اندر گونج رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بیسیوں کتے ایک ساتھ بھونک رہے ہیں۔ وہ غار چمگادڑوں کی پناہ گاہ بھی تھا۔ دن کی روشنی میں کچھ چمگادڑیں غار کے اندر پڑی رہتی تھیں۔

کوجو کی زوردار آواز نے چمگادڑوں کو جگا دیا۔ انہوں نے سراسیمگی کے عالم میں غار کا چکر لگایا اور پھر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھیں لیکن راستہ تو کوجو کی تھوتھنی نے بند کر رکھا تھا۔ چمگادڑیں اس کے منہ پر پھڑ پھڑانے لگیں۔ چمگادڑیں باؤلے پن کا شکار تھیں۔

کوجو کو ان بدبودار پرندوں کی مداخلت پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ پھر جونہی ایک چمگادڑ اس کے چہرے سے ٹکرائی اس نے جبڑا کھولا اور چمگادڑ کو پکڑ لیا۔ چمگادڑ کی باریک ہڈیاں اس کے دانتوں تلے کڑ کڑائیں۔ وہ پھڑ پھڑا کر پلٹی اور اس نے کوجو کی حساس تھوتھنی پر کاٹ کھایا۔ کوجو نے زخمی چمگادڑ کو چھوڑ دیا وہ چکر کاٹتی ہوئی غار کی تہہ میں گری اور جان کنی کے عالم میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔

چمگادڑ مرگئی لیکن مرتے مرتے کوجو کو کاری زخم لگا گئی اس کی تھوتھنی پر سوالیہ نشان کی شکل کا ایک گہرا کٹاؤ نظر آرہا تھا۔ کوجو نے خرگوش تک پہنچنے کی کوشش ترک کردی اور زور لگا کر اپنا منہ سوراخ سے نکال لیا۔ راستہ ملتے ہی چمگادڑیں تیزی سے باہر نکلیں اور جون کی تیز دھوپ میں ایک چھوٹا سا چکر لگا کر گھبرائی ہوئی دوبارہ سوراخ میں گھس گئیں۔ کوجو کے زخم سے خون ٹپک رہا تھا۔ منہ میں عجیب سا ذائقہ گھل گیا تھا۔ وہ سست قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہوگیا...... تقریباً دو سو پونڈ وزنی پانچ سالہ کتا کوجو 12 جون 1980ء کی سہ پہر کو باؤلا ہو چکا تھا۔

ٹیڈ کو نرسری میں چھوڑ کر ڈونا نے کچھ خرید و فروخت کی اور گھر لوٹ آئی۔ دروازے کے سامنے اس نے اسٹیو کیمپ کی ویگن کھڑی دیکھی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسٹیو ایک خوش شکل اور تنومند نوجوان تھا۔ ٹینس کھیلتا تھا اور خاصا رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ ڈونا کی غلطی تھی کہ وہ اس سے بے تکلف ہو بیٹھی تھی۔ اب وہ اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکثر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ ان کے تعلقات اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ ڈونا واپسی کا راستہ سوچتے سوچتے تنگ آ گئی تھی۔ وہ سخت غصے کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔ اسٹیو، ٹیڈ کے کمرے میں بے تکلفی سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سامنے بیئر کا گلاس تھا اور ٹی وی پر فلم چل رہی تھی۔ ڈونا نے سامان باورچی خانے میں رکھا اور وہیں سے نہایت خشک لہجے میں بولی۔

''اسٹیو! بہت ہو چکی۔ میں نے تمہیں پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ اب یہاں قدم نہ رکھنا۔ کوئی افسوسناک واقعہ پیش آنے سے پہلے تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

اسٹیو اس کے غصے کو بالکل نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ جھومتا ہوا باورچی خانے میں چلا آیا اور ڈونا کو کندھوں سے تھام لیا۔ ڈونا نے ایک جھٹکے سے اپنے کندھے چھڑائے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں غصے کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ اس شخص کی خاطر وہ اپنے خاوند کو بہت دھوکہ دے چکی تھی لیکن اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مزید اس کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنے گی۔ وہ چلا کر بولی۔

اسٹیو! اپنا یہ منحوس چہرہ لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

اسٹیو ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ''ورنہ کیا کرو گی۔ شیرف کو اپنی کارستانیوں سے آگاہ کرو گی...... نہیں تم یہ نہیں کرسکو گی۔''

''میں سب کچھ کر جاؤں گی ذلیل انسان، دھوکے میں نہ رہنا۔ ضرورت پڑی تو میں تمہاری آنکھیں بھی پھوڑ دوں گی۔'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اسٹیو کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ کچھ دیر اسے خطرناک نظروں سے دیکھتا رہا پھر دھمکی آمیز انداز میں سر ہلاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈونا وہیں باورچی خانے کے فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور سسکنے لگی۔ نجانے وہ کب تک یونہی بیٹھی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا اسٹیو اس کے شوہر کو بھڑکانے کی کوشش کرے گا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ وک کا رویہ کیا ہوگا؟

دوسری طرف اسٹیو کیمپ، ڈونا سے جھگڑ کر واپس اپنی دکان پر پہنچا تو غصے میں بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں بہت کم مواقع ایسے آئے تھے جب کسی لڑکی نے اسے ٹھکرایا ہو۔ وہ خوبصورت اور مضبوط نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں اس کا چہرہ خاصا دلکش دکھائی دیتا تھا۔ ٹینس کھیلنے کے علاوہ اسے لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا۔ اس کی نظمیں اور ڈرامے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے تھے۔ وہ فرنیچر پر رنگ اور پالش وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ دکان سے ملحق اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ جہاں وہ عرصے سے تنہا رہ رہا تھا لیکن اس کی یہ تنہائی بھی رنگینیوں سے عبارت تھی۔ اس وقت اسے ڈونا کی بے رخی پر سخت طیش آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تھوڑی سی کوشش سے وک ٹرنیٹون کا تعارفی کارڈ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ تب اس نے ٹائپ رائٹر کے سامنے کرسی سنبھالی اور ڈونا کے شوہر کو ایک خط لکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک نظر آرہی تھی۔

وہ خط کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ یہ کاغذ کا پرزہ ڈونا اور روک کی ازدواجی زندگی کو تہہ و بالا کرنے کے لئے بہت کافی تھا اس نے ڈونا سے اپنے علقات کا بھانڈا اس طرح پھوڑا تھا کہ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے خط ایک لفافے میں بند کیا اور قریبی لیٹر بکس میں ڈالنے کے لئے چل پڑا۔

چیرئی کیمبر ورکشاپ سے ملحقہ گھر کے ایک کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر اور بیٹا کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے پچھلے دس منٹ سے ہتھوڑے کی ٹن ٹن اس کے کانوں میں گونج رہی تھی لیکن اب وہ ان آوازوں کی عادی ہو چکی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کی عادی ہو چکی تھی۔ کیمبر ایک سخت گیر شرابی تھا لیکن ازدواجی زندگی اور خاص طور پر اپنے بیٹے برٹ کی خاطر چیرئی حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی وہ برٹ کا سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ برٹ باپ سے بہت محبت کرتا تھا لیکن کیمبر کا رویہ بیٹے سے رحمدلانہ نہیں تھا۔ چیرئی سوچتی تھی کیا وہ مستقبل میں باپ کی سخت طبیعت سے مفاہمت کر سکے گا۔ پچھلے کئی روز سے چیرئی اپنی بہن سے ملاقات کا سوچ رہی تھی۔ بہن سے اس کی آخری ملاقات کوئی چھ برس پیشتر ہوئی تھی۔ وہ جو کیمبر سے جانے کی اجازت لینا چاہتی تھی لیکن اسے ڈر لگ رہا تھا۔ آخری بار کوئی پانچ ماہ پہلے اس نے یہ بات چھیڑی تھی۔ جو کیمبر آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا ورکشاپ میں بہت کام ہے وہ برٹ کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چیرئی محسوس کر رہی تھی کہ دن بدن کیمبر کی سخت گیری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ شراب بھی پہلے سے زیادہ پینے لگا تھا۔ نجانے کیوں چیرئی کو احساس ہوتا تھا کہ اس کا بیٹا یہاں محفوظ نہیں کسی دن اسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے باپ اور اس کے دوستوں کے ساتھ شکار پر جائے اور پھر واپس نہ آئے۔ ممکن ہے کیمبر غصے میں اسے اتنی مار مارے کہ اسے جان کے لالے پڑ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی روز ورکشاپ میں شرابی تو سیمہ کا چلایا ہوا ہتھوڑا لوہے پر پڑنے کی بجائے برٹ کے سر پر پڑے درحقیقت وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ایک بار یہاں سے جانے کے بعد واپس نہیں آئے گی۔ اور اس کا بیٹا اپنی علیحدہ زندگی شروع کریں گے۔

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ اس کے ہاتھوں میں لاٹری کا ایک ٹکٹ تھا۔ انگلیاں بے خیالی میں مسلسل اس ٹکٹ کو الٹ پلٹ رہی تھیں۔ اس ٹکٹ پر جو نمبر لکھا تھا وہ لکی نمبر تھا۔

وک گاڑی کا بونٹ اٹھائے انجن پر جھکا ہوا تھا شام ہونے والی تھی۔ قریب ہی ٹیڈ اپنی ڈنگی سے دل بہلانے میں مصروف تھا۔ ڈونا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی سڈول بانہوں کی دلکشی قابل دید تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑے انداز سے کھڑی تھی۔ آج گرمی بہت زیادہ تھی۔ وک کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ یہ اس کی بیوی کی گاڑی تھی ورنہ اتنی گرمی میں کبھی اسے ہاتھ نہ لگاتا۔ بہرحال کافی کوشش کے باوجود وہ گاڑی کا کاربوریٹر ٹھیک کرنے میں ناکام رہا تھا اس نے کاربوریٹر تو کھول لیا تھا لیکن اب اس کے حصے بخرے کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور کاربوریٹر مستری کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ڈونا مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی!" میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اسے مستری کے پاس لے جاؤ۔"

"وک نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔" محترمہ آدھے سے زیادہ کام ہو چکا ہے۔ آپ مجھے طعنے دینے سے گریز کریں۔"

"محترمہ کون ہے؟" ننھے ٹیڈ نے حیرانی سے پوچھا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ کھانے کی میز پر وک نے وہ بات کی جسے کرنے کے لئے وہ پچھلے دو دن سے پر تول رہا تھا۔ دراصل اسے ایک ضروری کاروباری دورے پر جانا تھا۔ کوئی دس روز کا چکر تھا۔ ایک طویل عرصے بعد یہ صورتحال پیش آئی تھی۔ اب وک سوچ رہا تھا ٹیڈ اس کی غیر حاضری کو کس طرح محسوس کرے گا۔ ڈونا کا پریشان

ہونا بھی قدرتی بات تھی اور واقعی جب اسے پتہ چلا کہ وہ دس روز کے لئے قصبے سے باہر جا رہا ہے تو ڈونا کے چہرے پر وہی تاثرات دکھائی دیے جن کی وہ توقع کررہا تھا۔ وہ ایکا ایکی پریشان نظر آنے لگی۔ اتنے بڑے گھر میں تنہا بچے کے ساتھ دس دن گزارنا دشوار امر تھا۔ ٹیڈ کی پریشانی زیادہ نمایاں تھی۔ وہ بیچارہ پچھلے کئی روز سے ڈراؤنے خوابوں کا شکار تھا۔ رات کسی پہر جب وہ چلاتا ہوا اٹھتا تھا تو باپ کی موجودگی اس کی ڈھارس بندھانے میں بڑی معاون ثابت ہوتی تھی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈی آپ نہ جائیں نا۔''

''وک بولا۔'' بیٹے تم سمجھنے کی کوشش کرو، یہ بہت ضروری ہے۔ تم اکیلے تو نہیں۔ تمہاری بہادر ممی تمہارے پاس ہے۔

''لیکن......لیکن''

''ڈیڈی آپ کے جانے کے بعد جب میری الماری میں بلا آئے گی تو اسے کون بھگائے گا۔ بلا کو بھگانے والے الفاظ تو آپ ہی کو آتے ہیں۔'' ٹیڈ کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

وک کو اس کی معصومیت پر بے تحاشا پیار آیا۔ دراصل جب سے ٹیڈ نے کمرے کی الماری سے ڈرنا شروع کیا تھا اس نے بہت سوچ بچار کے بعد چند الفاظ تخلیق کئے تھے۔ رات سونے سے بیشتر وہ بلاناغہ ٹیڈ کے سرہانے بیٹھ کر یہ الفاظ دوہراتا تھا۔ ٹیڈ پر ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ یہ الفاظ اس کیلئے لوری کا کام دینے لگے تھے۔ دونوں میاں بیوی اکثر ٹیڈ خوف کے متعلق تبادلہ خیال کرتے تھے۔ وک کا خیال تھا کہ انہضام کی خرابی کی وجہ سے ہے، ہوسکتا ہے کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو لیکن جلد ہی ٹھیک ہوجائے گا۔ ڈونا بھی اس رائے سے متفق تھی لیکن ایک دفعہ اس نے ہنسی ہنسی میں کہا تھا کہ ٹیڈ کے ساتھ ساتھ اب اسے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جب بھی ٹیڈ رات کو ڈرتا ہے، صبح اس کی الماری میں سے عجیب طرح کی بو آتی ہے۔ جیسے رات بھر وہاں کوئی غلط جانور بیٹھا رہا ہو۔ ڈونا کی اس بات پر وک نے خود الماری میں گھس کر دیکھا تھا۔ یہ ایک کافی بڑی اور کھلی الماری تھی۔ وک کو بھی اندر سے عجیب طرح کی باس آتی تھی لیکن اس نے اس کا سبب یہ ڈھونڈا تھا کہ ممکن ہے ٹیڈ نیند میں چلتا ہوا الماری تک پہنچ جاتا ہو اور جیسا کہ عموماً اس قسم کے مریض کرتے ہیں۔ الماری میں پیشاب کردیتا ہو۔

ٹیڈ مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔ وک نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا اور بولا۔ گھبراؤ مت جوان میں جانے سے پہلے بلا کو بھگانے والے الفاظ ایک کاغذ پر لکھ کر تمہارے پلنگ کے سامنے دیوار پر لٹکا جاؤں گا۔''

''کیا بلا پر اس کا اثر ہوگا؟'' ٹیڈ نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوگا'' وک نے کہا۔

''تو پھر ڈیڈ کہیں بھول نہ جانا۔''

اس رات جب ٹیڈ سو گیا تو وک چپکے سے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا ہوا تھا۔ پش پن کے ساتھ اس نے یہ کاغذ ٹیڈ کی خوابگاہ میں ایسی جگہ لگا دیا جہاں اس کی نظر آسانی پڑسکے۔ کاغذ پر بڑے بڑے اور صاف حروف میں لکھا تھا۔

''بلا! اس کمرے سے دور رہو۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ٹیڈ کے بستر کے نیچے گھسنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ وہ بہت نیچا ہے۔ ٹیڈ کی الماری میں گھسنے کی کوشش بھی فضول ہے کیونکہ وہ بہت تنگ ہے۔ ٹیڈ کی کھڑکی سے باہر کھڑے ہونے کی کوشش میں بھی کچھ حاصل نہیں۔ تم کب تک وہاں کھڑی رہو گی۔ کسی بھوت کسی جانور، کاٹ کھانے والی کسی شے کا یہاں کوئی کام نہیں۔ آج کی تمام رات کوئی چیز ٹیڈ کو چھوئے گی اور نہ کاٹے گی۔''

اس دوران ڈونا بھی ٹیڈ کی خوابگاہ میں چلی آئی تھی۔ وک نے یہ الفاظ اسے بھی دکھائے اور تاکید کی کہ اس کے جانے کے بعد ہر رات ٹیڈ کے سامنے یہ تحریر ضرور پڑھے۔

ٹیڈ کے کمرے سے نکلتے وقت اس نے دیکھا کہ الماری کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اس نے دروازے

کو مضبوطی سے بند کر دیا۔ لیکن رات کسی وقت دروازہ پھر کھل گیا۔ جلتی ہوئی سرخ آنکھیں اس میں سے جھانکنے لگیں اور ایک عجیب سا سایہ متحرک ہو گیا...... ٹیڈ بے خبر سو رہا تھا۔

چیرئی نے برٹ سے پوچھا اگر اس کے ڈیڈی اسے جانے کی اجازت دے دے تو اس کی اپنی مرضی کیا ہوگی۔ برٹ کچھ متذبذب تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ باپ اسے جانے کی اجازت دے دے گا لیکن لمبے سفر کا شوق اس کے دل میں بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ اس کی خالہ کنکٹی کٹ میں رہتی تھی اور یہ جگہ کم از کم ساڑھے تین سو میل کے فاصلے پر تھی۔ بس کا طویل سفر کئے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اگر ڈیڈی اسے جانے کی اجازت دے دیتے تو وہ ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ اس کی ماں چیرئی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر برٹ کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی برٹ! کیوں نہ تمہارے ڈیڈ کو میں کوئی تحفہ دوں۔ اس طرح ہوسکتا ہے اس کا دل پسیج جائے۔ تمہارے خیال میں اسے آج کل کس چیز کی ضرورت ہے۔" برٹ نے ایک دو چیزوں کے نام گنوائے پھر بولا۔

"ممی اس وقت ڈیڈی کی سب سے اہم ضرورت تو چین مشین ہے۔ لیکن وہ تم خرید نہیں سکو گی۔ اس کی قیمت کم از کم......ڈالر ہے" چیرئی بولی۔

"اگر واقعی یہ تمہارے ڈیڈی کی ضرورت ہے تو ہم اسے خرید لیں گے"

"لیکن کیسے ممی؟" برٹ جو گھر کی مالی حالت سے بخوبی آگاہ تھا۔ حیرت سے بولا۔

چیرئی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لاٹری کا ایک ٹکٹ نکال کر برٹ کے سامنے کر دیا۔ ایک عرصے سے وہ ہر ہفتے پچاس سینٹ کا "لاٹری ٹکٹ" خریدا کرتی تھی اور اس ہفتے کا ٹکٹ اس کے لئے پانچ ہزار ڈالر کا انعام لایا تھا۔

گیراج خالی تھا۔ کوجو تاریکی میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ پچھلے چند روز اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ اس کا سارا جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ تھوتھنی کے زخم میں ہونے والی جلن دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ اب تو کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا...... اچانک کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے مالک کی گاڑی کا شور پہچانتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی اور تھا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا گیراج کے دروازے تک آیا۔ باہر بہت تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی اتنا چمکدار دن نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ گیراج کے سامنے ایک ٹرک کھڑا تھا اور اس میں سے دو غیر مانوس چہرے جھانک رہے تھے۔ کوجو دن کی چکاچوند سے گھبرا کر دوبارہ گیراج کی تاریکی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ ٹرک پورٹ لینڈ مشین کمپنی کا تھا۔ ابھی تین گھنٹے پہلے چیرئی اور برٹ اس کمپنی کے مرکزی دفتر واقع روٹ 14 پر گئے تھے اور انہوں نے یہ مشین خرید کر گھر بھجوائی تھی۔ کمپنی کے دونوں ملازموں نے وزنی چین فال مشین ٹرک سے بمشکل اتاری۔ کچھ دیر ٹرک کے سائے میں کھڑے پسینہ پونچھتے رہے پھر مشین اٹھا کر گیراج کی طرف بڑھے۔ گیراج (ورکشاپ) بالکل خالی تھا۔ گھر میں بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چیرئی اور برٹ تو مشین بھجوا کر کچھ خرید و فروخت کے لئے چلے گئے تھے جب کہ کیمبر صبح کا کہیں نکلا ہوا تھا برٹ کا خیال تھا کہ وہ کاسٹ راک، کے کباڑیے کے پاس گیا ہوا ہے۔ دونوں ملازم گیراج میں داخل ہوئے تو چند لمحے تاریکی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک گاڑی کا ہیولا نظر آیا۔ قریب ہی کچھ اوزار بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی وہ ورکشاپ کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ گاڑی کے عقب سے ایک دھیمی غراہٹ بلند ہوئی۔ دونوں آدمی ٹھٹھک کر رک گئے۔ دونوں اچھے خاصے صحتمند نوجوان تھے لیکن غراہٹ میں کوئی ایسی بات تھی کہ ایکا ایکی ان کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ غراہٹ کسی بہت بڑے کتے کے حلق سے برآمد ہوئی ہے...... اور اگر یہ کتا بندھا ہوا نہیں تھا تو وہ سخت خطرے میں تھے۔ جونہی ان کی آنکھیں اندھیرے میں اچھی

طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے سامنے بھیانک شکل کا ایک نہایت جسیم کتا دیکھا۔ وہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تیزی سے دم ہلا رہا تھا۔ اور وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ کتے کے گلے میں زنجیر نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتا دیکھ کر کتا آگے بڑھنے لگا۔ ان کے ہر قدم کے بدلے وہ ایک قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی مسلسل غراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے ان پر چھلانگ لگا سکتا ہے۔ وہ الٹے قدموں چلتے گیراج سے نکلے اور اپنے ٹرک کے پاس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ پھر دونوں اس طرح اندر داخل ہوئے جیسے موت ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد دونوں نے پشیمان نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔ کتا چند گز کے فاصلے پر کھڑا انہیں غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ غراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں تیزی سے واپس جا رہے تھے۔

وہ دونوں جانتے تھے کہ جو کیمبر کا کتا ٹھیک نہیں شاید وہ بیمار ہے یا بیمار ہو رہا ہے۔ ڈرائیور نے سوچا انہیں واپس دکان پر جا کر جو کیمبر کو ٹیلیفون پر اس کے کتے کی حالت سے آگاہ کرنا چاہئے۔ یہ نہ ہو، وہ یا اس کے اہل خانہ میں سے کوئی نقصان اٹھا بیٹھے لیکن دکان پر جا کر وہ سب کچھ بھول گئے۔ کتے کا خیال دوبارہ ان کے ذہن میں اس وقت آیا جب چند دن بعد انہوں نے کتے کے متعلق اخبار میں پڑھا...... لیکن اس وقت ان کے کرنے کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔

☆......☆......☆

ان کے دورے کی تمام تفصیلات طے ہو چکی تھیں۔ وک کے ساتھ اس کا کاروباری شریک اور نہایت عزیز دوست روجر جا رہا تھا۔ پورٹ لینڈ سے بوسٹن جانے کے لئے دونوں کی نشستیں جہاز پر مخصوص ہو چکی تھیں۔ اس شام وک گھر جانے کے لئے دفتر سے جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھنے سے پہلے اس نے لیٹر بکس میں جھانکا ایک لفافہ نظر آیا۔ اوپر موٹے حروف میں ذاتی لکھا تھا۔ نجانے کیوں وک کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے وہیں میز پر بیٹھے بیٹھے لفافہ چاک کیا۔ تحریر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ جوں جوں وہ خط پڑھتا گیا اس کا چہرہ خون سے خالی ہوتا گیا۔ کمرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ...... اس کی بیوی ایسی بھی ہو سکتی ہے لیکن شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لکھنے والے نے ڈونا کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ ذہن لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ بیوی سے جدائی، ٹیڈ کا مستقبل، گھر کی بربادی، اس کی سوچ بہت دور تک پہنچ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی چلی گئیں۔ پھر اس نے سر میز پر ٹکایا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ جب آنسوؤں کا تند ریلا گزر گیا تو دل و دماغ میں دکھ کی جگہ غصے نے لے لی۔ وہ دفتر سے نکلا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ایک پارک میں آ بیٹھا۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا...... وہ اس طوفان کے ساتھ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ حالت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی ڈونا کے لئے، ٹیڈ کے لئے اور اس کے اپنے لئے بھی۔

☆......☆......☆

جو کیمبر نے گیراج کے بیرونی دروازے کے پاس چین فال مشین، پڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ اتنی مہنگی مشین کی ادائیگی کون کرے گا؟ اس نے سوچا اور پیر پٹختا ہوا چیر ئی کے پاس جا پہنچا۔ جب اسے چیر ئی نے بتایا کہ یہ مشین وہ اسے تحفے میں دے رہی ہے تو اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ چیر ئی کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔ بالآخر چیر ئی نے اسے بتایا کہ اس کی لاٹری نکلی ہے اس نے یہ بھی بتایا کہ اپنے اس تحفے کے عوض وہ اس سے کیا رعایت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جب جو کیمبر کو

ا کہ وہ برٹ کو ساتھ لے کر اپنی بہن کے ہاں جانا ی ہے تو اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی اور وہ ایک ہر سخت غصے میں دکھائی دینے لگا۔ اس نے چیرٹی کو نے کے لئے اپنی پتلون کی پیٹی کھولی لیکن چیرٹی ل معمول خوفزدہ ہوئی اور نہ چیخی چلائی۔ وہ آج کوئی انی کمزوری دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ فیصلے کے موڈ تھی۔ اس نے تن کر شوہر سے کہا کہ وہ اسے مار پیٹ تا ہے لیکن اس کا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ وہ برٹ کو ضرور اتھ لے جائے گی۔ اس کے لئے وہ برٹ کے اساتذہ قصبے کے شیرف سے مدد کی درخواست کرے گی۔ ی کا عزم دیکھ کر کیمبر کچھ نرم پڑ گیا۔ کچھ سوچ بچار کے اس نے ماں بیٹے کو اکٹھے جانے کی اجازت دے دی بہت عرصے بعد اس نے بیوی کو رحم کی نظروں سے کھا تھا۔ یہ عجیب نفسیاتی مسئلہ تھا۔ جو کیمبر جانتا تھا اگر ی حسب معمول اس کی مار سے بچنے کے لئے روتی اتی تو وہ اسے بری طرح پیٹ ڈالتا۔

تھوڑی دیر بیوی سے باتیں کرنے کے بعد وہ ر نکل گیا تقریباً ایک فرلانگ دور سڑک کے کنارے یلے کی دوسری جانب گرے کا مکان تھا۔ گرے ایک دیڑ عمر شخص تھا اور تنہا رہتا تھا۔ اس کا سبزیوں کا چھوٹا سا ارم تھا۔ جو اور گرے کئی سالوں سے گہرے دوست تھے اس محفل کے شرکاء عموماً وہ دونوں ہی ہوتے تھے۔ اس روز بھی گرے گھر سے باہر گھاس پر کھڑا جو کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ شام ہوگئی تھی آسمان پر اکادکا تارے چمکنے لگے تھے۔ دونوں دوست کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد تاش کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ کوجو جو اکثر ٹہلتا ہوا اس جانب نکل آتا تھا اس وقت بھی ان کے قریب بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر اگلے پنجوں پر جھکا رکھا تھا۔ دونوں سمجھ رہے تھے کہ وہ سو رہا ہے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی حالت دن بدن بدتر ہوتی جارہی تھی۔ تھوتھنی کی جلن مزید بڑھ گئی تھی۔ آنکھوں میں درد کی مسلسل لہریں اٹھتی رہتی تھیں اور ہڈیوں میں عجیب طرح کی اینٹھن اتر گئی تھی اسے اکثر سخت پیاس لگی رہتی تھی لیکن پانی سے اسے خوف آتا تھا۔ پچھلے دو روز سے تو اس نے اپنے پانی کے برتن کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ جو اور گرے کھیل کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کررہے تھے۔ جو اسے بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی کی لاٹری نکلی ہے اور اب وہ برٹ کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے جارہی ہے اس نے گرے سے کہا کہ بیوی کے جانے کے بعد وہ بھی تفریح کی غرض سے کچھ دن شہر میں گزارنا چاہتا ہے۔ گرے نے کہا اگر ایسا پروگرام ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جائے گا۔

☆......☆......☆

جب وک گھر میں داخل ہوا تو ننھا ٹیڈ دیر ہوئی سوچکا تھا اور ڈونا آرام کرسی پر نیم دراز اس کا انتظار کررہی تھی۔ جب وک باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا۔ اس نے کہا۔ ڈونا میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ فقرہ تین گھنٹے پر مشتمل اس طویل گفتگو کی تمہید ثابت ہوا۔ جو ان کی ازدواجی زندگی کی سب سے نازک گفتگو تھی۔ وک نے اس خط کا تذکرہ کیا جو آج کی ڈاک سے اسے ملا تھا ڈونا نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا۔ اس نے وک کو زاروقطار روتے ہوئے بتایا کہ تنہائی کے احساس نے اسے گناہ کی دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ ٹیڈ کے اسکول اور وک کے دفتر جانے کے بعد وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ جاتی تھی۔ ایسے میں جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اسے ہر آن اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتی، زندگی کتنی یکسانیت اور تیزی سے گزر رہی ہے۔ ایسے میں قصبے کا سیٹو نامی خوبرو نوجوان اس کی زندگی میں آیا، وہ اس سے فلرٹ کرنے لگی۔ اب وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان تھی اور کچھ عرصے سے اس نے سیٹو سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ ڈونا نے بتایا کہ یہی قطع تعلق اس گمنام خط کا سبب بنی ہے۔ وک نے بیوی کی تمام باتیں بڑے تحمل سے سنیں اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا وہ کافی متاثر کن تھا۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور اس غلطی کو آئندہ کبھی نہ دہرانے کا غیر مشروط عہد بھی کیا تھا۔ ڈونا کی صاف سیدھی باتوں نے وک کے طیش میں کسی حد

تک کی کردی تھی۔ لیکن کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

برٹ علی الصبح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ممی ڈیڈی بلائی منزل پر واقع خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گہری دھند پھیلی ہوئی تھی۔ آج برٹ بہت خوش تھا شاید اس وجہ سے صبح زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ آج وہ اپنی ممی کے ساتھ کنگٹی کٹ جا رہا تھا۔ اس نے جوگر پہنے اور دبے قدموں چلتا گھر سے باہر آ گیا۔ بہت عرصے بعد وہ اتنی جلدی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ باہر کا نظارہ واقعی خوبصورت تھا۔ ہر شے، دھند کی سفید چادر میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اچانک ایک غراہٹ سنائی دی۔ وہ سرتا پاؤں لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے دھند میں چند قدموں کے فاصلے پر کوئی بھیڑیا کھڑا ہے۔ پھر اس نے حواس بحال کئے اور مدھم آواز میں پکارا۔ ”کو جو......کوجو...... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ دھند سے باہر آ ؤ“ لیکن غراہٹ بتا رہی تھی کہ کوجو نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ زندگی میں پہلی بار برٹ کو اپنے پالتو کتے کی غراہٹ اجنبی محسوس ہوئی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور پھر اسے کوجو کا ہیولا نظر آیا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ تقریباً 200 پونڈ وزنی کوجو کی بڑی بڑی آنکھوں سے عجیب طرح کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے لگتا تھا کسی جوہڑ کی تہہ میں لوٹنیاں لگاتا رہا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور شکل ایسی ڈراؤنی ہوگئی تھی کہ برٹ لرز کر رہ گیا۔ وہ اپنے چار پیروں پر کھڑا یک ٹک برٹ کو گھور رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک لمحے کے لئے تو برٹ کو محسوس ہوا جیسے وہ اس پر چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پھر اس نے رخ پھیرا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا دھند میں غائب ہوگیا۔ برٹ دیر تک اس جگہ کھڑا رہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا پیارا کوجو ٹھیک نہیں وہ بیمار تھا لیکن اسے ہوا کیا تھا۔ شاید اس نے کسی پرندے کی زہریلی بیٹ کھالی تھی۔ وہ باؤلے پن کے متعلق جانتا تھا اور اس نے کچھ جانوروں پر اس خوفناک بیماری کے اثرات بھی دیکھے تھے لیکن اس وقت اس کے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ کوجو اعصابی نظام کی اس بدنام زمانہ بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ کتے نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے اس نے سوچا اور فوراً ڈیڈی کو آگاہ کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ پہلے بھی کوجو بیمار ہوا تھا تو ڈیڈی اسے قصبے کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ یہ سوچ کر وہ واپس مڑا لیکن پھر ٹھٹھک کر رک گیا...... مگر ان کے پروگرام کا کیا بنے گا؟ وہ جانتا تھا کہ ممی نے بدقت تمام ڈیڈی سے کنگٹی کٹ جانے کی اجازت حاصل کی ہے۔ اب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ واقعی جا پائیں گے۔ درحقیقت بس پر چڑھنے کے بعد ہی ان کا پروگرام ڈیڈی کی دست برد سے محفوظ ہو سکتا تھا۔ اس غیر یقینی حالت میں اگر وہ کوجو کی بیماری کا ذکر کر دیتا تو عین ممکن تھا ڈیڈی انہیں جانے سے روک دیتے...... یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور جھاڑیوں میں کوجو کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں اسے کئی بار پکارا لیکن کوجو باہر نہیں آیا...... اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ کچھ دیر سخت کشش و پنج کے عالم میں کھڑا سوچتا رہا پھر ممی سے مشورہ کرنے گھر کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

وک روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ ٹیڈ بھی بیدار ہو کر ناشتے کی میز پر چلا آیا۔ ڈونا نے پوچھا کہ وہ آج جلدی کیوں بیدار ہوگیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے معلوم تھا۔ ڈیڈی جا رہے ہیں اس لئے انہیں خدا حافظ کہنے چلا آیا۔ وہ وک کی گود میں بیٹھ کر کھلونے کا تقاضہ کرنے لگا۔ وک نے وعدہ کیا کہ واپسی پر وہ اس کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لائے گا۔ ٹیڈ نے کہا۔

ڈیڈ! میں نے کلینڈر پر آپ کی واپسی کی تاریخ پر نشان لگا دیا ہے۔ میں روز آپ کا انتظار کرونگا۔“

”وک نے کہا“ میں ہر دوسرے روز تمہیں ٹیلیفون کال کیا کرونگا اور ممی روز رات کو تمہیں وہ الفاظ سنایا کریں گی جو میں نے بلا کو بھگانے کیلئے تمہارے

ے کی دیوار پر لگا دی ہے، تم کوئی فکر نہ کرنا۔ اس ن وک کو یاد آیا کہ وہ ڈونا کی خراب کار کے بارے ں، جو کیمبر" کی ورکشاپ ٹیلیفون کرنا بھول گیا ہے۔ ں نے بیوی کو ہدایت کی کہ دس گیارہ بجے ٹیلیفون کر کے ے اس بارے میں کہہ دے۔

جس وقت وک گھر سے روانہ ہو رہا تھا، تقریباً اسی ت کاشل راک سے چند میل کے فاصلے پر چیرئی اور ٹ بھی روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ برٹ اندر داخل ا تو اس نے ماں کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا، وہ نے بال سنوار رہی تھی۔ آج وہ کافی نکھری نکھری دکھائی ے رہی تھی۔ اس کا باپ جو کیمبر ساتھ والے کمرے میں تر پر نیم دراز تھا۔

"ممی" برٹ نے آہستہ سے پکارا۔

"چیرئی نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ وہ بری رح چونک گئی تھی۔" کیا بات ہے برٹ، اس نے جھک ر سرگوشی کی۔ اس کے چہرے پر خدشات کے سائے نڈلا رہے تھے۔" کیا تمہارے ڈیڈی نے کچھ کہہ دیا ہے؟" حقیقت یہ تھی کہ پچھلے چوبیس گھنٹے دونوں ماں بیٹے نے سخت اضطراب میں گزارے تھے۔ ہر لمحے یہی دھڑکا ا رہا کہ ابھی ان کا پروگرام درہم برہم ہو جائیگا۔ اب چھلے آدھے گھنٹے سے جو کیمبر ریڈیو سننے میں مصروف تھا اس نے کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی چیرئی کو ڈر لگ رہا ا کہ کہیں اس کی یہ خاموشی کسی اچانک تبدیلی کا باعث نہ ن جائے۔ یہی وجہ تھی جو وہ برٹ کی آواز پر بری طرح نک گئی تھی۔ برٹ نے کہا۔

"نہیں ممی۔ ڈیڈی نے تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھے لگتا ہے...... کو جو ٹھیک نہیں، مجھے ڈیڈی کو اس کے بارے ں بتا دینا چاہئے۔

چیرئی نے ایک لمحہ برٹ کی آنکھوں میں دیکھا ر جھک کر اس کے کندھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس ی گرفت اتنی سخت تھی کہ برٹ حیران رہ گیا۔ وہ تیز سر گوشی میں بولی "برٹ! باپ سے ایک لفظ نہ کہنا ورنہ ہم بھی روانہ نہیں ہو سکیں گے...... سمجھے تم؟" پھر چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد بولی ۔"اب مجھے بتاؤ کہ کو جو کو کیا ہوا ہے۔"

برٹ نے مختصر الفاظ میں اسے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔ ساری بات سن کر چیرئی بولی۔ دیکھو برٹ تم نے جو کچھ بھی دیکھا گہری دھند میں دیکھا۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں کو جو کی خراب حالت کا دھوکا ہوا ہو لیکن اگر ایسا ہے بھی تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ضرور اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔ اب اگر تم اپنے ڈیڈی سے بات کرو گے تو وہ سب سے پہلے بات یہی کہے گا کہ کتا تمہارا ہے میرا نہیں، مجھے ورکشاپ میں بہت کام ہے۔ اپنے کتے کا دھیان رکھنے کیلئے تم یہیں رہو لیکن اگر ہم چلے جائیں اور بعد میں تمہارے ڈیڈی کو کتے کی بیماری کا پتہ چلے تو وہ خود ہی اس کا علاج کریگا۔ اگر کوئی تشویشناک بات ہوئی جیسا کہ مجھے امید ہے نہیں ہوگی تو وہ اسے قصبے کے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جا سکتا ہے۔ آج شام تم ٹیلیفون کر کے اپنے ڈیڈی سے پوچھ سکتے ہو۔ کہ کو جو کو کھانا وغیرہ دیا ہے یا نہیں اس سے تمہیں کو جو کی حالت کا صحیح علم ہو جائیگا۔"

ماں کی باتوں سے برٹ کی تشویش آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ اسے اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ وہ اپنے ڈیڈی کو کچھ نہیں بتائے۔

صبح دس بجے کے قریب جو کیمبر نے بیوی اور بچے کا سامان کار میں رکھا اور انہیں لے کر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ آخری وقت تک چیرئی اور برٹ کو دھڑکا لگا رہا کہ کہیں کو جو گھومتا ہوا اس کی طرف نہ آنکلے لیکن خیریت گزری۔ کار انہیں لے کر روانہ ہوگئی۔ پانچ منٹ بعد وہ بڑی سڑک کے کنارے اتر رہے تھے۔ بس آنے میں ابھی کچھ دیر تھی جو کیمبر، برٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جانب لے گیا۔ دونوں باپ بیٹا سڑک کے کنارے ٹہلنے لگے۔ جو کی سخت گیری آج قدرے ماند دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بنچ پر بیٹھی چیرئی کو دیکھا پھر برٹ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ آخر میں اس نے ہدایت کی کہ وہ اپنی ماں کا

خیال رکھے پھر اس نے بیئر کی ملی جلی بو برٹ کے نتھنوں سے ٹکرائی......اور اس لمحے برٹ کو احساس ہوا کہ اپنے باپ کی تمام تر سخت گیری کے باوجود اس سے محبت کرتا ہے۔ ''بس سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ جو اور برٹ نے اپنا سامان بس پر رکھا۔ چیری نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ برٹ نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ڈیڈی نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ پھر بس کا دروازہ بند ہو گیا......اس کے بعد برٹ نے اپنے باپ کو کبھی زندہ نہیں دیکھا۔

گرے اپنے گھر سے باہر بیٹھا تھا۔ حسب معمول میز پر تاش کے پتے دھرے تھے۔ وہ ووڈ کا پینے کا ساتھ ساتھ اکیلا ہی تاش سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے جو کیمبر کو اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ بڑی سڑک کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جو انہیں بس پر بٹھانے جا رہا ہے۔ آج نجانے کیوں اس کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا ووڈ کا سے کام نہیں چلے گا اسے اسپرین کی ایک دو گولیاں لے لینی چاہئیں۔ یہی سوچ کر وہ اندر جانے کے لئے اٹھا تھا، جب اسے کوجو کی غراہٹ سنائی دی۔ غراہٹ میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ ذرا دیر بعد سامنے جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور کوجو کا سراپا دکھائی دیا۔ گرے نے کوجو کی صرف ایک جھلک دیکھی اور وہ سمجھ گیا کہ کتا پاگل ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب چند سال پہلے اس نے بستی کے دوسرے مکینوں کے ساتھ مل کر ایک پاگل کتے کو ہلاک کیا تھا۔ اس کتے کی شکل اب گرے کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ کتا نسبتاً چھوٹا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھی کوجو ہی کی طرف سرخ نظر آ رہی تھیں۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور تھوتھنی عجیب انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ کوجو کو دیکھ کر گرے کا دھیان سب سے پہلے اپنی بندوق کی طرف گیا۔ وہ آہستہ آہستہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کوجو کو پچکارتا بھی جا رہا تھا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ کوجو اس پر چھلانگ لگانے والا ہے وہ مڑا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ اس کا رخ پورچ کی طرف تھا۔ اس نے سوچا اگر کسی طرح وہ گھر کے اندر پہنچ جائے اور بندوق حاصل کر لے تو اس خونی جانور سے بچ سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کتا باؤلا ہے اور اس کے لگائے ہوئے ایک چھوٹے سے زخم کا مطلب ہے درد ناک موت۔ وہ ٹانگوں کی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اور عقب میں کوجو کے بھاگنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہو رہا تھا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب اسے عقب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی وہ جان گیا کہ کوجو نے اس پر چھلانگ لگا دی ہے......تب 200 پونڈ وزنی کوجو کا جسم اس سے ٹکرایا اور گرے اوندھے منہ فرش پر گرا۔ پھر وہ تیزی سے سیدھا ہوا کتا اس کے اوپر تھا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا پیٹ اس کے منہ پر دھرا تھا۔ گرے کو محسوس ہوا جیسے اس بدبودار بوجھ کے نیچے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کتے کو پیچھے ہٹانا چاہا اور اس وقت کتے نے اس کے کندھے پر کاٹا۔ ایک زوردار جھٹکے سے کندھے کی کھال ادھڑتی چلی گئی۔ گرے کو زبردست جلن کا احساس ہوا۔ گرم گرم خون اس کی کہنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کتے کو ٹانگوں کی پوری قوت سے دھکیلا اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ گرے اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کندھے پر جیسے انگارے رکھے ہوئے تھے۔ دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ حتی المقدور تیزی سے اندر گھس گیا۔ اس کی رائفل دیوار پر لٹک رہی تھی۔ اس نے رائفل اتاری اور انتہائی طیش اور خوف کے عالم میں شیشے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کوجو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے شاٹ گن کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا اور محتاط نگاہوں سے باہر جھانکنے لگا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے حواس بتدریج معطل ہو رہے ہیں۔ وہ بے ہوش ہو رہا تھا ''نہیں......یہ وقت بے ہوش ہونے کا نہیں اس نے خوف سے کہا۔ مجھے اس پاگل کتے کو مارنے تک ہوش میں رہنا چاہئے۔'' اس نے زبان کو دانتوں سے کاٹ کر خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی۔ کندھے کا زخم بری طرح جل رہا تھا۔ کیا اس پر بھی پاگل پن کا اثر ہو جائے گا۔ اس نے نہایت

تشویش کے عالم میں سوچا۔ پھر اس کی گرفت بندوق پر اور مضبوط ہوگئی۔ مجھے اس وقت صرف اس کتے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ......اور اس وقت ایک زور دار چھنا کا ہوا۔ گرے نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کو جو بغلی دروازے کا شیشہ چکنا چور کرتا ہوا اندر گھس آیا تھا۔ اس کے دانت مڑی ہوئی تھوتنی کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ آنکھیں مزید سرخ ہوگئی تھیں۔ پھر وہ گرے پر جھپٹا۔ چند لمحے کے لئے دونوں زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر گرے جو کتے سے تقریباً 50 پونڈ کم وزن رکھتا تھا لڑکھڑا کر گرا۔ کتا ایک خوفناک غراہٹ سے اس پر سوار ہوگیا۔ گرتے ہوئے گرے کا سر پرشور آواز سے ایک الماری سے ٹکرایا تھا لیکن اسے کسی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ہی لمس محسوس کررہا تھا اور وہ لمس تھا کتے کا۔ اس بدبودار کھال کا اسکے منہ سے بہتی ہوئی جھاگ کا اور اس کی گرم گرم تھوتنی کا کتے کی تھوتنی بار بار اس کی ٹھوڑی کے نیچے ٹکرارہی تھی گرے نے سوچا اسے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھے استعمال کرکے کتے کی آنکھیں پھوڑ دینی چاہئیں لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنے ہاتھوں کو استعمال کرتا۔ کتے کے نوکیلے دانت اس کے حلق میں پیوست ہوگئے اور اس کا نرخرہ ادھڑتا چلا گیا۔ اس کی زخمی گردن سے خون کا فوارہ ابلا اور اس کے سینے پر پھیل گیا۔ سانس اکھڑ گئی متحرک ہاتھوں کی مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ گرے سمجھ گیا کہ وہ مر رہا ہے۔ جو کیمبر گھر میں داخل ہوا۔ کوجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ عموماً گھر کے پچھلے صحن میں بیٹھا رہتا تھا اور اس وقت آتا جب اسے بلایا جاتا تھا۔ دراصل گھر کے سامنے والے صحن میں درختوں کے درمیان گلہریوں کی بہتات تھی۔ یہاں پہنچتے ہی کوجو کی حس شامہ اسے بھاگ دوڑ پر مجبور کردیتی تھی۔ جو نے برآمدے میں کھڑے ہوکر کوجو کو کئی آوازیں دیں لیکن وہ نہیں آیا۔ ''جو'' حیران ہورہا تھا کہ اتنی گرمی میں کتا کہاں چلا گیا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا وہ یہی سوچتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک صوفے کا کشن ادھڑا پڑا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا یہ کوجو کا کام ہے کوجو کے معمولات پچھلے چند روز سے بدلے بدلے تھے اور ''جو'' نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ دو تین دن سے اس نے کوجو کو بالکل نہیں دیکھا۔ اس وقت بھی شاید وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ وہیں کمرے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اس کے دماغ میں آیا کہ وہ تو گرے کے ساتھ بوسٹن جارہا ہے اس کے بعد کتے کو خوراک کون دے گا۔ ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ خوراک کی ٹرے بھر کر اس کے پاس چھوڑ جائے لیکن کوجو کی بسیار خوری کے سامنے یہ خوراک زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ دو دن میں اسے ختم کردے گا اس کا مطلب ہے اسے کم از کم دو روز بھوکا رہنا پڑے گا۔ وہ اس مسئلے پر سوچتا ہوا ٹیلیفون کے قریب چلا آیا۔ نوٹ بک میں اس کے بہت سے مستقل گاہکوں کے نام درج تھے وہ باری باری انہیں فون کرکے بتانے لگا کہ وہ کہیں جارہا ہے اور چار پانچ روز تک واپسی ہوگی۔ اگر کسی کو زیادہ ضرورت ہے تو وہ آج شام تک اسے گاڑی دکھا سکتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ورکشاپ میں چلا آیا۔ برٹ، چیرٹی اور کوجو کی غیر موجودگی میں ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خود کو معروف رکھنے کے لئے وہ ایک گاڑی کا رنگ پسٹن بدلنے لگا۔ گھر میں کوئی تیرہ چودہ دفعہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی لیکن ''جو'' تک آواز نہیں پہنچی۔

''جو'' نے آخری گاڑی سہ پہر کوئی پانچ بجے ٹھیک کی اور پھر ورکشاپ بند کرکے بڑے خوشگوار موڈ میں گرے کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کوجو کی خوراک کا مسئلہ ابھی تک حل طلب تھا۔ اس نے سوچا اس سلسلے میں گرے سے مشورہ لے گا۔ گراؤنڈ سے ہوتا ہوا وہ پورچ میں پہنچا اور وہاں شیشے کے دروازے کے پاس اس نے زمین پر خون کا دھبہ دیکھا جو جھک کر غور کرنے لگا یہ خون ہی تھا۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ گرے نشے کی حالت میں گر گیا ہوگا ہوسکتا ہے ہاتھ میں پکڑے گلاس نے اس کی ہتھیلی زخمی کردی ہو۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ تب اس کی

نگاہ بغلی دروازے پر پڑی۔ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ”جو“ کو کسی خطرے کا احساس ہوا اور اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے جھک کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور اس کے عقب میں ...... ہاں عقب میں اس کے عزیز ترین دوست گرے کی لاش پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ گرے چت لیٹا ہوا تھا اس کا نرخرہ بے رحمی سے ادھیڑ دیا گیا تھا۔ فرش پر خون کا ایک تالاب دکھائی دے رہا تھا۔ گرے کی شارٹ گن قریب ہی پڑی تھی۔ لیکن بدحواسی میں ”جو“ کو دکھائی نہیں دی۔ وہ گرے کی گن لینے کے لئے تیزی سے اس کی خوابگاہ کی طرف گیا لیکن گن وہاں دکھائی نہیں دی۔ جب وہ خوابگاہ سے باہر نکل رہا تھا اس کی نگاہ برآمدے کے گرد آلود فرش پر پڑی۔ وہ کسی کتے کے پنجے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحے میں وہ نہ صرف سمجھ گیا کہ یہ کوجو کے پنجے ہیں بلکہ یہ بھی جان گیا کہ ان کا دیوہیکل کتا پاگل ہو چکا ہے۔ گرے کا قاتل کوجو تھا۔ وہی کوجو جو سارا دن ورکشاپ میں بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی باتیں سنتا تھا۔ اس کی ٹانگوں سے اپنی تھوتھنی رگڑتا تھا ...... پھر ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ یہ سوچ کر لرز اٹھا کیا پاگل کوجو اس کے اردگرد کہیں موجود ہے، وہ جلدی سے اٹھا اور احتیاط سے ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ پھر اس نے مکان کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کردیئے۔ پولیس کو ٹیلیفون کرنے وہ باورچی خانے کی طرف لپکا۔ یہیں ایک دیوار پر ٹیلیفون نصب تھا۔ قریب ہی ڈائریکٹری پڑی تھی۔ اس نے ڈائریکٹرا اٹھائی اور کانپتے ہاتھوں سے ہنگامی کال کا نمبر ڈھونڈنے لگا۔ دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ عقب میں دروازہ چرچرانے کی مدھم سی آواز نہ سن سکا...... کوجو اندر داخل ہورہا تھا گرے کو مارنے کے بعد وہ گھر کے ٹھنڈے تہہ خانے میں چلا گیا تھا۔ نمبر ڈھونڈنے کے بعد جونہی ”جو“ کی انگلی ڈائل گھمانے کے لئے سیدھی ہوئی اسے اپنے پیچھے خوفناک غراہٹ سنائی دی، خون جیسے رگوں میں جم گیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا۔ کوجو چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تیزی سے دم ہلا رہا تھا۔ ریسیور ”جو“ کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا، پھر وہ ایک میکانکی عمل کے تحت کھڑا ہوگیا۔ کوجو...... ایزی کوجو“ وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس وقت کوجو نے وحشیانہ انداز میں اس پر چھلانگ لگائی۔ ”جو“ نے ایک چیخ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی۔ کوجو کا بھاری بھرکم جسم دھپ کی زبردست آواز سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ پلستر اکھڑ گیا اور نیچے کی اینٹیں دکھائی دینے لگیں۔ کوجو کے بھونکنے کی آواز پورے مکان میں گونج رہی تھی۔ جو کیمبر ٹانگوں کی پوری قوت سے باہر بھاگا لیکن ابھی بمشکل اس نے دروازہ ہی پار کیا تھا کہ کوجو نے اسے آلیا۔ دونوں اوپر نیچے گرے۔ ”جو“ کی نگاہوں میں گرے کی ادھڑی ہوئی گردن گھوم گئی۔ یا خدا رحم کر زندگی میں پہلی بار اس کے ہونٹوں سے دعائیہ کلمات نکلے اس نے اپنی گردن دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لی۔ کوجو پیچھے ہٹا پھر غراتا ہوا اس کی ناف پر حملہ آور ہوا۔ اگلے ہی لمحے جو کیمبر کی آنتیں کوجو کے جبڑے میں لٹک رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ڈونا شاپنگ کے لئے نکلی تو اس نے ٹیڈ کو بھی ساتھ لے لیا اور ظاہر ہے وہ گھر میں اکیلا تو رہ نہیں سکتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گیراج میں آئے اور اس وقت ننھا ٹیڈ ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے اپنی ماں کی غیر حاضر دماغی پر حیرت ہورہی تھی۔ اس نے کہا۔

”ممی آپ بھول گئیں ہماری گاڑی تو خراب ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ ڈونا کے منہ سے نکلا۔ وہ گاڑی کی خرابی بالکل فراموش کرچکی تھی۔ کل رات پھر وک کی ہدایت کے مطابق اس نے جو کیمبر کی ورکشاپ ٹیلیفون کیا تھا۔ دوسری طرف تادیر گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے بعد دوسرے کاموں میں الجھ کر وہ گاڑی کو بالکل فراموش کرچکی تھی۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ اب شاپنگ کو تو جانا ہی تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہورہی تھیں۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ

کی تو وہ ہوگئی۔ وہ اسے آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی قصبے کے بازار کی طرف روانہ ہوگئی۔ غیر متوقع طور پر گاڑی نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ ڈونا نے سوچا ہوسکتا ہے نقص ٹھیک ہوگیا ہو یہ بھی ممکن تھا کہ وک ہی کو دھوکا ہوا ہو۔ بہر حال وہ بخیر وخوبی شاپنگ کرکے گھر واپس آگئی۔ واپسی پر راستے میں صرف ایک دفعہ انجن سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی لیکن جلد ہی دور ہوگئی۔ ڈونا شش وپنج میں مبتلا تھی کہ گاڑی مکینک کو دکھائے یا نہیں۔ جو کیمبر کی ورکشاپ کافی دور تھی اور قرب وجوار میں کوئی اور اچھا مکینک تھا نہیں۔

جونہی دونوں ماں بیٹا شاپنگ کا سامان اٹھائے گھر میں داخل ہوئے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ ٹیڈ اپنے ہاتھ کے لفافے صوفے پر پھینکتا ہوا ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ڈونا امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''ممی...... ڈیڈی۔''

ڈونا کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کے خوبصورت رخساروں سے سرخی جھلکنے لگی تھی۔ رخصت کے وقت ''وک'' کا انداز خاصا بجھا بجھا تھا۔ وہ ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ''وک'' نے اسے معاف کیا ہے یا نہیں۔ مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں ابھی اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیور پکڑا۔ حسب توقع وک کا لہجہ محتاط تھا۔ اس نے اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے بعد گھر کا حال احوال پوچھا۔ ڈونا نے بتایا کہ کل رات وہ جو کیمبر کو ٹیلیفون کرتی رہی لیکن رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ خود گاڑی لے کر ''جو'' کی ورکشاپ چلی جائے۔ وک کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے کہا کہ راستہ بہت سنسان ہے۔ اگر کہیں راستے میں گاڑی خراب ہوگئی تو مصیبت پڑجائے گی۔ اس نے مشورہ دیا کہ قصبے کے کار ڈیلر سے کرائے پر گاڑی حاصل کرلو۔ ڈونا نے بھی اس بارے میں سوچا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کرائے کی گاڑی مہنگی پڑے گی اور وہ وک کی جیب پر خواہ مخواہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح کام چلائے گی۔ وک نے ٹیڈ کے بارے میں پوچھا۔ ڈونا نے بتایا کہ وہ اسے بہت یاد کرتا ہے۔ اس نے بلا کو بھگانے والی تحریر دیوار سے اتار لی ہے اور ہر وقت اسے جیب میں رکھتا ہے۔ ٹیڈ قریب ہی بیشمار رنگین تصویروں والا رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے بارے میں بات ہورہی ہے تو وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وک نے کہا کہ ذرا دیر کے لئے ٹیڈ کو ٹیلیفون پر بلاؤ۔ ڈونا جانتی تھی کہ اب وہ ٹیڈ کو خدا حافظ کہہ کر ٹیلیفون بند کردے گا۔ وہ ابھی اس سے اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ نجانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''وک ...... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' اور جلدی سے ریسیور ٹیڈ کو تھما دیا۔

ٹیڈ باپ سے باتیں کرنے لگا۔ ڈونا آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ وک نے مجھے کار کرائے پر لینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے ذہن میں ہے کہ میں کار ٹھیک کرانے ورکشاپ نہیں جاسکتی اس لئے وہ اضافی رقم خرچ کرنے پر تیار ہے لیکن میں اس پر یہ اضافی بوجھ نہیں ڈالوں گی۔ میں کار کرایہ پر نہیں لوں گی۔

اگلے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے ڈونا کار لے کر ورکشاپ جانے کی تیاری کررہی تھی۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے اس نے ایک بار پھر ''جو کیمبر'' کو فون کیا تھا لیکن جواب ندارد۔ اس نے ورکشاپ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ٹیڈ کو وہ اتنی گرمی میں ساتھ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہوجائے اور اسے لفٹ لینی پڑے۔ ایسے میں ٹیڈ سخت پریشان ہوگا۔ ایک دو گھنٹے کی تو بات تھی۔ اس نے ٹیڈ کو گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈھیر سارے کھلونے اس کے کمرے میں رکھ دیئے۔ اس نے بچوں کے فلاحی ادارے میں ٹیلیفون کرکے ایک دو گھنٹے کے لئے ایک آیا بھی منگوالی تھی۔ لیکن جب وہ پورچ کا رخ کررہی تھی اس نے ٹیڈ کی ہچکیاں سنیں۔ وہ جلدی سے مڑی۔ ٹیڈ رو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر آیا اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

’’ممی‘‘ میں یہاں اکیلا نہیں رہوں گا۔
پچھلے ایک گھنٹے میں وہ کئی بار یہ فقرہ ادا کر چکا تھا ۔ڈونا نے اسے روتے دیکھا تو تڑپ گئی۔ واقعی وہ غلطی کر رہی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی وجہ سے اسے دیر ہو جاتی۔ اندھیرے میں ٹیڈ یقیناً ڈر جاتا۔ پہلے ہی اسے اپنی خوابگاہ سے خوف آتا تھا۔ اس نے اسے ساتھ ہی لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بولی۔
’’دیکھو ٹیڈ! میں تمہیں پہلے بتا دوں اگر راستے میں گاڑی خراب ہوگئی اور ہمیں پیدل چلنا پڑا تو تم مجھے تنگ نہیں کرو گے۔‘‘
ٹیڈ جو تنہا گھر میں رہنے سے سخت خوف زدہ تھا۔ آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ’’ممی میں وعدہ کرتا ہوں کہ جہاں تک کہو گی تمہارے ساتھ پیدل چلوں گا۔‘‘
ڈونا نے آیا کو رخصت کیا۔ جلدی جلدی کھانے کا کچھ سامان ساتھ لے لیا۔ ٹیڈ کی تھرماس دودھ سے بھر لی کچھ سلائس اور بسکٹ لنچ بکس میں رکھ لئے اور جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں آیا کہ ایک بار اور جو کیمبر کو ٹیلیفون کرے لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ ایک لاحاصل کوشش تھی وک نے بتایا تھا کہ ’’جو‘‘ کی ورکشاپ میں ٹیلیفون نہیں ہے۔ اس کی بیوی یا بچہ اسے ورکشاپ میں پیغام پہنچاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں کہیں گئے ہوئے ہیں اور جو ورکشاپ میں مصروف ہے باہر نکلنے سے پہلے ڈونا نے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ نجانے کیوں وہ ایکا ایکی اداس ہوگئی تھی پھر اس کی نگاہ فریج کے قریب گھر کے نوٹس بورڈ پر پڑی۔ اس نے نوٹس بورڈ پر لکھ دیا۔
’’ٹیڈ اور میں گاڑی ٹھیک کرانے جو کیمبر کی ورکشاپ جا رہے ہیں جلد واپسی ہوگی‘‘
تب ڈونا نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے بالوں میں برش کیا اور ٹیڈ کا بازو تھام کر باہر نکل آئی پچھلے پہر کی تیز دھوپ نے ان کا استقبال کیا۔ دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے گاڑی میں آبیٹھے۔ ڈونا کو خدشہ تھا لیکن گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ اس وقت تین بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔
تقریباً دس منٹ بعد وہ بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ سیاحوں اور چھٹیاں گزارنے والے مقامی باشندوں کی اکا دکا گاڑیاں جنوبی سمت میں جا رہی تھیں۔ گرمی کافی زیادہ تھی اور ان کی کار میں ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھا ۔لہٰذا انہوں نے دونوں اگلی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ ٹیڈ اپنی بچوں والی نشست پر بیٹھا بڑی محویت سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا بڑی سڑک پر کوئی دس کلومیٹر چلنے کے بعد وہ ایک بغلی سڑک پر مڑ گئے۔ یہ ایک ویران سڑک تھی ۔اطراف میں اونچی نیچی گھاٹیاں تھیں۔ جو چند ایک مکانات نظر آئے وہ کافی دور دور تھے۔ اس سڑک پر نظر آنے والی واحد گاڑی ایک چھوٹا سا ٹریکٹر تھا جسے ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان چلا رہا تھا۔ اس وقت وہ جو کیمبر کی ورکشاپ کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ جب اچانک انجن کا مرض عود کر آیا۔ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آئی اور گاڑی کو دھچکے لگنے لگے۔ ڈونا بار بار ایکسلیٹر دبا رہی تھی دھچکوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ٹیڈ پریشانی کے عالم میں ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ننھے سے لنچ بکس پر اس کے ہاتھوں کے گرفت لاشعوری طور پر سخت ہوگئی تھی۔ بالآخر انجن ایک بار پھر رواں ہوگیا۔ گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑی اور کوئی چالیس کلومیٹر کی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ کوئی ڈیڑھ کلومیٹر آگے انہیں ٹاؤن روڈ نمبر 3 کا بورڈ نظر آیا۔ ڈونا نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ سامنے تھوڑی سی چڑھائی دکھائی دے رہی تھی ۔گاڑی چڑھائی چڑھنے لگی۔ انجن کا زور لگا تو وہ پھر مسنگ کرنے لگا۔ لیکن جیسے تیسے چڑھائی ختم ہوگئی۔ تھوڑی سی ہموار سڑک طے کرنے کے بعد گاڑی ڈھلوان پر اترنے لگی لیکن انجن کی آواز بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ڈیش بورڈ پر سرخ بتی دکھائی دینے لگی اور ڈونا سمجھ گئی کہ انجن بند ہونے والا ہے لیکن اب اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر جو کیمبر کے گیراج اور گھر کی سرخ چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ گاڑی وہاں تک پہنچ جائیگی۔

جس وقت دھیمی رفتار سے رینگتی ہوئی گاڑی جو کیبر کی ورکشاپ کے سامنے رکی اس کا انجن خاموش ہو چکا تھا۔ ڈونا نے کھڑکی میں سے ورکشاپ کا جائزہ لیا۔ اور کھلے دروازے میں سے ایک نیلی ویگن کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈونا کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ ویگن کی موجودگی کا مطلب تھا۔ جو کیبر گھر ہی میں ہے۔ پھر اس کی نگاہ لیٹر بکس پر پڑی۔ لیٹر بکس کے اوپر ایک پارسل لٹک رہا تھا۔ شاید اس میں جو کیبر نے کسی گاڑی کا کوئی پرزہ منگوایا تھا لیکن اگر جو کیبر گھر ہی میں تھا تو اس پارسل کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ ڈاکیہ یہ پارسل خود بھی "جو" کو دے سکتا تھا تو کیا جو یہاں نہیں ہے۔ پھر ڈونا نے دیکھا کہ ورکشاپ اور گھر میں کہیں کوئی لائٹ وغیرہ بھی نہیں جل رہی۔ اسے ایک دم وک پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ گاڑی ٹھیک کروا جاتا تو اسے یہ مصیبت تو نہ اٹھانا پڑتی۔ اس نے گاڑی سے باہر آ کر چند لمحوں کے لئے سن گن لینے کی کوشش کی۔ دور کھیتوں میں کہیں کوئی کوا چلا رہا تھا۔ کسی کار ٹریکٹر یا مشین کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ ڈونا ورکشاپ کی طرف بڑھی تو ٹیڈ بھی باہر نکلنے کے لئے اپنی "سیٹ بیلٹ" کھولنے لگا۔ ڈونا نے اسے روک دیا۔

وہ بولی۔ "تم اندر ہی رہو۔ میں دیکھ لوں کوئی یہاں ہے بھی یا نہیں۔"

وہ چند قدم ورکشاپ کے دروازے کی طرف گئی اور پھر اس نے ایک عجیب سی غراہٹ سنی۔ زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ پوری توجہ سے یہ آواز سننے لگی۔ خوف کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا آواز کدھر سے آ رہی ہے۔ اس نے چاروں طرف گردن گھمائی اور پھر یک ٹک ورکشاپ کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازے کے اندر تاریکی میں کچھ حرکت ہوئی اور دفعتاً کوجو اس کے سامنے آ گیا......اس نے دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ کوجو ہی تھا، لیکن عجب ہیبت کذائی میں آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ منہ سے جھاگ اور رخساروں سے رال بہہ رہی تھی۔ اس کی کھال کیچڑ اور خون...... میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سب سے بھیانک چیز اس کی غراہٹ تھی۔ وہ مسلسل غرا رہا تھا۔ یہ منظر اتنا دہشتناک تھا کہ ڈونا سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ اس نے پڑھا اور سنا تھا کہ انسان بہت زیادہ خوف کے وقت مفلوج ہو جاتا ہے لیکن آج وہ خود اس کیفیت سے دوچار تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اسے لگا کہ دماغ اور ٹانگوں کے درمیان رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔

پھر اسے ٹیڈ کی دلخراش چیخ سنائی دی اور وہ ہوش میں آ گئی۔ تیزی سے پلٹ کر وہ کار کی طرف لپکی۔ اس نے اپنے عقب میں کتے کی بدلی ہوئی غراہٹ سنی اور سمجھ گئی کہ وہ اس کے پیچھے لپک رہا ہے۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف پہنچی۔ کار کا دروازہ اس کے سامنے تھا لیکن اسے اپنے ہاتھ اور دروازے کے ہینڈل کے درمیان برسوں کا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ کبھی دروازہ نہ کھول سکے۔ پھر اسے عقب سے ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اڑتی ہوئی کار کے پچھلے دروازے سے جا ٹکرائی۔ 200 پونڈ وزنی کوجو بھاگتا ہوا اس سے ٹکرایا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش نے ڈونا کے ہاتھوں میں جیسے بجلی بھر دی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ اپنا جسم اندر گرایا، ٹانگیں سکیڑیں اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ شاید سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق پڑا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی پاگل کتا ایک خوفناک آواز سے دروازے کے ساتھ ٹکرایا۔ کار کو زبردست جھٹکا لگا۔ ڈونا اور ٹیڈ کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر ڈونا نے کار کی بند کھڑکی میں کوجو کا چہرہ دیکھا۔ خدا کی پناہ اپنی آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر وہ ایک عفریت کو دیکھ رہی تھیں کوجو کی خون رنگ آنکھیں براہ راست ڈونا کی آنکھوں میں تھیں اور ایک لمحے کے لئے ڈونا کو محسوس ہوا جیسے یہ کتا اسے پہچانتا ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ باہر نکلتے وقت حسب عادت کھڑکی بند نہ کر دیتی تو اب تک اس کے خون سے گاڑی کی نشستیں رنگین ہو چکی ہوتیں۔ پھر ڈونا کو ٹیڈ کا خیال آیا۔

اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، ٹیڈ نیم بے ہوشی

کے عالم میں نشست پر پڑا ہے۔ وہ جھک کر اس کے گلا تھپکنے لگی۔ ٹیڈ...... ٹیڈ...... ہوش کرو۔ ٹیڈ نے اپنی خوابیدہ آنکھیں کھولیں اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ممی، یہ بلا میری الماری سے نکل کر یہاں کیسے پہنچ گئی...... کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں کیا میں اپنے بستر پر ہوں؟

ہوش کرو ٹیڈ...... ہوش کرو۔'' ڈونا چلائی۔ اور پھر اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ پاگل کتا گاڑی کے سامنے سے ہوتا ہوا ٹیڈ والی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تا اور ڈونا نے دیکھا...... یہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ایک تیز میکانکی عمل کے تحت وہ کھڑکی کے ہینڈل پر جھپٹی اور بازو کی پوری قوت سے شیشہ چڑھانے لگی۔ وہ جانتی تھی چار سالہ ٹیڈ کا جسم اس کے نیچے پس رہا ہے۔ وہ اس کی گھٹی ہوئی چیخیں سن رہی تھی لیکن اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی...... بند کھڑکی۔ ابھی تین چوتھائی کھڑکی بند ہوئی تھی کہ کتا ایک بار پھر پر ہول آواز سے آ ٹکرایا۔ اس کی تھوتھنی اندر گھس آئی۔ گرم گرم جھاگ اور خون کے قطرے ڈونا کے ہاتھ پر گرے۔ وہ وحشیانہ انداز میں بھونک رہا تھا۔ ڈونا نے پورا زور لگایا اور کھڑکی بند کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

کتا پیچھے ہٹ کر چاروں پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ ڈونا ٹیڈ کے اوپر سے اٹھی وہ اب رو رو کر کہہ رہا تھا۔

''ممی...... گھر چلو...... مجھے یہاں سے لے چلو ممی۔''

ڈونا نے گاڑی اسٹارٹ کرنا چاہی لیکن انجن گڑ گڑا کر خاموش ہو گیا...... وہ اسے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور ایک بار پھر اپنی چیخ روکنے میں ناکام رہی۔ کوجو اچھل کر کار کے بونٹ پر چڑھ آیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور دھماکے سے ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ وہ اپنا جبڑا کھولے بار بار ان پر حملہ کر رہا تھا لیکن اس کے نوکیلے دانتوں اور کار کے مسافروں کے درمیان شیشے کی دیوار حائل تھی۔ وہ اس دیوار کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ ٹیڈ کی چیخیں دل خراش تھیں۔ وہ ماں کی چھاتی میں منہ چھپائے زور زور سے چلا رہا تھا۔

''ممی گھر چلو...... گھر چلو ممی۔''

''ڈونا کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔'' روئے نہیں ٹیڈ...... روتے نہیں، وہ اندر نہیں آسکتا۔ ہم بالکل محفوظ ہیں۔''

ونڈ اسکرین پر کوجو کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پھیلی ہوئی تھی۔ جھاگ کی دوسری جانب اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ آنکھیں ڈونا پر مرکوز تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

''میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ٹین کا کیبن تمہیں کب تک بچائے گا۔ میں تمہارے ٹکڑے کردوں گا۔ اور جب تم چیخ رہی ہوگی میں تمہارا گوشت کھا رہا ہوں گا۔

ڈونا سمجھ گئی کہ کتا پاگل ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے وہ اپنے مالک کو بھی ہلاک کر چکا ہو۔ اس نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور کوجو اچھل کر بونٹ سے اتر گیا۔ ڈونا نے مسلسل ہارن بجانا شروع کر دیا۔ لگتا تھا ہارن کی آواز کتے کے کانوں کو مجروح کر رہی ہے وہ غراتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ مسلسل ہارن کے باوجود ورکشاپ میں سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ پھر ڈونا کو اس تنہا مکان کا خیال آیا جو اس نے ٹیلے پر چڑھتے وقت دیکھا تھا۔ مکان سے باہر گھاس پر ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہاں کوئی رہتا تھا۔ ڈونا نے مخصوص انداز میں ہارن بجانا شروع کر دیا۔

تین دفعہ طویل...... تین دفعہ مختصر۔ یہ آواز خطرے کی علامت تھی۔ ڈونا نے دو سال اسکاؤٹس کی تربیت حاصل کی تھی۔ اور وہیں اسے یہ طریقہ بتایا گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر گھر والے اس کا پیغام نہ بھی سمجھے تب بھی وہ یہ دیکھنے تو آئیں گے کہ جو کیمبر کے گھر کے سامنے کون مسلسل ہارن بجا رہا ہے۔

''شام کے تقریباً سات بج چکے تھے لیکن دن کی روشنی ابھی باقی تھی۔ ممی! اب تو انجن ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ پلیز گاڑی اسٹارٹ کرونا۔''

''تھوڑی دیر اور میرے بیٹے بس تھوڑی دیر

اور" ڈونا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ درحقیقت وہ چابی گھماتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر اب بھی انجن سٹارٹ نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اسے کتوں کے باؤلے پن کے متعلق زیادہ علم نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ زیادہ شور پاگل کتے کو مشتعل کردیتا ہے۔ اگر اس کے چابی گھمانے سے کتا پھر گاڑی پر حملہ آور ہوگیا تو کیا ہوگا۔

ایک بار پھر اس کا دھیان گھر کے آہنی دروازے کی طرف گیا۔ وہ پچھلے تین گھنٹے میں کئی بار اس دروازے اور کار کے درمیانی فاصلے کو نگاہوں سے ناپ چکی تھی۔ اگر وہ تیز بھاگ کر صرف...... آٹھ قدم اٹھاتی تو دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ یقینی بات تھی کہ گھر میں ٹیلیفون تھا۔ شیرف کو ایک کال ساری مصیبت کا خاتمہ کرسکتی تھی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو کیمبر کے گھر میں رائفل ہو۔

کتا اس وقت گیراج کے ادھ کھلے دروازے میں بیٹھا تھا۔ ڈونا کو یقین تھا کہ وہ کتے کے پہنچتے پہنچتے آہنی دروازے تک پہنچ جائے گا...... لیکن اگر دروازہ لاک ہوا تو...... تو کیا چار سالہ ٹیڈ وہ سلوک دیکھ سکے گا جو کتا اس کی ماں کے ساتھ کرے گا۔ کیا وہ کتے کو ماں کی بوٹیاں نوچتے دیکھ سکے گا؟ ڈونا کو جھرجھری آ گئی۔ نہیں یہ آٹھ قدم کا فاصلہ...... بہت طویل ہوسکتا تھا۔ اس کار میں وہ اور اس کا بچہ زیادہ محفوظ تھے۔ اس کا ہاتھ چابی کی طرف بڑھ گیا۔ خدا کو یاد کرکے اس نے چابی گھمائی ...... ایک بار ...... دو بار...... اور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ ٹیڈ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ خدایا تیرا شکر ہے۔

ڈونا تقریباً چلا اٹھی۔ اس نے ایک دوبار ریس دی۔ کوجو تیزی سے باہر نکلا اور چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوکر کار کو دیکھنے لگا۔ ڈونا نے اس پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالی اور گاڑی کو ریورس کرنے کے لئے گیئر لگایا۔ گاڑی ریورس ہوئی لیکن دو یا تین فٹ رینگ کر رک گئی۔ انجن یکلخت خاموش ہوگیا۔ ڈونا نے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا ،ڈیش بورڈ پر سرخ روشنی پھر ابھر آئی تھی۔

"ممی...... ممی...... ممی" ٹیڈ زور زور سے رونے لگا۔"

"خاموش" ڈونا جھنجلا کر بولی۔ وہ جلدی جلدی چابی گھما رہی تھی۔ انجن ہر بار کراہ کر خاموش ہوجاتا تھا۔ اسے لگا کہ بیٹری بتدریج ڈاؤن ہورہی ہے۔ لاچار ہوکر اس نے اسٹیرنگ پر سر ٹکا دیا اور آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے مسلسل ہارن پر بھی کوئی یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ شاید ٹیلے کے قریب واقع گھر والے بھی موجود نہیں تھے۔ وہ اسٹیرنگ پر جھکی رہی۔ ٹیڈ کا ننھا سا ہاتھ اس کی پشت پر آ گیا۔ "ممی! مجھ پر غصہ آ گیا تھا تمہیں۔"

اس نے بے چین ہوکر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نہیں میرے بچے...... نہیں۔ بس ذرا حوصلہ کرو۔ انجن ضرور اسٹارٹ ہوگا۔ بہت جلد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ ٹیڈ نے اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ کوجو ایک بار پھر گیراج میں چلا گیا تھا۔ ڈونا بند آہنی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ آٹھ قدم...... صرف آٹھ قدم...... لیکن سوال پھر وہی تھا مقفل...... غیر مقفل۔

وہ ایک تاریک رات تھی، تاریک اور پر ہول، گیراج کے ادھ کھلے دروازے میں کوجو کا ہیولا نظر آرہا تھا لیکن اب ڈونا کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ واقعی کو جو کھڑا ہے یا اس کی نظر دھوکا کھا رہی ہے۔ ٹیڈ اب اس کی گود میں سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ ڈونا نے تھرماس میں کچھ دودھ نکال کر بمشکل اسے پلایا تھا کوشش کے باوجود اسے سلائس نہیں کھلا سکی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ ایک شور سن کر کھلی گھر کے اندر ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی کوجو پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ گھن گرج کے ساتھ بھونکتا ہوا آہنی دروازے پر پل پڑا تھا۔ اس کی وحشیانہ ٹکروں سے دروازے کے تختے چٹک رہے تھے۔ ٹیڈ نے بھی جاگ کر رونا شروع کردیا تھا۔ خدا خدا کرکے گھنٹی کی آواز تھمی اور کوجو کی وحشت کم ہوئی۔

اس وقت سینکڑوں میل دور برٹ نے مایوسی سے

سر ہلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ چیری قریب ہی کھڑی تھی۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا خوبصورت کشادہ اور سجا سجایا۔

برٹ نے کہا۔ "لگتا ہے ڈیڈی، انکل گرے کے ہاں تاش کی بازی لگا رہے ہیں۔"

"شاید" چیری نے کہا۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ دونوں دوست فراغت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھانے کے لئے لمبی سیر پر نکل گئے ہوں گے۔ ممکن تھا وہ اس وقت کاسٹل راگ کے کسی قحبہ خانے میں بیٹھے شراب اور شباب سے دل بہلا رہے ہوں۔

"برٹ بولا۔ ممی! اب کوجو کا کیسے پتہ چلے گا؟"

چیری نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "برٹ! اگر کوجو کی حالت خراب ہوتی تو تمہارے ڈیڈی گھر سے کہیں نہ جاتے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو...... چلو دس بجنے والے ہیں اب جا کر سو جاؤ۔

برٹ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ اس کا ذہن کہیں کوجو اور ڈیڈی کے قرب وجوار میں گھوم رہا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ ازدواجی چپقلش کے باوجود چیری بھی دن میں کئی بار، جو کو یاد کر چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں اب کبھی اس سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس سے طلاق لے لے گی۔ برٹ اس کے ارادے سے بے خبر تھا، لیکن اسے امید تھی کہ وہ چند دن میں اسے اس تبدیلی کے لئے تیار کر لیگی۔

رات خاموش تھی۔ ایک سنسان عمارت کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار میں ایک عورت اور ایک بچہ سو رہے تھے۔ یہ عورت ڈونا تھی اور یہ بچہ ٹیڈ۔ ڈونا ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ دور کھیتوں کے درمیان سے اس کا شوہر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا کار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنا براؤن تھری پیس پہن رکھا تھا اور بڑا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ورکشاپ کے اندر ایک بہت بڑا پاگل کتا چھپا ہوا ہے۔ ڈونا نے چیخ کر اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس گئی اور پھر ورکشاپ کے آدھ کھلے دروازے سے کوجو برآمد ہوا۔ اس نے اپنی خوفناک نگاہوں سے وک کو دیکھا اور اس کی طرف بڑھا...... تب وک نے بڑی پھرتی سے اپنی پتلون کی جیب سے ریوالور نکالا اور کتے پر فائر کر دیا۔ کتا چلا کر زمین بوس ہو گیا۔ وک اطمینان سے چلتا کتے کے قریب پہنچا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اس کی لاش اٹھائی لیکن یہ تو صرف کھال تھی...... کوجو کی کھال۔ وک نے اسے جس کر بتایا کہ کوجو اس کھال میں موجود نہیں۔ پھر یہ کھال بھی وک کے ہاتھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے انگلی سے لیٹر بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ یہ لیٹر بکس ہے کیا اس میں ڈاک آ چکی ہے۔ ڈاک کا دھیان رکھنا ...... ڈاک بہت اہم چیز ہے۔"

ڈونا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کا ٹھیک ایک بجا تھا۔ ٹیڈ اپنی نشست پر گہری نیند سو رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کے منہ میں تھا۔ کوجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر اس کی نگاہ لیٹر بکس پر پڑی۔ ساتھ ہی اسے یاد آ گیا کہ چند لمحے پہلے وہ کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایکا ایکی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ڈاک بہت اہم چیز ہے۔ یہ الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ شواہد سے ظاہر تھا کہ ڈاک یہاں باقاعدہ سے آتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کل بھی ڈاک آئے گی۔ کل کسی وقت سہ پہر سے پہلے ڈاکیہ یہاں ضرور پہنچے گا۔ ڈونا کے ہونٹ خوشی سے لرزنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت ٹیڈ کو جگا کر یہ خوشخبری سنائے۔ لیکن پھر اس نے خود پر ضبط کیا۔ وہ نشست سے ٹیک لگا کر مختلف امکانات کے بارے میں سوچنے لگی۔ ظاہر تھا کہ اگر ڈاکیہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کے اس آخری اسٹاپ تک آتا ہے تو وہ کل کسی وقت ضرور آئے گا۔ اگر جو کیمبر کی ڈاک نہ بھی ہوتی تو بھی اسے یہ تو دیکھنا ہوگا کہ کل والی ڈاک نکالی گئی ہے یا نہیں پھر اس کا دھیان اپنے شوہر کی طرف چلا گیا۔ اسے معلوم تھا وہ آج صبح اسے ٹیلیفون کرے گا۔ رابطہ قائم نہ ہونے پر وہ پھر رنگ کرے گا اور یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہے گا۔ وہ ضرور سوچے گا

کہ دونوں ماں بیٹا کہاں گئے۔ ہوسکتا ہے وہ فکر مند ہو کر کسی پڑوسی کو ٹیلیفون کرے اور اسے کہے کہ ڈونا اور ٹیڈ کا پتہ کرو۔ پھر وہ جو کیمبر اور اس کے اہل خانہ کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ سب کے سب کہاں چلے گئے؟؟

دفعتاً ایک دہشت ناک خیال اس کے ذہن میں آیا کہیں...... کہیں وہ تینوں کتے کا شکار تو نہیں ہوگئے تھے۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ سوچنے کی بات تھی اگر وہ تینوں اپنی مرضی سے کہیں گئے تھے تو کتے کو کیوں چھوڑ گئے تھے۔ اور اگر اسے چھوڑ ہی گئے تھے تو اس کی خوراک کا کیا انتظام تھا۔ عموماً جب لوگ کہیں جاتے ہیں تو آس پڑوس میں کسی سے اپنے پالتو جانور کی نگہداشت کا کہہ جاتے ہیں لیکن کوجو کے پاس تو کوئی چڑیا نہیں بھٹکتی تھی۔

وہ خیالوں کا تانا بانا بنتے ہوئے ٹیڈ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ اچانک اسے اپنے کان کے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے گردن گھما کر دیکھا...... کوجو کا بھیانک چہرہ صرف چھ انچ کے فاصلے پر تھا۔ کھڑکی کے شیشے نے ان دونوں کو جدا کر رکھا تھا۔ اس کی تھوتھنی پر خشک جھاگ کے پاپڑیاں نظر آرہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں شاید معمولی سی درز تھی۔ بو کا ایک بھبھکا ڈونا کے نتھوں میں گھستا چلا گیا۔ ڈونا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس بو کو پہچانتی ہے۔ ہاں...... وہ اس بو کو پہچانتی تھی۔ یہ بو اس نے ٹیڈ کی الماری میں سونگھی تھی۔ وہ ان آنکھوں کو بھی پہچانتی تھی۔ یہ آنکھیں اس نے الماری کے آدھ کھلے دروازے میں دیکھی تھی۔ اس کی سانس جیسے رکنے لگی۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سینے سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور حلق میں آ کر اٹک گئی۔ وہ بری طرح دہشت زدہ تھی۔ سب سے دہشت ناک بات یہ تھی کہ کوجو کی آنکھیں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ صاف محسوس کررہی تھی کہ یہ آنکھیں اسے کوئی پیغام دے رہی ہیں کوجو کا پیغام وہ کہہ رہا تھا۔

"اے عورت! میں تجھے چھوڑوں گا اور نہ تیرے بچے کو تجھے ڈاکیئے کا انتظار ہے تو شوق سے کر، لیکن ...... میں اسے بھی ماردوں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تم دونوں کو ماروں گا...... یاد رکھو میرا نام کوجو ہے اور میرے لگائے ہوئے زخم کا مطلب ہے موت۔"

چیخ ڈونا کے حلقے سے آزاد ہونے کو بے تاب تھی لیکن ڈونا چیخنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے چیخنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا بیٹا ایک فرشتے کی معصومیت چہرے پر سجائے گہری نیند سو رہا تھا۔

عین اس وقت بوسٹن کے ایک ہوٹل میں وک گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ساتھ والے بستر پر اس کا دوست روجر محو خواب تھا۔ وک نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ رات کے اس آخری پہر اس کا دھیان خود بخود گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا ڈونا اس کے بعد کیا کرے گی۔ وہ اور ٹیڈ گھر میں تنہا تھے۔ ٹیڈ بھی دن کے وقت نرسری چلا جاتا تھا۔ کیا سیٹو کیمپ نامی وہ شخص پھر اس کے گھر کا رخ کرے گا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے اپنی خوابگاہ میں سیٹو اور ڈونا کے ہیولے دیکھے اور اس کا سینہ جل اٹھا۔ وہ سوچنے لگا کیا ڈونا اور اس کی ازدواجی زندگی برقرار رہ سکے گی۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ جاگنے سے پہلے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا خواب تھا وہ؟ سمندر کے درمیان خشکی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس پر شاید ڈونا اور ٹیڈ کھڑے تھے ٹیڈ زور زور سے چلا رہا تھا۔ وہ اسے مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ ایک ایک کرکے خواب کی بہت سی تفصیلات اس کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ نجانے کیوں اس کا دل چاہا کہ ڈونا کو ٹیلیفون کرے۔ وہ اٹھ کر ٹیلیفون کی طرف گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اس نے سوچا اس وقت دونوں ماں بیٹا گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ یوں بھی ان کے ازدواجی تعلقات جس بحرانی کیفیت سے دوچار تھے۔ اس میں آدھی رات کو اپنی بے قراری کا اظہار کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے سوچا صبح ناشتے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرے گا۔ لیکن صبح نہ صرف وہ

ٹیلیفون کرنا بھول گیا بلکہ وہ خواب بھی بھول گیا جو رات کسی پہر اس نے دیکھا تھا۔

دوسری طرف ڈونا اور ٹیڈ گاڑی میں بند کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔ گرمی شدید تھی۔ اتنی شدید کہ جسم کے ہر مسام سے پسینے کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ ٹیڈ کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ وہ نشست سے ٹیک لگائے یک ٹک ونڈا سکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ ڈونا کی نظر اس کی گود میں رکھے ایک تہہ شدہ زرد کاغذ پر پڑی۔ یہ کیا ہے ٹیڈ؟ اس نے پوچھا۔

یہ بلا کو بھگانے والی تحریر ہے ممی۔ اس نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ کیا بلا ہم کو کھا جائے گی؟

ڈونا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نہیں ٹیڈ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ یہ بلا نہیں ہے۔ صرف ایک کتا ہے ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں...... یہ دیکھو دس بج چکے ہیں ۔ دو ڈھائی بجے سے پہلے پہلے ڈاکیہ یہاں ضرور آئے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بارہ بجے کے قریب ہم ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے کہ گاڑی ہی اسٹارٹ ہو جائے۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں اپنے بیٹے کو نہلاؤں گی۔ پھر کھانا کھائیں گے اور پھر ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر ڈیڈی کے ٹیلیفون کا انتظار کریں گے...... ٹھیک ہے نا۔"

ٹیڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے مضبوطی سے پیلے کاغذ کو تھام رکھا تھا۔ ڈونا نے دونوں طرف کی کھڑکیاں چار چار انچ نیچے گرا دی تھیں لیکن گرمی پھر بھی نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ ڈونا کو ایک پمفلٹ کی تحریر یاد آئی جس میں جانوروں کے تحفظ کی ایک انجمن نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ زیادہ گرمی میں اپنے کتوں کو گاڑیوں میں بند کر کے نہ جائیں ۔ دھوپ میں پارک کی ہوئی بند گاڑی کا درجہ حرارت 40 فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے اور اتنی گرمی جانوروں کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ڈونا نے سوچا یہاں معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔ ایک کتے نے انسانوں کو گاڑی میں بند کر دیا ہے اور اب ان کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ یہ بے بسی نہیں تھی تو اور کیا تھا۔ آج صبح ڈونا باتھ روم جانا چاہتی تھی، لیکن نہیں جا سکتی تھی۔ ٹیڈ نے اپنی چھوٹی سی خالی تھرماس میں پیشاب کیا تھا۔ پھر یہ تھرماس ڈونا نے کھڑکی میں سے دور پھینک دی تھی۔ دونوں نے دو دو بسکٹ کھائے تھے۔ دودھ کا ذائقہ بدل چکا تھا، لیکن مجبوراً انہوں نے وہی دودھ پیا تھا۔ اس کے بعد ڈونا نے ٹیڈ کو بتائے بغیر کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہاتھ بہ آہستگی نیچے لے جا کر اس نے چابی گھمائی تھی...... لیکن ایک ہلکی سی کلک کے سوا کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ بیٹری موٹر کو گھمانے میں ناکام رہی تھی...... اور اب آگ برساتا ہوا سورج آہستہ آہستہ اپنے سفر کے نقطہ عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے رحم دھوپ اس گاڑی کو بتدریج آگ کی بھٹی میں تبدیل کر رہی تھی۔ ڈونا کو اس وقت صرف ایک ہی آس تھی۔ ڈاکیئے کی وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ ڈاکیہ اپنی سفید اور سرخ موٹر کار میں ڈاک کا انبار لئے اپنے سفر کا آغاز کر چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹاؤن روڈ نمبر 3 جس کے آخری اسٹاپ پر ایک نیم جان عورت اور بچہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔

ڈونا نے دستی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے والے تھے ٹیڈ نے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ضد شروع کر دی۔ ڈونا نے اسے سمجھایا کہ بیٹری بہت ڈاؤن ہو چکی ہے، اسے بارہ ایک بجے سے پہلے بالکل نہیں چھیڑنا چاہیے...... لیکن ٹیڈ کی ضد بڑھتی چلی گئی۔

بالآخر ڈونا نے چابی گھمائی دو تین بار گھرر گھرر کی آواز آئی، لیکن انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ پھر یہ آواز آنا بھی بند ہو گئی۔ ڈونا نے ہارن پر ہاتھ رکھا۔ اس میں سے بھی ایک نا قابل شناخت مدھم سی آواز برآمد ہوئی۔ پہاڑی کے دامن میں واقع مکان تک اس آواز کا پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ ڈونا نے سوئچ آف کیا اور غصے سے بولی۔

لو اب خوش ہو۔ ہو گئی اسٹارٹ گاڑی تمہیں کہا بھی تھا کچھ صبر کرو۔

ننھے ٹیڈ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

اس کے ہونٹ اب بالکل خشک ہو چلے تھے۔ وہ اتنے دکھ سے رو رہا تھا کہ ڈونا کو ترس آ گیا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگی کہ اس نے ٹیڈ کو کیوں جھڑکا۔ وہ اسے بازوؤں میں لے کر چپ کرانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ ٹیڈ کا جسم کچھ اکڑا اکڑا سا ہے۔ ایک وہم سا اس کے ذہن میں پیدا ہوا، لیکن پھر فوراً ہی اس نے یہ وہم جھٹک دیا۔ ٹیڈ کے آنسو تھم گئے تھے اس نے ناک سے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔

"ممی! اب میں تمہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ تمہیں گاڑی اسٹارٹ کرنے کا بھی نہیں کہوں گا......لیکن جب گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی اور...... ہم گھر چلے جائیں گے تو تم مجھے ٹھنڈا اینگوا سکوائش پینے کی اجازت دو گی؟"

"ضرور ٹیڈ۔ جو تم کہو گے وہی پلاؤں گی۔" ڈونا نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کی نگاہ چند گز دور گھاس پر رکھی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بغور جائزے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ بیس بال کا ایک ٹوٹا ہوا بلا ہے۔ جب وہ اس بلے کی موجودگی پر غور کر رہی تھی گودام کے دروازے میں ایک سایہ لہرایا اور کوجو جو پچھلے دو گھنٹے سے اوجھل تھا، کار کو گھورتا اور غراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی ٹیڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نشست پر کچھ نیچے کو کھسک گیا۔

عین اس وقت ڈاکیہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 پر ڈاک تقسیم کرتا ہوا آ رہا تھا۔ آخر وہ گرے کے مکان کے سامنے پہنچا۔ اس نے گاڑی کھڑی کی اور تھیلے میں سے ایک لفافہ نکالتا ہوا باہر آ گیا۔ لفافہ لیٹر بکس میں ڈال کر اس نے ایک نظر گیراج کی طرف دیکھا۔ گرے کے ساتھ ساتھ جو کیمبر کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ لیٹر بکس میں سے پرسوں کی ڈاک ابھی تک نہیں نکالی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا گرے گھر میں موجود نہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ اپنے لنگوٹیے یار جو کیمبر کے ساتھ کہیں تفریح کے لیے نکل گیا ہے۔ اس شبہ کو یوں بھی تقویت ملی تھی کہ جو کیمبر نے اپنی ورکشاپ سے ٹیلیفون کر کے پوسٹ ماسٹر سے کہا تھا کہ وہ چند روز کے لئے باہر جا رہا ہے لہٰذا اس کی ڈاک ڈاکخانے میں روک لی جائے۔ اس کی ہدایت کی بدولت ڈاکیہ اس سخت گرمی میں قریباً ایک فرلانگ کے سفر سے بچ گیا تھا۔ اب وہ ٹاؤن نمبر 3 کے آخری اسٹاپ تک جائے بغیر واپس جا رہا تھا۔ شدید گرمی میں بوکھلایا ہوا ڈاکیہ، گیراج میں خون کے دھبے نہیں دیکھ سکا۔ نہ ہی اسے بغلی دروازے کا ٹوٹا ہوا شیشہ دکھائی دیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے یہ ضرور سوچا کہ دونوں گاڑیاں یہاں تو گرے اور جو گئے کس چیز پر ہیں لیکن پھر اسے جو کیمبر کا کھٹارا ٹرک یاد آیا۔ اس نے گمان کیا کہ انہوں نے وہی ٹرک استعمال کیا ہے حالانکہ یہ بات فکر طلب تھی کہ دو آرام دہ گاڑیوں کی صورت میں انہوں نے ٹرک کیوں استعمال کیا۔

☆......☆......☆

"اسٹیو کیمپ" نے ڈونا کے شوہر کو دھاکہ خیز خط پوسٹ کر دیا تھا اور اب بے صبری سے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا لیکن چوتھے دن بھی اسے کوئی من پسند اطلاع نہیں ملی۔ اس نے وک کے دفتر ٹیلیفون کئے اور اسے پتہ چلا کہ وک تو قصبے سے باہر گیا ہوا ہے۔ بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ پانچ چھ روز سے پہلے اس کی واپسی متوقع نہیں۔ اس کا مطلب تھا خط ابھی وک کو نہیں ملا۔ چلو...نہیں ملا تو واپسی پر مل جائے گا۔ اسٹیو نے سوچا پھر وہ اٹھ کر سفر کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دکان کو تالا لگا دیا تھا اور کچھ عرصے کے لئے فلوریڈا جا رہا تھا۔ اب وہ کسی اور جگہ کی رنگینیوں کو آنکھوں میں سمونا چاہتا تھا۔ سہ پہر دو بجے کے قریب اس نے ضروری سامان اپنی ویگن میں رکھا اور روانہ ہو گیا، لیکن ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا اور دل ایک دم شدت سے دھڑکنے لگا۔ ڈونا کا شوہر وک گھر میں نہیں تھا۔ نہ ہی آئندہ چند روز میں اس کے آنے کی توقع تھی۔ ڈونا اپنے بچے کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ کیوں نہ اس سے اس روز کی بے عزتی کا بدلہ لیا جائے...... ہاں ٹھیک

ہے۔ اس قصبے سے مجھے جانا تو ہے ہی تو کیوں نہ جاتے جاتے یہ حساب بھی چکا دیا جائے۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے ویگن کا رخ ڈونا کے گھر کی جانب موڑ دیا۔

ٹھیک سوا تین بجے اس نے ویگن گھر کے عقب میں کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا۔ مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ چلچلاتی ہوئی سہ پہر میں گلیاں سنسان دکھائی دے رہی تھیں۔ پرند چرند تک کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ یہ ماحول اس کے ارادوں کے لیے بہت سازگار تھا۔ ڈونا کا خوبصورت بھرا بھرا سراپا اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتا وہ گیٹ کے سامنے پہنچا...... لیکن پھر اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ گیراج میں ڈونا کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ بے پناہ مایوسی کے ساتھ اس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی دروازہ بھی کھلا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔ کوئی ہے...... جواب میں دوپہر کے گھمبیر سائے کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ نہایت طیش کے عالم میں اس نے سامنے رکھے ٹی وی کو پاؤں سے دھکا دیا۔ وہ اسٹینڈ سے الٹ کر فرش پر گرا اور اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ دفعتاً سیٹو کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا۔۔۔ ڈونا نہیں تو اس کا سجا سجایا گھر ہی سہی۔ اس کی سانس پھر تیز ہو گئی۔ اس نے اطمینان سے گھر کے دروازوں کو اندر سے مقفل کیا اور نہایت وحشیانہ انداز میں چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگا۔ پہلے وہ باورچی خانے میں گیا اور تمام کراکری توڑ ڈالی۔ پھر اس نے ایک کرسی اٹھائی اور گھر کے تمام شیشے چکنا چور کر دیے۔ ہر قیمتی شے کو اس نے بے کار ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پردے پھاڑ ڈالے بجلی کا قیمتی سامان اور ڈیکوریشن کی چیزوں پر دے ماریں، وک، ڈونا اور ٹیڈ کی ایک بڑی تصویر اتار کر فرش پر پھینکی اور اسے اپنے پاؤں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر اس نے جلتے ہوئے سگریٹ سے نہایت قیمتی بیڈ شیٹس کو جگہ جگہ سے داغ دیا۔ تب اس کی نگاہ سنگھار میز کے آئینے پڑی۔ ایک پیپر ویٹ مار کر اس نے آئینہ توڑ ڈالا۔۔۔

قریب ہی دیوار پر لگے ہوئے نوٹس پر ایک روز پہلے ڈونا نے کوئی پیغام لکھا تھا۔ میں اور ٹیڈ گاڑی ٹھیک کروانے جو کیمبر کی ورکشاپ جا رہے ہیں، جلد واپسی ہوگی، اس نے یہ پیغام مٹایا اور اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھ دیا۔

"پیاری ڈونا! امید ہے تمہیں میرا یہ کام پسند آئے گا۔"

پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ویگن کھلی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ ڈونا اس نقصان پر سخت تلملائے گی۔ عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کا تعاون حاصل کرے۔ وہ اب جلد از جلد دور نکل جانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

یہی وہ وقت تھا جب ڈونا نے ڈاکیئے کی آس دل سے نکال دی۔ تین بج کر پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔ لیکن گرمی کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کار کا اندرونی درجہ حرارت کم از کم 105 ڈگری تھا ننھا ٹیڈ نیم جان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں اور وہ ماں کی گود میں سر رکھے یک ٹک کار کی چھت کو گھور رہا تھا جو اطمینان سے گیراج کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ اوپر اٹھا کر عجیب ہولناک انداز میں بھونکتا اور پھر اپنی سرخ آنکھوں سے ڈونا کو گھورنے لگتا...... ڈونا ایک پڑھی لکھی حقیقت پسند عورت تھی۔ افسانوی باتوں نے اسے کبھی متاثر نہیں کیا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ کوجو صرف ایک کتا ہے۔ جو کسی وجہ سے باؤلا ہو گیا ہے۔ ٹیڈ کی الماری اور اس کتے میں قطعاً کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ لیکن جب بھی وہ کتے کی آنکھوں میں دیکھتی تھی اسے لگتا تھا جیسے یہ کتا ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ اس کے خیالات درہم برہم ہو جاتے تھے۔

پچھلے دو ڈھائی گھنٹے وہ مسلسل آہنی دروازے پر غور کرتی رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ٹیڈ سے کہے کہ وہ دروازے کی طرف جا رہی ہے۔۔۔ اور چاہے اس کے

ساتھ کچھ بھی ہو جائے وہ کار سے باہر نہ نکلے۔اسے امید تھی کہ اگر وہ اچھی طرح سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تو ٹیڈ کار سے نہیں نکلے گا۔ کار سے نکل کر وہ دروازے کی طرف بھاگے گی۔ اس کا لٹو گھمائے گی۔ اگر دروازہ کھلا تو وہ کار کی طرف واپس نہیں آئے گی بلکہ پہلو کی طرف سے کسی اور دروازے پر قسمت آزمائی کرے گی۔۔۔ لیکن جب وہ اس منصوبے پر غور کر رہی تھی۔ کوجو جو ڈیڑھ دو گھنٹے سے گیراج کے اندر تھا ٹہلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ اور ڈونا کو اپنا ارادہ پھر ملتوی کرنا پڑ گیا تھا۔ ٹیڈ نے کسمسا کر ڈونا کے چہرے کی طرف دیکھا اور ایکا ایکی بڑے دکھ سے رونے لگا ممی۔۔۔ مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ ہم گھر کب جائیں گے۔۔۔؟ ڈونا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور دلاسہ دینے لگی، لیکن اب وہ کسی طرح چپ ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈونا دل میں کہہ رہی تھی۔ نہ رو میرے بچے نہ رو۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ تیرے جسم میں جو تھوڑی بہت نمی ہے اسے آنکھوں کے راستے ضائع نہ کرو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تھرماس کا ڈھکن کھولا۔ بمشکل چند گھونٹ دودھ باقی بچا تھا۔ وہ جانتی تھی شام سے پہلے پہلے یہ دودھ ختم ہو جائے گا۔۔۔۔

اس کے بعد کیا اس کا بیٹا مر جائے گا؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ دفعتاً گھر کے اندر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی کوجو کان کھڑے کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پہلے چند قدم اس نے آواز کی طرف بڑھائے۔ پھر وہ پلٹا اور خوفناک تیزی سے کار پر حملہ آور ہوا ایک دھماکے سے اس نے ڈونا کی جانب والے دروازے کو ٹکر ماری۔ دروازہ کھڑ کھڑا اٹھا۔ ٹیڈ چیخا۔ کتا الٹے قدموں واپس ہٹا۔ اس کی تھوتھنی شدید ٹکر سے زخمی ہو چکی تھی۔ ڈونا نے سمجھا وہ واپس جا رہا ہے، لیکن نہیں۔ اس نے دوبارہ کار کی طرف جست بھری اور خوفناک آواز سے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا۔ اس کی تھوتھنی کا خون شیشے پر پھیل گیا۔ ڈونا نے دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا، شیشے پر ایک روپہلی لکیر نظر آنے لگی تھی۔ تو کیا شیشہ ٹوٹ؟ ڈونا نے شدید خوف

کے عالم میں سوچا تیسری ٹکر کتے نے پھر دروازے پر ماری۔ آواز اتنی شدید تھی کہ ڈونا نے سوچا اب یہ موذی دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا، لیکن اس نے حیرت سے دیکھا۔ کتا پھر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے رنگین تھا۔ ایک بار پھر وہ دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ اب اندر گھسنا شروع ہو گیا تھا۔ کتے پر نہایت شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ ہٹ کر دروازے سے سر ٹکرا رہا تھا۔ ڈونا نے دیکھا ٹیڈ نے چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ ایک طرح یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ کار کا دروازہ ٹیڑھا ہو کر ڈونا کے کولہے سے آلگتا۔ فون کی گھنٹی تھم گئی۔ اس کے ساتھ ہی کوجو رک گیا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا دم ہلاتا رہا پھر دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا خون آلودہ آسمان کی طرف اٹھا اور ایسی آواز میں چلایا جس نے ڈونا کے جسم میں سرد لہر دوڑا دی اور وہ ایک بار پھر سوچنے لگی کہ کیا واقعی یہ صرف ایک کتا ہے۔ تھوڑی دیر دروازے کے پاس بیٹھ کر کوجو کار کے بالکل سامنے شاید اگلے پہیوں کے نیچے جا بیٹھا۔ ڈونا نے ٹیڈ کو دودھ کے آخری گھونٹ پلائے اور اس کا سر زانوں پر رکھ کر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ امی میرا منہ کڑوا ہو رہا ہے۔ کڑوے کو ٹیڈ کروڑا کہتا تھا۔ اس طرح کا دوسرا لفظ ناشتہ تھا وہ ناشتے کو ناشتہ کہتا تھا اور اس پر اس کے ہم جماعت ہنستے بھی تھے لیکن اب اس نے ناشتہ کہنا سیکھ لیا تھا۔ ڈونا جانتی تھی اس کا منہ پیاس کی وجہ سے کڑوا ہے لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس کا سر تھپکنے لگی۔ پھر اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف پڑی اور وہ یہ سوچ کر لرز اٹھی کہ اگر کوجو اس شیشے پر چند ٹکریں اور مارتا تو کیا ہوتا۔ بلآخر ٹیڈ سو گیا اور ڈونا کو بھی اونگھ آ گئی، اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو سورج کا آتشی گولہ جو کیمبر کے گھر کے عقب میں روپوش ہو رہا تھا۔ کار دہکتی ہوئی بھٹی میں حرارت کچھ کم ہو گئی تھی۔ کوجو کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ ابھی تک کار کے سامنے تھا۔ اس نے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ جان سکی کہ کوجو گیراج کے سامنے موجود نہیں وہ سوچنے لگی اگر کوجو کار کے سامنے بھی موجود نہیں۔ تو یہ اتنی

دروازے تک پہنچنے کا بہترین موقع ہے۔ ٹیڈ بے خبر سو رہا ہے اس کی اپنی توانائی بھی ابھی اتنی کم نہیں ہوئی کہ ہاتھ پاؤں ہلانے مشکل ہو جائیں۔۔۔۔۔ اگر یہ کوشش کرنی ہے تو پھر کیوں نہ ابھی کر لی جائے۔ ایکا ایکی اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اسے دروازے تک رسائی مشکل نظر آ رہی ہے اور یہ ایک نفسیاتی عمل تھا۔ کسی مشکل قدم کے بارے میں جتنا سوچا جائے وہ اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اپنے ڈیڈی کی نصیحت اس کے کانوں میں گونجی۔۔۔۔ لیکن اگر کوجو خاموشی سے کار کے سامنے بیٹھا ہے اور اس کے نکلنے کا منتظر ہے تو پھر؟؟؟ وہ کتنی دیر تذبذب میں رہی، پھر اس نے کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گرمی کی وجہ سے ٹیڈ اپنی قمیض اتار چکا تھا اب یہ قمیض ڈش بورڈ پر پڑی تھی ڈونا نے یہ قمیض اپنے بائیں ہاتھ پر لپیٹی۔

سوئے ہوئے ٹیڈ پر ایک نگاہ ڈالی اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا اور باہر کی طرف دباؤ ڈالا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اسکا مطلب تھا کہ کوجو کی وحشیانہ ٹکروں نے دروازے کو جام کر دیا تھا۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی تھا تو وہ عقبی دروازہ استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔۔۔۔ اور تب ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی ہی جھونک میں باہر نہیں گری۔ دروازہ پورا کھل گیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔۔۔۔ دفعتاً اس پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ موت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس دنیا میں یہ اس کے آخری لمحے ہیں۔۔۔ دروازہ کھل چکا تھا لیکن اب وہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ کوجو کسی بھی لمحے اس کھلے دروازے سے داخل ہو کر اسے اور ٹیڈ کو چیر پھاڑ سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پکڑا اور جسم کی پوری قوت سے دروازے کو بند کرنا چاہا لیکن۔۔۔۔ وہ بند نہیں ہوا۔ اس نے دیوانگی میں دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''ایک کوشش اور کرو ڈونا۔۔۔۔ ایک کوشش اور اس کے اندر سے آواز آئی۔ ایک بار پھر اس نے ہینڈل کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ کرچ کی آواز آئی اور ایک دھماکے سے دروازہ بند ہو گیا۔ ٹیڈ اس آواز سے کسمسایا اور نیند میں بڑبڑانے لگا۔ ڈونا کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اعصاب جیسے شل ہو گئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ اب بھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کر سکے گی۔۔۔ لیکن اسے کوشش کرنا تھی اور ابھی کرنا تھی۔ اور اس سے بہتر موقع پھر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید یہ اس کا آخری چانس تھا۔ وہ جانتی تھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے سے دو دفعہ آواز پیدا ہوئی تھی اگر کتا گاڑی کے سامنے ہوتا تو ضرور حرکت کرتا۔ یقیناً۔۔۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ ڈونا نے ایک طویل سانس لے کر اعصاب کو قابو کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ دوبارہ ہینڈل پر رکھ دیا۔ اس دفعہ اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔ پھر اپنے پاؤں باہر نکالے اور آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی، لیکن اندھیرا ابھی نہیں پھیلا تھا۔ دور کہیں کوئی پرندہ بول رہا تھا۔ ڈونا نے اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں کو سیدھا کیا۔ پھر جھک کر زمین سے چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھائے اور بونٹ کی دوسری جانب پھینکنے لگی۔ یہی وہ جگہ تھی جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے دو کنکر زمین پر گرے اور ان کی آواز آئی لیکن تیسرا کنکر زمین پر نہیں گرا۔ ایک لمحے کے لیے ڈونا کے ذہن میں آیا کہ وہ آہنی دروازے تک پہنچنے کا ارادہ ترک کر دے، لیکن پھر ہمت کر کے چند قدم آگے بڑھی۔ اس وقت عقب میں آہٹ ہوئی۔ ڈونا نے جلدی سے گردن گھمائی۔۔۔۔ کوجو اس سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور حلق سے ایک دھیمی لیکن مسلسل غراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ ڈونا کے جسم کا ہر ایک رواں کھڑا ہو گیا۔ تو آخر وہ پاگل کتے کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

اس کا شک صحیح نکلا تھا۔ وہ گاڑی کے سامنے خاموشی سے بیٹھا اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا اور اب شکار اور شکاری آمنے سامنے تھے۔ پھر کتے نے اپنی

جگہ سے حرکت کی اور ڈونا کے ہونٹوں سے کربناک چیخ بلند ہوئی۔ حتی الامکان تیزی سے اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کتا خالی سڑک پر گرا لیکن پھر لوٹ کر فوراً سیدھا ہوگیا۔ اس دوران گاڑی کے دروازے کی طرف لپکی، بٹن دبا کر اس نے ہینڈل کھینچا، لیکن دروازہ۔۔۔۔ دروازہ نہیں کھلا اور تب دوسری بار کتے نے اس پر چھلانگ لگادی۔ 200 پونڈ وزنی جسم ناقابل گمان رفتار سے اس کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ منہ کے بل کار سے ٹکرائی پھر تیزی سے سیدھی ہوئی اور کتے کے منہ پر ٹانگ ماری۔

اس دوران اس کا ہاتھ مسلسل ہینڈل سے الجھ رہا تھا۔ کتا پھر حملہ کرنے کے لئے الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ ڈونا نے زور لگا کر دروازہ کھولنا شروع کردیا۔ ڈونا نے زور لگا کر دروازہ کھولنا چاہا۔ وہ جانتی تھی یہ آخری موقع ہے اس کے لئے بھی اور شاید ٹیڈ کے لئے بھی۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ ڈونا نے حتی الامکان تیزی سے پشت کے بل نشست پر گرایا، لیکن وہ برق دروازہ بند نہ کرسکی۔ کو جو خوفناک آواز میں بھونکتا ہوا اندر گھس آیا۔ اب اس کا نصف دھڑ کار کے اندر تھا۔ ڈونا کے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر تھے۔ خون آلود بالوں کے گچھے اس کی برہنہ کلائیوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی انتہائی بدبودار سانس سیدھی ڈونا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے عقب میں ٹیڈ کی دلخراش چیخیں سن رہی تھی۔ ان چیخوں میں اس کی اپنی چیخیں بھی شامل تھیں۔ اور کوجو کی قاتل غراہٹیں بھی۔ پھر کوجو کی گردن اس کے ہاتھوں سے پھسلی اور اس کے نوکیلے دانت ڈونا کے برہنہ پیٹ میں پیوست ہوگئے۔ ایک چیخ کے ساتھ اس نے دروازے کا ہینڈل کھینچا۔ دروازہ زور سے گھوم کر جو کی پسلیوں سے ٹکرایا۔۔۔۔ ایک بار دوبار تین بار وہ آدھ کھلے دروازے سے اسے مسلسل ضربیں لگا رہی تھی کو جو تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ ڈونا بھی وہ باہر نکل رہا ہے۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ اس دفعہ اس نے ڈونا کی ران سے گوشت کا ایک لوتھڑا جدا کردیا۔ ڈونا درد سے بے تاب ہوکر چلائی۔ خون اس کی پنڈلیوں کی طرف بہہ رہا تھا۔ تب کو جو ایک دفعہ پھر اندر گھسا۔ ڈونا نے دوبارہ اس کی گردن تھام لی۔ اس کے ہاتھ کمزور پڑ رہے تھے لیکن جب تک وہ زندہ تھی۔ یہ قاتل جانور اس کے بچے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے زور لگا کر اسے باہر کی طرف دھکیلا، لیکن کتے کا نصف دھڑ اب بھی گاڑی میں تھا۔ پھر اس سے پہلے ڈونا کی ہمت بالکل جواب دے جاتی۔ کتا پچھلے پاؤں پر اچھلنے کے لئے حسب سابق تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ یہ ایک نہایت قیمتی لمحہ تھا۔ ڈونا نے لپک کر دروازے کا ہینڈل تھاما اور پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ دروازہ کو جو کے سر سے ٹکراتا ہوا پرشور آواز سے بند ہوگیا۔ ڈونا نے مڑ کر دیکھا، ٹیڈ، پیلا کاغذ مٹھی میں دبائے ایک کونے میں سمٹا چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ڈونا نے اسے تھپتھپایا۔

''حوصلہ کرو ٹیڈ سب ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے''۔ لیکن وہ جانتی تھی سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ زخمی ہوچکی تھی۔ اور اسے ایک کتے نے کاٹا تھا۔۔۔ اور وہ کتا پاگل تھا۔

جس وقت ٹاؤن روڈ نمبر 3 کے آخری اسٹاپ پر یہ خونی ڈرامہ کھیلا جارہا تھا، کتے کا مالک یعنی دس سالہ برٹ اپنی ماں چیرئی سے اصرار کررہا تھا کہ وہ ڈیڈی کو ٹیلیفون کرکے کتے کی حالت دریافت کرے۔ چیرئی اسے سمجھا رہی تھی۔ کہ کچھ دیر پہلے اس نے ٹیلیفون کیا تھا۔ لیکن وہ گھر سے مسلسل غیر حاضر ہے۔ جب برٹ کا اصرار زیادہ بڑھا تو چیرئی نے اس کی تسلی کے لئے اپنی ایک سہیلی کو ٹیلیفون کیا۔ یہ سہیلی ان کے گھر سے دوڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر رہتی تھی۔ اس کا شوہر بھی کیمبر کا دوست تھا۔ چیرئی نے سہیلی کو بتایا کہ وہ کنکٹی کٹ سے بول رہی ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا اپنے پالتو کتے کے بارے میں پریشان ہیں اگر اسے زحمت نہ ہو تو وہ کسی طرح ان کے گھر کا ایک چکر لگا آئے۔ سہیلی نے وعدہ کیا کہ جونہی اس کا شوہر آیا وہ اسے دریافت حال کے لئے ورکشاپ روانہ کردے گی اور جوابی کال کے ذریعے اسے مطلع کرے گی۔ (چیرئی کی سہیلی نے یہ وعدہ کبھی پورا نہیں کیا)

تقریباً اس وقت ڈونا کا خاوند وک بھی بوسٹن کے ایک

خوبصورت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا بیوی کو ٹیلیفون کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو دفعہ کوشش کر چکا تھا، لیکن کسی نے ٹیلیفون نہیں اٹھایا تھا۔ وہ جانتا تھا اس وقت ٹیڈ ماں کے ساتھ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا ہوگا یا سونے کی تیاری میں مصروف ہوگا۔۔۔ لیکن اور بھی بہت کچھ ہوسکتا تھا یہ بھی تو ممکن تھا کہ۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ گمنام خط لکھنے والے کا تاریک ہیولا اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا۔ یہ ہیولا کسی ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں ڈونا کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ٹیڈ کسی خواب آور دوائی کے زیر اثر صوفے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے سر کو زور سے جھٹک کر یہ تکلیف دہ تصور ذہن سے نکالنا چاہا۔ لیکن اگر یہ تصور غلط تھا اور ڈونا، ٹیڈ کے ساتھ گھر ہی میں موجود تھی تو پھر کوئی ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ انہیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی ایک بار پھر وہ گھر کے نمبر ملانے لگا۔

نمبر ملانے اور مایوسی سے سر ہلا کر ریسیور واپس رکھنے کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہا۔ اب وک خوفزدہ حد تک پریشان تھا۔ ذہن بار بار ایک دائرے میں گھوم رہا تھا پہلے وہ سوچتا کہ ڈونا اپنے محبوب اسٹیو کیمپ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پھر یہ خیال آتا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے اور ٹیڈ کے ساتھ کسی ہسپتال میں پڑی ہے۔ تیسرا خیال ذہن میں یہ آتا کہ گھر میں ڈاکہ پڑا ہے اور دونوں ماں بیٹا شدید زخمی یا ہلاک ہوگئے ہیں۔ وک کا دوست روجر اس کی پریشانیوں سے بے خبر ساتھ والے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جب وک نے بے چین ہوکر کمرے کی روشنی جلادی۔ روجر ہڑبڑا کر جاگ گیا۔

''کیا بات ہے وک۔۔۔ تم سوئے نہیں''۔

اس نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔

وک نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''روجر! رات کے بارہ بج چکے ہیں۔۔۔ ڈونا اور ٹیڈ ابھی تک گھر نہیں پہنچے''۔

روجر بھی گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں دوست کچھ دیر اس مسئلے پر غور کرتے رہے پھر روجر نے وک کو مشورہ دیا ''وہ شیرف کو ٹیلیفون کرے اور اسے کہے کہ اس کے اہل خانہ کی خیریت دریافت کی جائے'' وک نے ڈائریکٹری اٹھائی اور اس میں کاسٹل کاؤنٹی شیرف ڈپارٹمنٹ کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

ٹیڈ پر غنودگی طاری تھی۔ وہ گہری نیند میں بار بار چلا اٹھتا تھا۔ ڈونا دونوں ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ کنپٹیاں درد سے پھٹی جارہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے ذہن کے تار دھیرے دھیرے کھینچے جارہے تھے۔ ٹیڈ کی ادھ کھلی مٹھی سے پیلا کاغذ نیچے گر گیا تھا جیسے اس دعا پر سے اس کے معصوم ذہن کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ یہ دعا کہ جو کوان کی گاڑی سے باہر رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ڈونا نے ایک دکھیاری ماں کی نگاہ سے بیٹے کے سن ہوتے چہرے کو دیکھا اور بڑبڑانے لگی۔

میرے چاند! میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے گھر ضرور پہنچاؤں گی۔ وہ ٹیڈ کی گردن سیدھی کرنے کے لئے آگے جھکی تو پیٹ کے زخم سے ٹیس اٹھنے لگیں، لیکن درد کا اصل منبع اس کی ران تھی گھٹنے سے ذرا اوپر آنے والا یہ زخم نہایت گہرا تھا۔ کار میں ابتدائی طبی امداد کا چھوٹا سا بکس تھا، لیکن اسے پٹی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی اس کا خیال تھا کہ خون بہنے سے زخم کا زہریلا مادہ خارج ہوجائے گا اور یہ بہتا ہوا خون دھیرے دھیرے نشست کو داغدار کر رہا تھا۔ اس نے اسپرین کی دو گولیاں کھائی تھیں، لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پاگل کتے کا شکار خود بھی پاگل ہوجاتا ہے، لیکن اس بارے میں اسے زیادہ معلوم نہیں تھا کہ مرض کا حملہ ہونے کے بعد علاج کیا جائے تو وہ کارگر ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ مرض کا حملہ کتنی دیر میں ہوتا ہے۔ شاید چند گھنٹوں میں، چند دنوں میں یا چند ہفتوں میں بہرحال اس بات کا اسے سو فیصد یقین تھا کہ جس کتے نے اسے کاٹا ہے وہ پاگل ہے اور مرض کی

انجا کو چھوڑ رہا ہے۔۔۔۔ یکبارگی ڈونا کو کارٹنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک تابوت میں بدل گئی۔ اس تابوت میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کا بیٹا بھی تھا۔ ڈونا کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے ذہن میں آواز آئی۔ ڈونا تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔۔۔۔ ورنہ عبرتناک موت تیرا اور تیرے بیٹے کا مقدر بنے گی۔ ہسٹریائی انداز میں وہ چلائی اور اس کا ہاتھ دروازے کی طرف بڑھا، لیکن پھر اس نے اس کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ ڈیش بورڈ سے سر لگا کر رونے لگی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے جو اس کے ساتھ اس کے بیٹے کو بھی بھگتنا پڑ رہی ہے۔ شاید اس پاگل کتے کے روپ میں اس کی جنسی لغزشیں مجسم ہوگئی تھیں۔۔۔۔ اگر یہ صرف ایک کتا تھا تو اب تک مر کیوں نہیں گیا تھا؟ وہ سوچتی رہی اور روتی رہی اور دھیرے دھیرے پکارتی رہی۔

"مدد۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ مدد۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ مدد۔۔۔ کہاں پہنچ رہے ہو۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وک نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شیرف، ہانر مین تھا۔ وہ کاسٹل ورک سے بول رہا تھا اس نے بتایا۔ مسٹر وک تھوڑی دیر پہلے ایک پولیس پارٹی آپ کے گھر بھیجی گئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے لیے اچھی اطلاع نہیں ہے۔"

وک کا چہرہ زرد ہوگیا۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ کیا وہ دونوں مر گئے؟

شیرف کی آواز آنے تک وک جیسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہا۔ پھر اس کی آواز آئی۔ مسٹر وک!

وہ دونوں گھر میں موجود نہیں۔ لہٰذا اس وقت ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ایک یا ایک سے زیادہ افراد نے تمہارے گھر میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی ہے۔۔۔۔ کیا تم کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔

وک کی آنکھیں غصے کی زیادتی سے بھیگ گئیں۔ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ایسا ہوا تو یہ صرف اور صرف ایک شخص کا کام ہے اور اس کا نام ہے اسٹیکمپ۔ میرا بچہ اور بیوی اسی شخص کے پاس ہیں۔ شیرف نے اس شک کی وجہ پوچھی وک کچھ جھجکتا رہا پھر اس نے شیرف کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ آخر میں اس نے کہا کہ ڈونا نے اس لفنگے سے تعلقات ختم کر لئے تھے۔ یہی قطع تعلقی پہلے گمنام خط اور پھر اس کے اغوا کا سبب بنی ہے۔ شیرف نے کہا۔

"لیکن تمہارے گھر کے نوٹس بورڈ پر ایک تحریر بھی ملی ہے لکھا ہے۔" پیاری ڈونا! امید ہے تمہیں میرا کام پسند آئے گا۔" اس فقرے سے انداز ہوتا ہے کہ اسٹیکمپ یا جس شخص نے بھی توڑ پھوڑ کی ہے۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو ڈونا موجود نہیں تھی۔" امید کی ہلکی سی کرن وک کے چہرے پر دکھائی دی۔ لیکن پھر شیرف کی آواز نے اسے فوراً معدوم کر دیا۔ وہ بولا۔

"۔۔۔۔ ہوسکتا ہے اس شخص کی موجودگی کے دوران ہی ڈونا گھر واپس آگئی ہو۔۔۔ بہرحال ہم حتی الامکان تیزی سے تفتیش کر رہے ہیں۔ تم کاسٹل راک کب پہنچ رہے ہو۔"

وک بولا۔ ابھی اسی وقت میں روانہ ہو رہا ہوں میں ائیرپورٹ سے کار لے کر صبح پانچ بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا شیرف نے نرم لہجے میں کہا مسٹر وک! ذرا تسلی سے یہ نہ ہو کہ تمہارے بیوی بچے تو زندہ سلامت مل جائیں اور تم تیز رفتاری میں جان گنوا بیٹھو۔ ریسیور نیچے رکھ کر وک نے قدرے پشیمان نگاہوں سے اپنے دوست روجر کی طرف دیکھا۔ اسے ڈونا کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن شیرف سے اس کی گفتگو کے دوران وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ روجر نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے وک کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک اچھے دوست کی طرح اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

جس وقت وک جلدی جلدی کاسٹل راک روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ قریباً اسی وقت کنکٹی کٹ میں چیرٹی اپنے بستر میں لیٹی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ اس نے جاگ کر گزارا تھا۔ بہن کے ہاں چند روز کے قیام کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ گھر اپنا ہی ہوتا ہے اور عورت کی زندگی شوہر کے بغیر نامکمل

ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ جو کیمبر سخت مزاج تھا۔ بعض اوقات اسے پیٹتا بھی تھا۔ اس گھر میں عسرت وتنگ دستی بھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا گھر تھا۔ جہاں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم اس کے اپنے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج صبح کاسٹل راک واپس روانہ ہوجائے گی اور اس کے بعد کبھی طلاق کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لائے گی۔۔۔ آج اپنا شوہر اسے بے پناہ یاد آرہا تھا۔۔۔وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے مرے کئی روز ہوچکے ہیں اور اب اس سے طلاق لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔۔۔صبح کے چھ بجے تھے۔ ٹیڈ ناشتے کے لئے روتا بیدار ہوا تھا۔ اس کی آواز سن کر ڈونا بھی جاگ گئی تھی۔ کو جو گیراج کے دروازے اور کار کے درمیان بیٹھا تھا۔ ٹیڈ کے رونے کی آواز سے اس نے اپنے کان کھڑے کرلئے۔ ڈونا کو لگا جیسے وہ پھر کار پر حملہ کرنے لگا ہے۔ اس نے ٹیڈ کو بمشکل چپ کرایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہی گھسی پٹی تسلیاں کوجو کے مرنے کی باتیں ڈیڈی کی باتیں کھانے اور گھر کی باتیں یہ باتیں سن سن کر ٹیڈ کی آنکھوں میں امید کی روشنی جلتی بجھتی رہی۔۔۔اور پھر وہ حادثہ ہوا جو ڈونا کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ ڈونا کے ایک لطیفے پر ٹیڈ کمزوری سے ہنسا اور اچانک اس نے اپنا گلا پکڑلیا۔ اس کی سانس پھنسی رہی۔ ڈونا نے دیکھا اس کی آنکھیں الٹ رہی ہیں۔ ٹیڈ وہ چلائی اس سے پہلے بھی ٹیڈ کو دودفعہ غشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ پہلی دفعہ وہ صرف دو سال کا تھا اور دوسری دفعہ اس نے ابھی نرسری جانا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر اسے مرگی قرار دیتے تھے۔ ڈونا کا رنگ برف کی طرح سفید ہوگیا اور وہ ٹیڈ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ ٹیڈ کے ہاتھ پاؤں مڑ چکے تھے اور آنکھوں کے سفید ڈھیلے نظر آرہے تھے وہ نشست پر لڑھک گیا تھا۔ ڈونا سمجھ گئی کہ ٹیڈ مر رہا ہے۔ وہ اپنے اکلوتے بچے سے ہاتھ دھو رہی ہے۔ وہ جانتی تھی اس دورے میں زبان حلق کی طرف گر کر سانس کی نالی بند کردیتی ہے اور ایسا ہوا تھا ٹیڈ کی سانس رک چکی تھی۔ ڈونا نے زور لگا کر ٹیڈ کا جبڑا کھولا اور اس کی زبان کو ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی ٹیڈ۔۔۔۔خدا کے لئے آنکھیں کھولو۔۔۔ٹیڈ کار میں ہونے والی ہلچل نے کوجو کو ایک بار پھر مشتعل کردیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح کھڑکی سے ٹکرایا۔ شیشے کی رو پہلی لکیر یکلخت سینکڑوں چھوٹی چھوٹی لکیروں میں تقسیم ہوگئی۔ شیشہ ٹوٹ رہا تھا۔

دوسری ٹکر، لکیروں کا جال پورے شیشے پر پھیل گیا تیسری ٹکر شیشہ اندر کی طرف ابھر آیا۔ چوتھی ٹکر۔۔۔اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین تھی، لیکن یہ ٹکر کوجو نے کار کے دروازے پر ماری۔ پوری کار جھنجھلا گئی۔ پھر کوجو حسب تھوتنی سے خون کے قطرے ٹپکاتا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس دوران ڈونا، ٹیڈ کی زبان پکڑنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ لیکن وہ ہر بار اس کی انگلیوں سے نکل جاتی۔ ٹیڈ کے دانتوں نے ڈونا کی انگلیاں زخمی کردی تھیں۔ خون رس رس کر اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہا تھا، لیکن ڈونا کو درد کا مطلق احساس نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے ناخن چھو کر ٹیڈ کی زبان پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں تک لے آئی۔ تب اس نے اس کا سر پیچھے کو جھکا دیا۔۔۔سانس کی آمد ورفت بحال ہوگئی۔ ٹیڈ میری آواز سن رہے ہو۔ وہ بولی ٹیڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ وہ وقتی طور پر موت سے بچ گیا تھا لیکن۔۔۔۔موت اس سے دور بھی نہیں تھی اور یہ سب اس ظالم کتے کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سب اس کا قصور تھا۔ ڈونا کے اندر سے غصے کی ایک بلند لہر اٹھی وہ اس کی طرف دیکھ کر پھنکاری بے رحم درندے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی......میں قسم کھاتی ہوں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کی نظریں ایک بار پھر گھاس میں پڑی ہوئی اس شے پر مرکوز ہوگئیں، جو اس کے خیال میں بیس بال کا بلا تھا۔

دن ہر لمحے روشن ہوتا جارہا تھا۔ گاڑی کے اندر حرارت بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔

دوسری طرف وک اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ گھر کی حالت زار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ٹیڈ

کھلونے جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ ہر چیز تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ شیرف اپنے عملے کے ہمراہ موجود تھا۔ فنگر پرنٹس لئے جارہے تھے تصویریں اتاری جارہی تھیں۔ سٹیو کیمپ کی ویگن کا نمبر دور ونزدیک کے تمام پولیس اسٹیشنوں تک پہنچ چکا تھا۔ نزدیکی قصبوں اور شہروں میں بھی پولیس کو ہوشیار کردیا گیا تھا۔ شیرف بانز مین اور سراغرساں میسن کی پوچھ گچھ کے جواب میں وک نے تواتر کے ساتھ یہ کہا تھا کہ اس گمشدگی کا ذمے دار "اسٹیو" ہے لیکن سراغرساں میسن نے یہ نقطہ اٹھایا تھا کہ اگر اسٹیو ڈونا اور بچے کو اغوا کیا ہے تو ڈونا کی گاڑی کہاں ہے۔۔۔

تب وک کو بھی خراب گاڑی کا خیال آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی خراب تھی اور اس کی بیوی اسے ٹھیک کرانے کا سوچ رہی تھی، اس جواب پر میسن نے مکینک کا پتہ پوچھا۔ وک نے بتایا کہ وہ کیمبر نامی شخص سے گاڑی ٹھیک کروانے کا ارادہ رکھتی تھی، لیکن چونکہ وہ کہیں گیا ہوا تھا اس لئے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ گاڑی کہاں لے کر گئی ہوگی۔ میسن نے کئی ورکشاپوں میں ٹیلیفون کیا۔ وک کے خیال میں یہ سارا سلسلہ فضول تھا۔ اغواء کا ذمے دار صرف اور صرف سیٹو تھا۔ وہ میسن کی تفتیش پر سخت جھلایا ہوا تھا۔ میسن نے اسے کہا کہ وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں جاکر آرام کرے وک اپنے کمرے میں پہنچ کر چند منٹ آرام کے لئے لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ آرام کرے گا اس دوران اسٹیو کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جائے گا۔۔۔ لیکن جب وہ اٹھا تو موسم کے سب سے گرم دن کی دوپہر ہوچکی تھی۔

سراغ رساں میسن کے گھر کے لان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کا ذہن بار بار گمشدہ گاڑی میں اٹک جاتا تھا۔ آخر مغویہ کی گاڑی کہاں تھی۔ اس نے جو کیمبر کی ورکشاپ پر بھی کئی دفعہ رنگ کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ اتنے میں برآمدے سے ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی۔ میسن نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سکار بورف، کی اسٹیٹ پولیس ہیڈکوارٹر کی طرف سے اطلاع تھی کہ اسٹیو کیمپ کو ویگن سمیت گرفتار کرلیا گیا ہے۔ عورت اور بچہ اس کے ساتھ نہیں۔ اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کیا ہے۔ یہ اطلاع سنتے ہی میسن نے شیرف بانز مین سے کہا کہ انہیں جو کیمبر کی ورکشاپ میں گاڑی کا پتہ کرنا چاہیے۔ چند لمحے بعد شیرف بانز مین پولیس کار میں جو کی ورکشاپ کا رخ کررہا تھا۔

☆......☆......☆

ڈونا نشست سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ ٹیڈ بے حس وحرکت لیٹا تھا۔ اس کے ہونٹ اب سیاہ پڑ چکے تھے۔ آنکھیں حلقوں کے اندر گہری اتر گئی تھیں...... آہستہ آہستہ اس کی قوت مدافعت ختم ہورہی تھی۔ چار سالہ ٹیڈٹر ینون مررہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں سے ایک مدھم آواز نکلتی "ممی" گھر چلو! لیکن یہ آواز اتنی بلند ہرگز نہیں تھی کہ ڈونا کے کانوں تک پہنچتی۔ کوجو اگلے پنجوں پر سر جھکائے گیراج کے سائے میں بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں اور دماغ میں اٹھنے والی ٹیسیں اب ناقابل برداشت ہوچکی تھیں...... دفعتاً اسے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اسے لگا جیسے شہد کی بہت بڑی مکھی بھنبھناتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ گیراج کی تاریکی میں چلا گیا۔ دم سادھے اس نے دیکھا وہ ایک لمبی گاڑی تھی۔ اطراف سے نیلی اور اوپر سے سفید۔ چھت پر ایک گول بتی تھی۔ شیرف بانز مین نے کار روکی۔ اسے چند سال پرانے ماڈل کی "پنٹو" گاڑی میں موجود تھے۔ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ یہاں سے اگلی نشستوں پر دیکھنا ممکن نہیں تھا وہ پولیس کار سے برآمد ہوا اور محتاط قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ بائیں جانب کا شیشہ چکنا چور تھا۔ بانز مین کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس کے ہاتھ اپنے اعشاریہ 38 پولیس ریوالور تک پہنچا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اسے بالوں کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ عورت کو گولی ماردی گئی ہے، لیکن شیشے میں گولی کا سوراخ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب پاگل کوجو گیراج کی تاریکی میں سے نکلا اور وحشیانہ انداز میں بھونکتا ہوا شیرف پر لپکا۔ شیرف نے گھوم

کر دیکھا، دیوہیکل کتا اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ یہ ایک خوفناک کتا تھا۔ اور اسکی شکل نہایت خوفناک ہو رہی تھی۔ کتے کے دھکے سے شیرف الٹ کر سڑک پر گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھوں سے نکل کر پولیس کار کی چھت پر سے پھسلتا ہوا دوسری جانب جا گرا۔ ایک لمحے کے اندر اندر ہائر مین سمجھ گیا۔ عورت اور بچہ کار میں تھے۔ یہ خونخوار کتا انہیں گھیرے ہوئے تھا۔۔۔۔ اور اب وہ خود اس کتے کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ اسے اپنے پیٹ کے نچلے حصے میں شدید جلن کا احساس ہوا۔ سرخ خون اس کی نیلی قمیض کو بھگوتا ہوا سڑک پر گر رہا تھا۔ کتا اس پر دوبارہ چھلانگ لگانے کے لئے پیچھے ہٹا۔ پھر وہ ہوا میں اچھلا۔ شیرف نے اسے جھکائی دینا چاہی، لیکن کتا اس کی نیت بھانپ گیا۔ اس نے اسی رخ پر چھلانگ لگائی اور شیرف کو نیچے لیے ہوئے پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے نوکیلے دانت شیرف کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں چبا رہے تھے۔ شیرف نے ٹانگوں کے زور سے کتے کو پیچھے اچھالا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ "کار" کا دروازہ کھلا اور ایک عورت برآمد ہوئی۔ یقیناً یہ ڈونا تھی۔ وہ اس کے گھر میں اس کی ٹوٹی ہوئی تصویر کو دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں وہ خاصی پر کشش دکھائی دیتی تھی، لیکن اس وقت وہ نہایت پتلی حالت میں تھی، چہرے پر موت کی زردی، جسم لہولہو۔ کتے نے شیرف کو چھوڑ کر عورت کی طرف دوڑ لگائی۔

عورت نے تیزی سے کار میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ شیرف اپنی کار کی طرف لپکا۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح ریڈیو پر اس حادثے کی اطلاع دے سکے، لیکن زندگی بھر ایسا اذیت ناک تجربہ اسے نہیں ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا اس کی قمیض میں ایک سرخ سوراخ تھا اور اس کے اندر سے ایک موٹا خاکستری رسہ نکل کر نیچے لٹک رہا تھا۔ یہ اس کی بڑی آنت تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ کتا اب اس کی پنڈلیوں کو بھنبھوڑ رہا تھا۔

ڈونا، شیرف کی چیخیں سن کر باہر نکلی تھی۔ پھر اس نے کتے کو اپنی طرف لپکتے دیکھا اور واپس کار میں گھس گئی۔ کتا حسب سابق دیوانگی کے عالم میں دروازے سے سر ٹکرانے لگا، ٹیڈ کی چیخیں جگر پاش تھیں۔ چند لمحے بعد کتا واپس شیرف کی طرف لپکا۔ ڈونا نے سوچا یہی وقت ہے آہنی دروازے پر قسمت آزمانے کا۔ کتا بدقسمت کے جسم سے زندگی کی آخری رمق چھیننے میں مصروف تھا۔ اس نے ٹیڈ کو آنکھیں بند کرنے کی ہدایت کی اور کار کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اور تب اسے اندازہ ہوا کہ کتے کی وحشیانہ ٹکریں بالآخر دروازے کو جام کر چکی ہیں۔ اس نے نہایت تیزی سے ٹیڈ کے ساتھ اپنی جگہ بدلی...... لیکن جب اس نے کوجو کی طرف دیکھا تو وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ شیرف کا بے جان جسم خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو، جسم سے جدا ہو چکا تھا اور کوجو اسے کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال رہا تھا۔ یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ ڈونا نے آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ پھر اسے ٹیڈ کی کراہیں سنائی دیں۔ اس کی حالت ایک بار پھر خراب ہو رہی تھی...... "مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ بلند آواز سے چلا اٹھی۔ باہر نکل کر کتے کے ہاتھوں مارے جانے سے اس کے معصوم بچے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا پھر؟...... پھر اسے انتظار کرنا چاہیے۔ شیرف اس کی تلاش میں یہاں آیا تھا جب وہ واپس نہیں پہنچے گا تو، یقیناً عملے کو فکر لاحق ہوگی۔ پیلا کاغذ کار کے فرش پر پڑا تھا۔ اس نے یہ کاغذ اٹھا کر تھمایا۔ اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں مضبوطی سے اسے تھام لیا۔

وک ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ گھڑی بارہ بجا رہی ہے۔ وہ ایک نہایت گرم دوپہر تھی۔ اس کی قمیض پسینے سے بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ اتنے میں میسن اندر داخل ہوا اس نے بتایا کہ شیرف ٹاؤن روڈ نمبر 3 پر جو کیمبر کی ورکشاپ گیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اس سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ لگتا ہے وہ اپنی گاڑی کے قریب موجود نہیں ہو سکتا ہے کسی اور معاملے میں الجھ گیا ہو سٹیو کیمپ سے پوچھ گچھ جاری تھی۔

وک ست قدموں سے چلتا ہوا اوپر ٹیڈ کے

کمرے میں چلا آیا۔ اس کی اشیاء اسی طرح کمرے میں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر بلا کو بھگانے والے الفاظ دکھائی نہیں دے رہے تھے الماری کا دروازہ آدھ کھلا تھا۔ اور۔۔۔ اوروک نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اندر سے کسی جانور کی بو آرہی ہے۔ یہی بات کئی مرتبہ ڈونا نے بھی کہی تھی۔ وہ الماری کے قریب پہنچا یکبارگی اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ الماری سے اسے خوف آرہا تھا۔ شاید اندر کوئی چیز موجود تھی۔ یہ دو آنکھیں تھیں، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی۔ پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ آنکھیں اس نے کہاں دیکھی تھیں۔۔۔۔ کب دیکھی تھیں۔ تب ایک جھٹکے سے الماری کا دروازہ بند کردیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آرہے تھے۔۔۔۔ یہ آنکھیں ایک کتے کی تھیں کتا خراب کار، جو کی ورکشاپ۔۔۔ ایک دم بہت سی کڑیاں مربوط ہوئیں اوروک کے جسم کا ہر رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار اس آواز پر یقین کیا۔ یہ ٹیڈ کی آواز تھی۔ دور کہیں سے وہ پکار رہا تھا۔ ڈے ڈی۔۔۔ ڈے ڈی۔۔۔ اس کی آواز میں بلا کی بیچارگی تھی۔ وک ایک جھٹکے سے اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا کچھ دیر وہ دروازے پر کھڑا حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا اسے جو کیمبر کی ورکشاپ جانا چاہیے۔۔۔ یا نہیں۔ کہیں وہ یونہی جذباتی فیصلہ تو نہیں کررہا۔ اگر جو کی ورکشاپ پر ڈونا کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو شیرف ضرور واپسی اطلاع دیتا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ اپنی کرائے کی کار میں آبیٹھا اور بڑی سڑک کی طرف چل دیا۔ آخر وہ اس دوراہے پر پہنچ گیا جہاں سے ایک نسبتاً تنگ سڑک ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف جاتی تھی۔ دوسری سڑک اس پولیس اسٹیشن کی طرف جاتی تھی جہاں اسٹیوکیمپ سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اسے کس طرف جانا چاہیے۔ پھر وہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف مڑ گیا۔ شاید اسے پھر الماری سے اٹھنے والی بو یاد آگئی تھی جونہی وہ اس سڑک پر مڑا بالکل اچانک ہی اسے جو کیمبر کے کتے کا نام بھی یاد آگیا۔ اس کا نام کوجو تھا۔

۔۔۔۔ اور یہ فیصلے کا وقت تھا۔ سورج نہار پر تھا۔ دھوپ کی شدت سے کار آگ سے نکلے لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ آج ڈونا اپنی جانب والی کھڑکی بھی نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ٹیڈ والی کھڑکی سے گرمی کے سوا کچھ داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ٹیڈ بے حس وحرکت پڑا تھا۔ ایک مرجھائی ہوئی شاخ کی طرح وہ مر رہا تھا۔ ڈونا جانتی تھی وہ مر رہا ہے اور یہ بھی جانتی تھی اس بند سڑک پر کوئی افسانوی ہیرو اسے اور اس کے بیٹے کو بچانے نہیں آئے گا، کہانیوں کا کوئی شہزادہ گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں نہیں پہنچے گا۔ جو کچھ کرنا ہے اسی کو کرنا ہے۔ جو کچھ بیتنا ہے اس پر اور اس کے بیٹے پر بیتنا ہے۔۔۔ ہاں یہ فیصلے کا وقت تھا۔

اس کی ران کا زخم جل رہا تھا۔ وہ کناروں سے سرخ ہوچکا تھا۔ کبھی کبھی ڈونا کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا جاتی تھی۔۔۔۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ابھی اس پر باؤلے پن کا اثر نہیں ہوا مگر کب تک۔ وہ کسی بھی وقت پاگل ہوسکتی تھی۔ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرسکتی تھی۔ ہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ کچھ ہونے سے پہلے اسے کچھ کرنا تھا۔ اس نے ایک نظر پھر گھاس میں پڑے ہوئے بلے کو دیکھا اور تمام تر قوت جمع کرکے آخری بار کار سے باہر نکل آئی تھی۔

عین اسی وقت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا ٹیلے کی دوسری جانب پہنچا۔ اس نے گرے کے مکان سے باہر لان میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی دیکھیں۔ یہیں اسے جو کیمبر کی ویگن بھی کھڑی دکھائی دی۔ ویگن دیکھ کر اس نے گاڑی روکی اور اندر لپکا۔ جب وہ گیراج میں پہنچا اسے شیشے کا ٹوٹا ہوا دروازہ اور پھر فرش پر خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا یہاں اس نے جو کیمبر اور گرے کی بدبودار لاشیں دیکھیں۔ ان کے زخموں سے صاف نظر ظاہر ہوتا تھا کہ کسی جانور نے انہیں بھنبھوڑا ہے۔ اس کے ذہن میں دیوہیکل کتے کا تصور آیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کوجو کا نام نکل گیا جیسے کسی تصویر کے دو ٹکڑے آپس میں ملنے سے ایک نیا

منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ ایسے ہی وک یہ جان گیا کہ ڈونا اور ٹیڈ کی گمشدگی کوجو کی ہلاکت آفرینی سے وابستہ ہے۔ وہ پلٹا اور دروازے سے نکلتا ہوا کار کی طرف بھاگا۔

۔۔۔۔ دوسری طرف ڈونا گھاس میں سے بیس بال کا بلا اٹھا چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کوجو غرانے کے بعد تیزی سے اس کی طرف لپک رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بلے کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی اور پھر اس کا ازلی دشمن اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ پہلو کی طرف سے حملہ آور ہوا تھا۔ ڈونا نے نہایت تیزی سے بلا گھما کر کوجو کے سر پر مارا۔ وہ چند فٹ پیچھے ہٹا اس کے حلق سے نہایت دھیمی لیکن پر ہول غراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ ڈونا نے بلے پر گرفت اور مضبوط کی اس کے سینے کا زیر و بم نہایت نمایاں تھا۔ گردن سے نیچے قمیض پر خون کے دھبے تھے۔ یہ اس کے لاڈلے بیٹے کا خون تھا۔ اس کے زخمی ہونٹ پونچھ کر ڈونا نے اپنے ہاتھ یہاں صاف کئے تھے۔ اس کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں کوجو اور ڈونا بے حس وحرکت کھڑے تھے۔ جولائی کی چلچلاتی دوپہر میں ایک دوسرے کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ سوائے تین آوازوں کے اور یہ تین آوازیں تھیں کوجو کی دھیمی غراہٹ ڈونا کی ہانپتی سانسیں اور کسی درخت پر بیٹھی چڑیا کی چہچہاہٹ۔

کوجو اپنی بائیں جانب ہٹا۔ ڈونا نے دائیں طرف حرکت کی۔ وہ ایک دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگے۔ وہ دانت کچکچا کر کر بولی۔ آموذی! آگے آ۔۔۔ آگے آ۔ کوجو نے اس کی آواز سن کر جست بھری۔ ڈونا نے نہایت تیزی سے بلا گھما کر اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ نشانہ چوکا، لیکن وار خالی نہیں گیا۔ بلے کا نچلے حصہ پورے زور سے کوجو کی پسلیوں پر پڑا۔ دھپ کی آواز آئی۔ کوجو کے حلق سے چیخ سے مشابہہ آواز نکلی۔ اس نے زمین پر گر کر دو تین پٹخنیاں کھائیں، لیکن فوراً سیدھا ہو گیا اور تب ڈونا۔۔۔ نہایت وحشت کے عالم میں چیختی ہوئی اس پر پل پڑی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا بلا مشینی انداز میں کوجو پر برسنے لگا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں بلا اٹھ رہا تھا۔ گر رہا تھا، پھر اٹھ رہا تھا ڈونا ہانپ رہی تھی چیخ رہی تھی، رو رہی تھی اور ناقابل یقین تیزی سے کوجو کو نشانہ بنا رہی تھی۔۔۔۔ ہاں یہی اس کے بچے کا دشمن تھا۔ اسی نے اس معصوم کو موت کی دہلیز پر پہنچایا تھا۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ طوفانی ضربوں نے کتے کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہر بار پلٹنی کھا کر اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس وقت ایک اور ضرب اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ پرانے بلے کی لکڑی دستے کے قریب سے تڑخ چکی تھی۔ لیکن ڈونا کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ زمین آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ کائنات رنگوں کے بے ڈھنگے رقص کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ بیس بال کا بلا خون آلود ہو چکا تھا۔ یہ کوجو کا خون تھا۔ وہ اب بھی ڈونا کی ضربوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب اس کی حرکت میں تیزی نہیں رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے بلا ٹوٹ گیا۔ دستہ ڈونا کے ہاتھ میں رہ گیا اور اس کا بھاری حصہ زوردار آواز سے جا ٹکرایا۔ کوجو قریب تھا لیکن اس کے چہرے پر ڈونا کو اب بھی آسیبی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی قسم کھا رہی تھیں کہ ڈونا کو چھوڑے گا اور نہ اس کے بچے کو۔ ڈونا کے ہاتھ میں اب ٹوٹے ہوئے بلے کا قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا نوکیلا ٹکڑا تھا۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلائی۔ آموذی آ کھڑا کیوں ہے۔ مار مجھے اس کی چیخ سن کر 200 پونڈ وزنی کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک سرخ گیند کی طرح اس پر جھپٹا۔ ڈونا نے لکڑی کے نوکیلے ٹکڑے کو ایک بڑے خنجر کی طرح استعمال کیا۔ ڈیڑھ فٹ لمبا ٹکڑا ایک فٹ تک کوجو کے پیٹ میں گھس گیا۔

لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔۔۔۔ اس کے پنجے ڈونا کے برہنہ شانوں پر تھے اور تھوتھنی اس کی گردن سے ایک انچ کے فاصلے پر۔۔۔ اور یہ فاصلہ مزید کم ہو رہا تھا۔ کوجو ایک ایسے طاقتور انجن کی طرح تھا جس کا ایندھن ختم ہو رہا تھا لیکن وہ اب بھی پوری گھن گرج سے اسٹارٹ تھا اور پھر

ڈونا نے لکڑی کا ٹکڑا اس کے پیٹ سے کھینچا۔ ایک آخری چیخ اس کے ہونٹوں سے نکلی خوفزدہ جھلائی ہوئی اور پر غضب چیخ۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا پیچھے ہٹا اور دوسری بار اس کے پیٹ میں پیوست ہوگیا یکبارگی کوجو کی گرفت ڈونا کے کندھوں پر ڈھیلی پڑگئی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھے اور وہ سیاہ سڑک پر زور سے لرز کر ساکت ہوگیا۔ اس کی تھوتھنی سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں۔ بھاری بھرکم طویل دم ساکت پڑی تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں جولائی کے گرم آسمان کو گھور رہی تھیں۔۔۔ وہ مر چکا تھا۔ ڈونا تیزی سے بیس بال کے بلے کی طرف لپکی۔ اس نے بلا اٹھایا اور دیوانگی کے عالم میں مردہ کتے کو مارنے لگی۔ اس کی ہر ضرب پہلے سے شدید تھی۔ وہ پھٹی ہوئی آواز میں چیخ رہی تھی اور یہ چیخیں۔۔۔ کوجو کی آخری چیخوں سے ملتی جلتی تھیں۔

پھر وہ چونک کر کار کی طرف بھاگی۔ اس کا بیٹا ابھی زندہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ ناکام ہوئی۔ دروازہ پھر جام ہو چکا تھا۔ تمام دروازے مقفل تھے۔ اس نے بہت زور آزمائی کی، لیکن دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ پھر اس کی نگاہ بلے پر پڑی۔ اس نے بلا اٹھایا اور کار کی عقبی اسکرین پر دے مارا لیکن اسکرین نہیں ٹوٹی۔ اس نے پولیس کار کے پاس ایک سیاہ چیز پڑی دیکھی یہ مردہ شیرف کا پستول تھا۔ اس نے لپک کر پستول پکڑ لیا تب وہ بھاگتی ہوئی آئی اور پورے زور سے پستول والا ہاتھ عقبی اسکرین پر مارا۔ وہ ایک بے چین ماں کی ضرب تھی۔ شیشہ برداشت نہ کرسکا اور وہ چکنا چور ہوگیا۔ ڈونا کی کلائی سے خون کا فوارہ ابل پڑا، لیکن اسے کچھ پرواہ نہیں تھی۔ اس نے لپک کر ٹیڈ کو تھاما اور باہر کھینچ لیا یہی وہ وقت تھا جب وک کی کار تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھی۔ بریک چرچرائے گاڑی رکی اور وک بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا ڈونا۔۔۔ ڈونا اس نے ٹیڈ کو اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا "ٹیڈ۔۔۔۔ ٹیڈ" وہ اسے زور زور سے ہلا رہا تھا۔ ٹیڈ کا چہرہ خوفناک حد تک زرد تھا۔ اس میں ٹیڈ کے سینے سے کان لگائے ڈونا نے دیکھا وک کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔۔۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں، ڈونا! اسے مرے کتنی دیر ہوگئی؟"

وک کی آواز ڈونا کے کانوں میں جیسے سیسہ پگھلا گئی۔ "کیا کہہ...... کہہ رہے ہو تم؟" وہ سینے کی پوری قوت سے چلائی لیکن اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل وک تک پہنچ سکی، پھر وہ جھپٹی اور ٹیڈ کو اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ٹیڈ! میرے بچے "آنکھیں کھولو"۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں چلا رہی تھی۔ پھر وہ اسے دیوار کے سائے میں گھاس پر لٹا کر مصنوعی سانس دینے لگی، اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں سے ملا کر اپنی سانس اس کے پھیپھڑوں میں داخل کرنے لگی۔

تب پولیس اہلکاروں کے سائرن گونجے، ایک ایمبولینس سے دو ڈاکٹر نکلے انہوں نے ٹیڈ کو ڈونا سے لینا چاہا لیکن ڈونا نے انہیں پیچھے دھکا دے دیا۔ ڈاکٹروں نے دوبارہ کوشش کی دفعتاً ڈونا کے سفید دانت دکھائی دینے لگے وہ عجیب انداز میں غرائی اور ڈاکٹروں پر جھپٹی۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ ہر شخص کے چہرے پر دہشت کے آثار نظر آنے لگے۔۔۔ ڈونا باؤلی ہوچکی تھی۔ وہ خوفناک انداز میں غرائی۔ پولیس والوں پر جھپٹی۔ دو سپاہیوں نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر ایک سپاہی کو کاٹ کھایا۔ دوسرا سپاہی الٹے قدموں پیچھے ہٹا، ڈونا چلاتی ہوئی اس کی طرف لپکی ایک سارجنٹ نے پھرتی سے ریوالور نکالا۔ اس وقت وک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بھاگ کر سارجنٹ پر چھلانگ لگادی۔ دونوں اوپر تلے گرے۔ وک نے سارجنٹ کا ریوالور والا ہاتھ تھام لیا۔ "خدا کے لئے سارجنٹ" وہ پرنم آنکھوں سے بولا۔ "میرا بچہ تو چلا گیا لیکن بیوی ابھی زندہ ہے تم اپنا ہاتھ روکو۔ میں اسے روکنے کی کوشش کرتا ہوں"۔

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وک نے دیکھا ڈونا پھر ٹیڈ کے بے جان جسم کے پاس بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی مرغی چوزے کو پروں میں چھپاتی ہے، ایسے ہی

اس نے ٹیڈ پر اپنے جسم کا سایہ کر رکھا تھا۔ وک قریب پہنچا تو ایک بار پھر اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔ وہ کچھ بول بھی رہی تھی۔ لیکن الفاظ کے بجائے حلق سے صرف دھیمی سی غراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ وک سمجھ گیا کہ اسے سمجھانا فضول ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے، وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ دفعتاً وک نے چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکٹر اور پولیس والے بھاگے۔ کسی نے ہاتھ پکڑے کسی نے پاؤں۔ ڈاکٹروں نے انجکشن لگانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ سرنج ٹوٹ گئی۔ تیسری کوشش میں ڈاکٹر انجکشن لگانے میں کامیاب ہوسکا۔

شیرف بارنمین اور کوجو کی لاشیں ابھی زمین پر پڑی تھیں۔ دونوں لاشوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ٹیڈ کی لاش بھی زمین پر تھی۔ ایک اردلی برہنہ لاشوں پر چادریں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ جس وقت اس نے ٹیڈ پر چادر ڈالی، ڈونا کو ایمبولنس میں چڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ٹیڈ کے چہرے پر چادر دیکھ کر ایک بار پھر زور سے مچلی اور آزاد ہوگئی۔ وہ تیر کی طرح بیس بال کے بلے کی طرف لپکی، بلا تھام کر وہ کتے کی طرف آئی اور ایک بار پھر اس کے مردہ جسم پر ضربیں لگانے لگی۔ مکھیاں اڑ اڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ کتے کا جسم ضربوں سے اچھلنے لگا۔ وک نے اسے روکنے کے لئے آگے بڑھنا چاہا لیکن ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چند لمحے بعد وہ لہراتی ہوئی زمین بوس ہوگئی۔۔۔۔ انجکشن کا اثر ہو چکا تھا۔

وک ست قدموں سے اٹھا اور ''روجر'' کو ٹیلیفون کرنے کے لئے آہنی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے لٹو گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ یہی دروازہ تھا جس کے بارے میں ڈونا تین دن سوچتی رہی تھی۔ جب وہ ''روجر'' کو نمبر ملا رہا تھا اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سٹوکیمپ پر اندھا دھند شک نہ کرتا اور اپنے رقیبانہ احساسات سے ہٹ کر سوچتا تو شاید اس کا دھیان خراب کار کی طرف چلا جاتا اور وہ یہاں پہنچ کر اپنے بچے اور بیوی کو بچا لیتا۔۔۔۔ شاید۔

وہ اگست کی ایک اداس شام تھی وک نے پورچ میں کار روکی اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے خود ہی دروازہ کھولا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔۔۔۔ ڈونا ایک آرام کرسی پر بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی، وک کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھیکے انداز میں مسکرادی۔ اسپتال میں کوئی ڈیڑھ مہینہ گزارنے کے بعد وہ دو روز پہلے ہی واپس آئی تھی۔ اب وہ پوری طرح صحت مند تھی لیکن دل کے زخموں کو بھرتے تو کچھ دن لگنا تھے۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ ''وک! کیا اس گھر میں ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟''

وک جانتا تھا ڈونا کے سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں اس نے پوچھا تھا۔ ''کیا ہم ٹیڈ کے بغیر اس گھر میں رہ سکیں گے؟'' دوسرا سوال یہ تھا۔ ''کیا ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟'' یہ دوسرا سوال ان کے گھریلو جھگڑے اور اسٹوکیمپ کے معاملے کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

اسٹوکیمپ سے پوچھ گچھ کے دوران پولیس نے اس کی ویگن کی مکمل تلاشی لی تھی۔ غیر متوقع طور پر ویگن کے خفیہ خانوں سے منشیات برآمد ہوئی تھی۔ منشیات رکھنے اور کسی کی املاک کو نقصان پہنچانے کے جرم میں اسے چار سال قید کی سزا ہوئی تھی۔۔۔۔ بہت دن ہوئے وک نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ ڈونا جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دنیا کا سب سے قیمتی پانی چمک رہا تھا۔ وک نے جھک کر اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ یہی اس کے دوسرے سوال کا مفصل جواب تھا۔ اس نے کہا ''ڈونا ہم سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں اور ہمیں ان کی سزا بھی ملی ہے۔ اب ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔'' پھر اس نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بالکونی میں لٹکتے ہوئے جھولے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''دیکھو ڈونا! ٹیڈ کا جھولا خالی ہے، ہمیں اس جھولے کو اتارنا نہیں۔''



ماں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع کیا اور اسے اسپتال لے گئی مگر اس کے جسم میں کسی سوئی کا نام ونشان تک نہ ملا۔ اس عورت کو بھی اپنے کئے کی سزا مل گئی۔

کہتے ہیں ناں جب گناہ حد سے زیادہ ہو جائیں تو پھر اس کی سزا سامنے آ جاتی ہے۔ اور ایسا ہی جبار کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ شاید بھول گیا تھا کہ جس پروردگار نے اس کی رسی ڈھیلی کی ہے۔ جب وہ کھینچے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔

جبار آدھی رات کے بعد مرگھٹ سے واپس آ رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا کہ اچانک جانے کہاں سے ایک فقیر اس کی گاڑی کے آگے چلنے لگا۔ اس نے ہارن پر ہارن دیتا رہا کہ وہ ہٹ جائے مگر وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ جھنجلا کر وہ گاڑی سے باہر آیا اور بولا۔ ''ایک طرف ہو، مجھے جانا ہے۔''

''سڑک کیا تیرے باپ کی ہے؟'' فقیر نے حقارت سے کہا۔

''اے بڈھے ہوش کے ناخن لے اور زبان سنبھال! مجھے تو جانا نہیں ہے۔'' جبار نے غصے سے کہا۔

''تجھے! جانتا ہوں۔ ناپاک، اور غلاظت کھایا ہوا، تیری حقیقت کیا ہے؟ میرے سامنے۔'' فقیر نے اطمینان سے کہا۔

''بکواس بند کر ابھی مجھے جلدی ہے ورنہ تجھے مزا چکھا دیتا۔'' جبار بولا۔

''روکا کس نے ہے؟'' فقیر بے خوفی سے بولا۔

''ٹھہر!'' اور پھر جبار کے ہونٹ ہلنا شروع ہو گئے۔ مگر وہ چونک کر رک گیا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر دوبارہ کوشش کی مگر اسے کوئی لفظ بھی یاد نہ آیا۔

''کر لی کوشش؟'' فقیر یہ کہتا ہوا اسے گھور کر دیکھا تو جبار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اتنا جلال تھا اس فقیر کے چہرے پر ''تجھ جیسے ایمان سے خارج کی کیا اوقات جو ایک مسلمان کا مقابلہ کرے۔ بدنصیب تو نے اپنا ایمان خود خراب کیا ہے۔ بدنصیب تو اسی وقت سے ہو گیا تھا جس روز تو نے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ پھر تو نے گند کھا کر اپنا ایمان کھویا اور اسی پر بس نہیں تو نے کتنے گناہ کئے، کتنے لوگوں کی زندگیاں برباد کیں۔ تیری رسی ڈھیلی تھی کہ شاید تو اپنے گناہوں سے توبہ کر لے مگر تو نے توبہ کا سارا وقت گنوا دیا، تیرا وقت اب ختم۔'' یہ کہہ کر فقیر نے جبار کے منہ پر تھوک دیا۔

جبار کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے اس کے منہ پر تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اتنی جلن اس کے چہرے پر ہو رہی تھی کہ وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس نے اپنا منہ صاف کرنے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ اٹھانا چاہا تو اس کا ہاتھ مفلوج تھا۔ اس نے فقیر کی طرف دیکھا مگر وہاں کسی کا نام ونشان نہ تھا اور فضا میں اذان فجر کی آواز گونجنے لگی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بگڑنے لگی۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے زخم ہو رہے تھے۔ اور ان زخموں میں بے پناہ تکلیف ہونے لگی تھی۔ اور خاص طور سے جب دھوپ تیز ہوتی تو اس کی تکلیف میں شدید اضافہ ہو جاتا جس کی وجہ سے وہ تڑپنے لگتا اور چیخنے لگتا۔

بس آسمان کی طرف منہ اٹھائے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔ اور پھر ایک دن وہ سڑک کے کنارے مردہ پایا گیا۔

ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم اللہ کے محتاج ہیں۔ اللہ ہی ہمارا مالک ہے۔ وہ ہمیں دینے والا۔ جبار جیسے لوگوں کے پاس جا کر کیوں اپنا آپ خراب کریں۔ جو چیز انسان کے نصیب میں نہیں ہو وہ اسے کیسے مل سکتی ہے۔ جو مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگیں وہ ہماری جائز خواہشات ضرور پوری کرے گا اور کسی دوسرے کا برا چاہنا یہ کون سی اچھی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب چیزوں سے بچائے (آمین)





خوفناک وکٹوریہ

ایس امتیاز احمد-کراچی

کوچوان سمیت وکٹوریہ میں تین آدمی بے حس و حرکت بیٹھے تھے ان کے چہرے سفید لٹھے کی طرح نظر آرہے تھے، ان میں زندگی کی رمق باقی نہیں تھی، لیکن پھر اچانک ایک دل دہلانے والا منظر رونما ہوا.

پراسراریت کے لبادے میں لپٹا ہوا ایک عجیب وغریب اور دہشت ناک شاخسانہ

جو حالات میں آپ کے سامنے بیان کرنے لگا ہوں ان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ حقیقت پرمبنی ہیں۔ یہ واردات خود مجھ پر گزری ہے۔ اور اس کی جزئیات میرے ذہن میں آج بھی ایسے ہی تازہ ہیں جیسے کل کی بات ہو حالانکہ اس واقعہ کو پورے بیس سال بیت چکے ہیں۔ ان بیس سالوں کے طویل عرصے میں، میں نے صرف ایک آدمی کو اپنی یہ سچی آپ بیتی سنائی تھی۔ کیونکہ اسے بیان کرتے ہوئے ایک سنسنی میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور رواں رواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے فقط اتنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی نتائج اخذ کریں اپنے تک ہی رکھیں انہیں مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش ہرگز نہ کیجئے گا، میں کوئی توضیح یا تشریح سننے کے لئے تیار نہیں، نہ مجھے دلیلیں قائل کرسکتی ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں میرا ذہن قطعی صاف ہے، اپنے

حواس کی درستگی پر بھی یقین ہے اور جو فیصلہ میں کر چکا ہوں اس پر قائم رہوں گا۔

ہاں تو سنئے! ٹھیک بیس سال پہلے کی بات ہے۔ گراؤس (یورپی پرندہ) کے شکار کا موسم ختم ہونے میں صرف تین چار دن باقی تھے۔ میں اپنی بندوق لئے سارا دن شکار کی تلاش میں پھرتا رہا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ مشرق سے آندھی آنے کا امکان تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور مقام انگلستان کے انتہائی شمال میں وہ وسیع علاقہ تھا جو بالکل اجاڑ اور بنجر ہے۔ سفید سفید پروں کی مانند برف کے نرم گالے گرنے لگے تھے۔ جو ببول جیسی "ہیدز" کی جھاڑیوں میں پھولوں کی طرح اٹکتے جا رہے تھے۔ یہ برف باری کسی شدید طوفان کی آمد کا اعلان تھی۔ دھند نے شام سے پہلے ہی ملگجا دھندلکا چاروں طرف پھیلا دیا تھا اور اس دھند میں گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ سماں، وہ ماحول اور یک و تنہا راہ گم کردہ انسان! تصور کیجئے میری کیا حالت ہوگی۔ ایک اضطراب اور پریشانی کے عالم میں آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجا سا بنائے راہ تلاش کرنے کی کوشش اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ اودے رنگ کے کلرز زمین پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے کی طرح ابھرے ہوئے تھے جن کا سلسلہ تقریباً دس بارہ میل تک چلا گیا تھا۔ نہ کہیں دھوئیں کی رمق نہ کہیں کھیتی باڑی کا نشان، نہ آدم نہ آدم زاد، ہر طرف ہو کا عالم اور سنسان بیابان۔ بار بار ارد گرد دیکھتا تھا کہ کہیں کوئی پناہ لینے کی جگہ نظر آئے مگر توبہ کیجئے اس کا گمان بھی عبث تھا۔

میں صبح ناشتہ کرتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا اور اب تک ایک دانہ بھی منہ میں نہیں پڑا تھا۔ بھوک، پیاس، تھکان اور گھبراہٹ نے مجھے بالکل نڈھال کر دیا تھا مگر ضعف و نقاہت کے باوجود، میں بندوق کندھے پر رکھے بوجھل قدموں سے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

شاید قدرت کو میری قوت برداشت اور صبر کا امتحان منظور تھا کہ موسم کی شدت میں اضافہ کرنے کے لئے حوصلہ شکن تیزی سے برف باری ہونے لگی۔ سردی ناقابل برداشت ہوگئی اور رات سر پر آگئی۔ میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ تاریک آسمان کی طرح مستقبل بھی سیاہ معلوم ہونے لگا تھا۔ کہیں امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ مجھے پکا یقین ہوگیا کہ میں صحرائے موت میں آگیا ہوں۔ اب بچ نکلنا ممکن نہیں۔

اس روح فرسا خیال کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کی معصوم صورت آگئی۔ دل اور بھی بوجھل ہوگیا۔ وہ بہت بھولی بھالی تھی کیونکہ فقط چار مہینے تو ابھی ہماری شادی کو ہوئے تھے۔ ہمارے سینے ارمانوں سے بھرے تھے اور اتنی جلدی دائمی قیامت سے کم نہ تھی۔ صبح جب میں گھر سے نکلا تھا تو اس نے بڑے محبت بھرے انداز میں مجھ سے جلدی لوٹ آنے کا تقاضا کیا تھا۔ اور میں نے اسے پکا یقین دلایا تھا کہ رات ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔ میں سوچنے لگا اس بے چاری کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ اس کے دل میں کیسے کیسے وسوسے پیدا ہو رہے ہوں گے۔ وہ اس رینگتی ہوئی رات میں نہ جانے کب تک کھڑی میری راہ تکتی رہے گی۔ اس کا نازک دل اکیلے میں ہول رہا ہوگا۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب ہم نے موسم خزاں اس پہاڑی علاقے میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔

آہ! اب میں یہاں میلوں تک پھیلی ہوئی تاریک دسنسان وسعتوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اور وہ بدنصیب ایک دور افتادہ گاؤں کی بے رونق سرائے میں میری واپسی کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ اپنی رفیق حیات کا خیال ہی وہ قوت بخش تصور تھا جس کے سہارے تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود اس امید میں آگے بڑھ رہا تھا کہ شاید ایسا ٹھکانہ مل جائے جہاں تھوڑا بہت کھانا اور چند لمحے کا آرام میسر آجائے۔ پھر تو میں آدھی رات سے پہلے پہلے اپنی فکر مند بیوی کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ کاش! کوئی راستہ بتانے والا ہی مل جاتا۔ مگر کوئی امید بر نہیں آ رہی تھی۔

رات گہری اور ڈراؤنی ہوتی گئی، برف باری مسلسل ہوتی رہی اور میں انجانے راستوں پر چلا جا رہا تھا۔ بار ہا میرا دل گھبرا جاتا، دہشت طاری ہونے لگتی اور

میں بے اختیار مدد کے لئے زور زور سے پکار اٹھتا مگر کہیں سے کوئی جواب آنے کے بجائے میری ہی آواز رات کے سناٹے میں دیر تک گونجتی رہتی اور ماحول کو مزید ڈراؤنا بنا جاتی۔ آخر یہ تکلیف دہ اور اذیت ناک احساس پیدا ہونے لگا کہ اس بھیانک کالی رات میں چلتے چلتے میں موت کی تاریک وادی میں اتر جاؤں گا۔

مجھے ان راہ گم کردہ مسافروں کی الم ناک داستانیں یاد آ گئیں جو اسی طرح برف باری میں جائے پناہ نہ پا کر برف پر گرے اور موت نے انہیں اپنی آغوش میں چھپالیا۔ میں نے خود سے سوال کیا ''تم آخر کب تک چلتے رہو گے؟ وہ لمحہ قریب ہے جب اعضاء چلنے سے جواب دے جائیں، قوت برداشت سلب ہو جائے اور عزم و استقلال ساتھ چھوڑ دیں۔ اس وقت موت کا بھوکا عفریت تمہیں دبوچ لے گا۔ تم چپ چاپ اس کا نوالہ بن جاؤ گے'' ان بھیانک خیالات کی یورش سے بچنے کے لئے میں پھر زور زور سے چلانے لگا۔ میری آواز ویسی ہی دردناک تھی جو ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کے حلق سے نکلتی ہے۔

ایک لمبی ہانک لگا کر میں غور سے سننے لگا کہ کسی طرف سے کوئی جواب آتا ہے یا نہیں اور میرا دل دھڑک اٹھا جب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں دور بہت دور سے کسی نے میری پکار کا جواب دیا ہے۔ نہ جانے وہ فریب سماعت تھا یا میری ہی صدائے بازگشت، واقعی اس صحرائے بے کراں میں کوئی دوسرا متنفس بھی موجود ہے؟ میں نے حقیقت کی جستجو میں پے در پے صدائیں بلند کرنا شروع کر دیں۔ اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب اتھاہ تاریکی میں حد نظر پر مدھم سی روشنی کا ایک ننھا سا ہالہ ابھرتا ڈوبتا دکھائی دیا۔ میں اپنی پوری قوت سے اس روشنی کی طرف دوڑا جو دھیرے دھیرے قریب تر اور روشن تر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میں ایک بوڑھے آدمی کے سامنے جا کھڑا ہوا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ سب سے پہلا فقرہ جو بے اختیار میرے منہ سے نکلا وہ یہ تھا۔ ''شکر ہے خدا کا!''

بوڑھے نے لالٹین اوپر اٹھائی، تیوری چڑھائے آنکھیں بچ مچاتے ہوئے میری صورت دیکھی اور جلے بھنے لہجے میں غرا کر بولا۔ ''کس بات کا شکر کر رہے ہو؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''تمہارے ملنے کا بابا، میں اس خیال سے ڈرنے لگا تھا کہ کہیں برف میں دفن ہو کر ہی نہ رہ جاؤں۔''

''کیا حرج تھا؟ یہاں تو آئے دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ مٹی کے ڈھیلوں کی طرح برف میں دبے رہتے ہیں۔ اگر قدرت نے تمہارے مقدر میں بھی اسی طرح مرنا لکھ دیا ہے تو کون روک سکتا ہے۔ کیا کہتے ہو؟''

مجھے بوڑھے کی اس بے رخی اور شق القلبی پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ تاہم میں نے زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''محترم! اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو اب ہم دونوں ہی برف میں دب کر مریں گے۔ مجھے قدرت کے فیصلے سے انکار نہیں مگر تمہارے بغیر ہرگز نہیں مروں گا۔ اچھا یہ تو بتاؤ! یہاں سے ڈولڈنگ کتنی دور ہوگا؟''

''بھلے سے بیس میل ہوگا کچھ کم یا زیادہ!''......

''اور نزدیک ترین گاؤں کتنے فاصلے پر ہے؟''

''سب سے پاس والا گاؤں وانیک ہے۔ اور وہ دوسری طرف بارہ میل دور ہے۔''

میں اس کے جواب پر حیرت زدہ تھا۔ پھر پوچھا۔ ''بابا ادھر بیس میل پر آبادی ہے اور ادھر بارہ میل سے پہلے کہیں آبادی کا نشان تک نہیں پھر تم کہاں رہتے ہو؟''

اس نے لالٹین والے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر...... پیچھے!''

میں بوڑھے کے سر ہو گیا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وہ میرے اصرار پر برہم ہو کر ساتھ چلنے سے منع کرتا، اور بڑبڑاتا رہا کہ ''میں تمہیں اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔'' بوڑھا سخت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہت بے مروت اور دل جلا۔ وہ نفی میں سر ہلاتا بالشتیے کی طرح پھدکتا رہا اور میں سائے کی طرح ساتھ لگا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ایک مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ بوڑھے نے تالے میں چابی گھمائی اور میں نے لالٹین کی دھندلی

سی روشنی میں دیکھا کہ وہ دروازہ کسی قلعے کے دروازے کی مانند مضبوط تھا۔ چوبی دروازے پر آہنی میخیں ترتیب سے جڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، میں بوڑھے کو دھکیل کر اس سے پہلے اندر داخل ہوگیا۔

میں نے خود کو ایک وسیع ہال میں پایا جس کی چھت شکستہ ہو کر جھک آئی تھی۔ وہ بڑا کمرہ حیرت انگیز حد تک خستہ اور گندہ تھا۔ اور رہائشی استعمال سے زیادہ گودام دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں چھت تک اناج کا ڈھیر لگا تھا، دوسری طرف اوپر تلے آٹے کی بوریاں تھیں۔ ادھر ادھر زراعتی آلات، لکڑی کے ڈول، ٹوٹے پھوٹے اوزار اور دیگر کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ کڑیوں سے سوکھے گوشت کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے قطار در قطار ٹنگے تھے۔ عین وسط میں کوئی عجیب سی چیز ایک میل خوردہ پھٹی پرانی چادر میں لپٹی رکھی تھی۔ میں حیرت اور تجسس پر قابو نہ پاسکا اور چادر کا کونا اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑی دوربین تھی جس کے شیشے کا قطر بلا مبالغہ پانچ انچ تھا۔ میں ایک ایک چیز پر حیرت زدہ تھا کہ اچانک بہت زور سے گھنٹی بجی، بوڑھا گھنٹی کی آواز سن کر عجیب انداز میں مسکرایا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ کی طلبی ہورہی ہے جناب، ادھر ان کا کمرہ ہے۔''

اس نے ہال کے سامنے والی دیوار میں ایک سیاہ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں جان بوجھ کر زور زور سے قدم رکھتا ہوا ادھر بڑھا۔ اور اجازت لئے بغیر اندر جا پہنچا۔ نیم تاریک کمرے میں ایک بوڑھا جس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا اور سفید بالوں سے بھرا ہوا تھا میز کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کتابوں اور کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی غیر مصالحانہ انداز میں کرسی سے اٹھا اور کرخت لہجے میں جھڑک کر پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟ یہاں کیسے آئے؟ آپ چاہتے کیا ہیں؟''

میں نے بھی تیزی سے ترکی بہ ترکی ہر سوال کا مختصر جواب دیا۔ ''جیمز مرے، بیرسٹر ایٹ لاء بنجر علاقے میں پیدل چلتے چلتے کھانا، شراب اور آرام!''

اس کی بھنویں سکڑ گئیں، برہمی اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر میرا گھر کوئی سرائے نہیں ہے۔''

پھر بڑے غضب ناک انداز میں گرج کر بوڑھے کو ڈانٹا۔ ''جیک! تم نے انہیں اندر کیسے آنے دیا؟''

وہ بوڑھا لجاجت سے بولا۔ ''نہیں جناب! میں نے بہت منع کیا مگر یہ مجھے دھکا دے کر زبردستی مجھ سے پہلے گھر میں گھس آئے۔ میں اتنے لمبے چوڑے ساڑھے چھ فٹ کے آدمی کا مقابلہ تو نہیں کرسکتا سرکار!''

وہ غصے میں پھنکارا۔ ''اب فرمایئے جناب! میرے گھر میں زبردستی گھسنے کا آپ کو کیا حق ہے؟''

''وہی جس کے تحت ڈوبنے کی حالت میں آپ کی کشتی میں سوار ہوسکتا تھا۔ حفاظت خود اختیاری کا حق!''

''کیا معنی؟ حفاظت خود اختیاری کا کیسا حق؟''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''زمین پر ایک انچ برف جم چکی ہے۔ صبح تک اتنی گہری ہوجائے گی کہ جس میں میرا وجود چھپ جائے۔''

وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا پردہ ہٹا کر دیکھا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سچ کہتے ہو، اگر پسند کرو تو رات بسر کرسکتے ہو جیک کھانا لاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے مجھے شانوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خود اپنی کرسی سنبھال کر پہلے کی طرح مطالعہ میں پورے انہماک سے مصروف ہوگیا۔

میں نے بندوق کونے میں رکھ کر کرسی آتش دان کے قریب کھینچ لی۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کمرہ بھی انہی اشیاء سے بھرا ہوا تھا جو میرے لئے عجیب اور باعث حیرت تھیں۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور بدنما نقشے سے بن گئے تھے۔ الماریوں میں موٹی موٹی پرانی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ انگیٹھی پر نظام شمسی کا ایک نمونہ رکھا تھا۔ ارضیاتی نمونے، عمل جراحی کا پورا سامان، کٹھالیاں، قرنبیق، بلوریں پیالے اور ایک خوردبین رکھی تھی۔ ہر طرف کتابوں کا ایک ڈھیر لگا تھا کرسیوں پر بھی کتابیں رکھی تھیں۔ فرش پر نقشے، زائچے، کاغذات، چربے اور لکھنے پڑھنے کی ہر وہ چیز

جس کا تصور کیا جاسکتا ہے بکھری پڑی تھیں۔

ہر چیز حیرت انگیز اور انوکھی تھی۔ بار بار میری نظر میزبان سے کمرے کے آخری سرے تک اور پھر لوٹتی ہوئی میزبان پر آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ میں ماحول سے متاثر ہو کر اس الجھن میں مبتلا تھا کہ اس اجاڑ وسنسان میلوں تک پھیلے ہوئے بنجر علاقے میں رہنے والا یہ شخص کون ہے؟ اس کا سفید الجھے بالوں والا بڑا سر جو کنپٹیوں کے رخ زیادہ چوڑا تھا، بڑا پرکشش تھا اور لوشیں دان بیتھوون سے مشابہ تھا۔ اس کی انہماک اور محویت بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ ابھی میں مشاہدے میں گم تھا کہ جیک کھانا لے کر آ گیا۔ اس کے آقا نے زیر مطالعہ کتاب بند کی، اٹھا اور خندہ پیشانی سے مجھے دسترخوان پر آنے کی دعوت دی۔ دسترخوان پر گوشت، انڈے، خستہ روٹی اور سرور بخش شراب کی بوتل تھی۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”جناب! ہر شے گھر کی ہے۔ اس ماحضر سے اشتہا تو کیا بجھے گی البتہ امید ہے نقاہت اور کمزوری کسی حد تک دور ہو جائے گی۔“

اس نے صرف ایک پیالہ دلیہ، گلاس دودھ لیا، جو خاص طور پر اس کے لئے تھا۔ میں نے کھانے کی بہت تعریف کی جس کا اس نے شکریہ ادا کیا۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر میرے ساتھ ہی آتش دان کے پاس آ بیٹھا۔ پھر اچانک بولا۔ ”جناب میں گزشتہ تیس سال سے اسی جگہ مکمل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ چار سال پہلے ایک آدمی یہاں پہنچ گیا تھا، یا آج آپ نے اس دہلیز کے اندر قدم رکھا ہے۔ آپ کی دنیا سے قطعی لاتعلق ہو چکا ہوں۔ لہٰذا اگر آپ مجھے کچھ معلومات بہم پہنچائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔“

میں اس غیر متوقع سوال پر قدرے بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”میں اپنی بساط بھر جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے بڑے عجیب عجیب سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جن کا تعلق سائنسی ایجادات اور ان کی انسانی زندگی پر اثرات سے تھا۔ میں سائنس کا طالب علم نہیں تھا اور ان باتوں سے تقریباً نابلد تھا۔ اس لئے تسلی بخش جوابات نہ دے سکا۔ جب اس نے یہ سلسلہ بند کیا تو میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ لیکن اب اس نے میری فراہم کردہ معلومات پر بحث کے انداز میں اپنے استنباطی خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اس کی کہنیاں گھٹنوں پر رکھی تھیں، ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکا ہوا تھا اور نگاہیں آگ پر گڑی تھیں۔ وہ بولتا رہا اور میں سحرزدہ معمول کی طرح بے حس وحرکت بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ تقریر میں اتنا ڈوب گیا کہ میری موجودگی کا بھی احساس نہ رہا اور جیسے تصور میں کسی عظیم مجمع کے سامنے تقریر کرتا رہا۔ ایسی فصیح وبلیغ، شستہ ورواں اور مدلل عالمانہ تقریر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اور نہ اس کے بعد آج تک کہیں ایسی تقریر سنی ہے۔ عملی سائنس سے لے کر ذہنی نظریات تک خارجی کائنات سے لے کر ہیئت ارضی تک، مادہ سے روح اور حیات انسانی سے مابعد الموت تک، ہر موضوع پر وہ ایسی فلسفیانہ، دقیق اور مفصل گفتگو کرتا رہا جیسے خواب کی حالت میں بول رہا ہو اور خیالات اسے چلا رہے ہیں۔ برقی قوت سے اعصابی قوت، واٹس میں میس مر، ریشن ہاک سے سویڈن برگ، پپی نوزا، کونڈی لاک، ڈیس کارٹس، برکلے، ارسطو، افلاطون اور مانی اور دیگر مشرقی صوفیا تک ہر ایک کی ذات اور ان کی تعلیمات پر اس نے علمی ومحققانہ انداز میں روشنی ڈالی۔

رفتہ رفتہ اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی گئی اور آخر میں اس نے کہا۔ ”دنیا کی نظر میں ہر وہ بات غیر یقینی اور واہمہ ہے جو عام انسانوں کی محدود عقل پر پوری نہ اترتی ہو دائرہ علم سے ماوراء ہو۔ ہر وہ شے جو ان کے چیر پھاڑ کے کمرہ میں زیر تجربہ نہ لائی جاسکے محض فریب اور ناقابل قبول ہے۔ سائنس دان جن، بھوت، بدروحوں کے وجود اور مافوق الفطرت مظاہر کے منکر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علم طبیعیات، علم تاریخ اور علم آثار قدیمہ کسی سلسلے میں بھی اتنی متنوع اور بے شمار شہادتیں نہیں ملتیں جتنی اس موضوع کے بارے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ آخر یہ کیسی توہم پرستی ہے جس کا دنیا بھر کے سائنس دان آج تک تدارک نہیں کر سکے؟ کیا وجہ ہے کہ اتنی ہمہ گیر، وسیع اور قرن ہا قرن سے جاری تحریک تو ہم

پرستی کا قلع قمع نہیں کر سکی؟ آج بھی عہد پارینہ کی طرح دانائے حکمت ودانش اور متین وثقہ بزرگ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے، کسی نسل اور کسی زبان سے تعلق رکھتے ہوں ان مافوق الفطرت مظاہر کی تصدیق کرتے ہیں۔ چوں کہ میں بھی پہلے آنکھوں دیکھی پر یقین لانے کا قائل تھا اس لئے محض سچائی معلوم کرنے کی خاطر میں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ تحقیق کی، یقین دلایا اور پوری جرات ودیانت کے ساتھ اپنی اٹل معلومات جو زندگی کا بہترین زمانہ تحقیق وتدقیق صرف کر کے حاصل کی تھیں۔ اور جن کے حصول میں بے حد دکھ، تکالیف اور مصاحب جھیلے تھے دنیا کے سامنے پیش کیں تو مجھے جھوٹا اور احمق قرار دیا گیا۔ سائنس دانوں نے میرا مذاق اڑایا۔ حق پرستی کی مجھے سزا ملی جو مجھ سے پہلے ہوش مندوں کو ملتی رہی ہے۔ میں بدظن اور دل برداشتہ ہوا کہ سب سے کنارہ کش ہو کر یہاں آ پڑا جہاں اب آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا والوں کو بھلا دیا اور انہوں نے مجھے فراموش کر دیا۔ یہ تئیس برس پہلے کی بات ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس طرح اٹھا جیسے گفتگو ختم کر چکا ہو اور گھومتا ہوا کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور کہا۔ "برف باری تھم چکی ہے۔" اور لوٹ کر آتش دان کے قریب آ گیا۔ میں زندگی میں اتنا حیرت زدہ کبھی نہ ہوا تھا۔ جتنا اس کی گفتگو سن کر ہوا۔ میں جیسے خواب سے چونک پڑا اور میرے منہ سے نکلا۔ "رک گئی!" اور اپنے پاؤں پر نگاہیں جمائے سوچنے لگا کہ کیا کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے کہ میں یہ بیس میل کا سفر طے کر کے صبح ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں بے اختیار ایک آہ کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان پر آ گئے۔ "کاش میں بیس میل پیدل چل سکتا۔" میرے میزبان نے میرے الفاظ دہرائے۔ "بیس میل پیدل چل سکتا...... آخر اتنی فکر کس بات کی ہے؟"

"اپنی بیوی کی!" میں نے بے تابی کے ساتھ کہا۔ "جو ڈولڈنگ کی ایک سرائے میں تنہا میرے لئے بے قرار اور مضطرب ہو رہی ہو گی۔ میں اس قدر پریشان اور بے چین ہوں کہ اگر گھوڑا اور رہبر مل سکے تو اسے دس گنی اجرت دینے کے لئے تیار ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "اگر آپ آٹھ دس گھنٹے صبر اور آرام سے نہیں گزار سکتے تو آپ کی خواہش اس سے کم اجرت پر بھی پوری ہو سکتی ہے۔ شمال سے رات کی ڈاک آتی ہے جو ڈولڈنگ میں گھوڑے تبدیل کرتی ہے۔ یہ وکٹوریہ ڈاک یہاں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک جگہ سے گزرتی ہے۔ اب سے سوا گھنٹہ بعد وہ اس چوراہے پر پہنچے گی۔ اگر جیک اس اجاڑ بنجر علاقے میں آپ کی راہنمائی کر کے آپ کو پرانی وکٹوریہ روڈ تک پہنچا دے اور اس راستے پر ڈال دے جو آگے جا کر نئی سڑک سے ملتا ہے تو میرا خیال ہے آپ باآسانی گھر پہنچ سکتے ہیں؟"

"یقیناً بڑی خوشی سے۔" وہ میری بے تابی دیکھ کر مسکرایا۔ گھنٹی بجائی، بوڑھے نوکر کو تمام ہدایات دے کر سمجھا دیا۔ پھر دواؤں کی الماری میں سے وہسکی کی بوتل اور ایک پیانہ نکال کر کہا۔ "برف بہت کافی پڑ چکی ہے۔ اجاڑ اور برفیلے راستے میں رات کے وقت سفر کرنا بے حد دشوار اور تکلیف دہ ہو گا۔ لہٰذا روانہ ہونے سے پہلے ایک گلاس آتش سیال کا اندر چلا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟"

میں نے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت چاہی مگر اس کے اصرار پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر جیسے ہی شراب حلق سے نیچے اتری ایسا محسوس ہوا جیسے اندر آگ لگ گئی ہے۔ میرا سانس تقریباً گھٹ گیا۔ وہ بولا۔ "بہت تیز ہے مگر اب سردی پاس نہیں پھٹکے گی۔ دیر بالکل نہ کریں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اچھا شب بخیر!"

میں اس سے مصافحہ کر کے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ پلک جھپکتے میں ہال بھی عبور کر چکا تھا۔ ہم باہر نکلے جیک نے باہر سے دروازہ مقفل کیا اور ہم دونوں برف کی دبیز تہہ جمی اجاڑ زمین پر چل دیئے۔ کڑاکے کی سردی ہو رہی تھی۔ آسمان سیاہ شامیانے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کہیں مدہم سا ستارہ تک نہ تھا۔

ہمارے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ گہرا سناٹا بہت ڈراؤنا اور بھیانک معلوم دیتا تھا۔ میرا باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا مگر جیک بےزاری کے انداز میں گھسٹتا چپ چاپ چل رہا تھا۔ دراصل وہ میرے ساتھ آنے پر خوشی سے رضامند نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لئے بڑی بڑی رقموں پر سود، در سود کے سوال حل کرنا شروع کردیئے۔ کبھی اس بوڑھے کی تقریر کے فقرے یاد کرکے حیران ہوتا۔ کبھی کوئی گیت گنگنانے لگتا۔ ایک جگہ پہنچ کر جیک اچانک رک گیا۔ اور بولا۔ ''وہ ادھر آپ کی سڑک ہے۔ پتھر کی دیوار دائیں ہاتھ رکھ کر چلتے چلتے جانا سیدھے۔''

''اس چوراہے کا فاصلہ کتنا ہے؟''

''یہی کوئی تین میل کے لگ بھگ ہے۔'' میں نے بٹوا نکالا تو وہ کھل کر بولنے لگا۔ ''پیدل چلنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی کافی اچھی سڑک ہے۔ البتہ ڈھلوان بہت زیادہ ہے۔ اور شمال کی طرف اتنی ہے کہ موٹر گاڑی وغیرہ نہیں گزر سکتی۔ چوک میں کھمبے پر سمتوں کے اشارے ہیں۔ جہاں یہ کھمبا ہے وہاں دیوار ٹوٹی ہوئی ہے اس کا دھیان رکھنا۔ یہ جگہ خطرناک ہے۔ جب سے وہ حادثہ ہوا تھا اس کی آج تک مرمت نہیں ہوئی؟''

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کون سا حادثہ؟''

''اف! رات کی ڈاک لے جانے والی وکٹوریہ اسی جگہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں جا گری تھی، 500 فٹ سے زیادہ گہرائی ہے۔ سارے ملک میں اتنی خراب کوئی سڑک نہیں ہے جتنی یہ ہے۔''

''اوہو! یہ دیوار کھمبے کے پاس ٹوٹی ہوئی ہے نا؟ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اچھا خدا حافظ!''

''شب بخیر جناب۔ اور شکریہ بھی۔'' جیک نے نصف کراؤن جیب میں ڈالا۔ سلام کا خفیف سا اشارہ کیا اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ جب تک لالٹین کی مدھم روشنی دھندلی ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اکیلا پرانی وکٹوریہ روڈ پر جلدی جلدی چل دیا۔ مگر جلد ہی تنہائی کا خیال شدت سے ابھر کر مجھے ڈرانے لگا میں اس ڈر پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اب رات کافی بھیگ چکی تھی اور سردی اتنی بڑھ گئی تھی کہ تیز چلنے کے باوجود میرا سارا جسم سردی سے سن ہورہا تھا۔ پاؤں بالکل شل تھے۔ سانس اندرونی خوف کے باعث ایسے پھول رہا تھا جیسے میں سڑک کے بجائے کسی بہت بلند پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف قدم بقدم چڑھ رہا ہوں۔ جلد ہی میں ہانپنے لگا اور ایک جگہ رک کر پتھر کی دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا۔ دیوار سے ٹیک لگاتے ہی اتفاقاً میری نگاہ پیچھے کی طرف اٹھ گئی۔ اور دور بہت دور روشنی کی ایک کرن جگنو کی مانند چمکتی دیکھ کر سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ شاید جیک نئی سڑک تک میرا ساتھ دینے کے لئے لوٹ آیا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس روشن نقطے کو دیکھ رہا تھا جو گہری تاریکی میں تیزی سے قریب اور روشن تر ہوتا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس روشنی کے بالکل متوازی ایک اور روشنی نمودار ہوگئی اور یہ دونوں زرد ستارے سے یکساں رفتار سے میری طرف آنے لگے۔ اب میں نے باآسانی اندازہ لگالیا کہ یہ وکٹوریہ آرہی ہے اور یہ دونوں اس کی بتیاں ہیں لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ ایسی خطرناک سڑک پر جس کے متعلق ہر ایک کو علم ہے کہ وہ ٹریفک کے ناقابل ہے اور ایک زبردست حادثے کو جنم دے چکی ہے کون انجان ہے جو اتنی تیزی سے اپنی گاڑی دوڑائے لارہا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے لیمپوں کی روشنی اتنی قریب آگئی کہ ان کی دھندلی لائٹ میں گاڑی کا ڈھانچہ واضح ہوکر صاف دکھائی دینے لگا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ شبہ گزرا کہ میں اندھیرے میں چوراہا کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ کھمبے کا بھی دھیان نہیں رہا اور اب میں اس سڑک پر ہوں جہاں سے رات کی ڈاک لے جانے والی وکٹوریہ گزرتی ہے۔ اور یہ وہی وکٹوریہ آپہنچی ہے۔ اگر یہ نکل گئی تو گھر پہنچنے کی امید تاقیامت پوری نہیں ہوگی۔ یہ سوچتے ہی میں وکٹوریہ رکوانے کے

لئے تیار ہوگیا۔ وکٹوریہ سڑک کا موڑ مڑی۔ میں نے دھند اور ہلکی روشنی میں دیکھا کہ وکٹوریہ میں چار گھوڑے جتے تھے جن کے نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ پاسبانی اور کوچوانی کے فرائض ادا کرنے والے کے ساتھ ایک سواری بیٹھی تھی۔ میں اچھل کر سامنے آ گیا۔ اپنا ہیٹ ہلایا اور زور سے پکارا۔ مگر وکٹوریہ پوری رفتار سے میرے قریب آ کر گزر گئی۔

اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا کہ شاید انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور نہ میری آواز سنی لیکن دوسرے لمحہ میں نے دیکھا کہ کوچوان نے رسیاں کھینچیں۔ وکٹوریہ رک گئی۔ میں تیزی سے لپکا۔ کوچوان نے سردی سے بچنے کے لئے فرغل آنکھوں تک کیا ہوا تھا۔ اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی سواریوں میں سے کسی نے بھی جو وکٹوریہ کی کھڑکھڑاہٹ کے باوجود سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھیں میری طرف توجہ نہ دی۔ باہر بیٹھی ہوئی سواری تک نے میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ جو جس حالت میں تھا اسی طرح بیٹھا رہا۔ آخر میں نے خود دروازہ کھولا۔ اور اندر جھانکا۔ صرف تین مسافر تھے چنانچہ میں بھی سوار ہوگیا۔ دروازہ بند کرلیا اور خالی کونے میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اپنی خوش قسمتی پر میں بہت ہی نازاں تھا۔

وکٹوریہ کی اندرونی فضا کی کیفیت الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ باہر کی بہ نسبت اندر زیادہ خنکی محسوس ہوئی۔ ایک سیلی سی ناگوار بو پوری طرح رچی بسی ہوئی تھی میں نے یکے بعد دیگرے تینوں مسافروں کی طرف دیکھا۔ وہ مرد تھے اور پیچھے کی طرف قدرے جھکے اپنے اپنے خیالات میں گم سوئے ہوئے سے لگتے تھے۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے اپنے مقابل بیٹھے مسافر کو مخاطب کیا۔ ”آج رات کس قدر شدید سردی ہے!“

اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا میں نے پھر کہا۔ ”معلوم ہوتا سردی کا موسم آغاز ہی میں اپنا جوبن دکھا رہا ہے۔“ اگرچہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس مسافر کی صورت صاف دکھائی نہیں دیتی تھی مگر اتنا صاف نظر آتا تھا کہ وہ پوری طرح آنکھیں کھولے مجھے تک رہا ہے۔ پھر وہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ میں جھنجھلا گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس بے اعتنائی پر جھگڑتا مگر مجھے سفر طے کرنا تھا اس لئے غصہ پی گیا۔

سردی سے میری ہڈیوں کا گودا تک متاثر ہو چکا تھا۔ وکٹوریہ میں بسی ہوئی عجیب بو، ناقابل برداشت تھی۔ دماغ پراگندہ ہوکر ماؤف ہوتا جارہا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اور اپنے بائیں ہاتھ والے مسافر کی طرف مڑ کر اس سے پوچھا کہ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو کھڑکی کھول لوں؟ وہ بھی نہ ہلا جلا نہ کوئی جواب دیا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ مگر پھر جواب ندارد۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا چنانچہ جھلا کر کھڑکی کا کھٹکا گرا دیا۔ لیکن کھٹکا گرنے کے ساتھ ہی چمڑے کی پٹی ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ شیشے پر پھپھوندی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ برسوں سے وکٹوریہ کی صفائی نہیں ہوئی۔ میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی اور میں چوکنا ہوکر ایک ایک چیز کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وکٹوریہ کی شکستگی و کہنگی آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا ہر حصہ نہ صرف ناقابل مرمت بلکہ بھر بھرا ہو چکا ہے۔ دریچے کی جھریاں ہاتھ لگتے ہی ایسے بکھر گئیں جیسے ریت کی بنی ہوئی ہیں۔ چمڑے کے بند گل سڑ کر جگہ جگہ تڑخ چکے تھے۔ فرش پاؤں کا دباؤ پڑتے ہی اس طرح چرچراتا تھا جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ الغرض سارا ڈھانچہ حباب کی مانند بودا ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ وکٹوریہ برس ہا برس تک کسی گاؤں کے کچے مکان میں بند رہی ہو اور ابھی ابھی نکال کر سڑک پر لائی گئی ہو تاکہ ایک دو آخری چکر اور لگالے۔

اب میں تیسرے مسافر کی طرف پلٹا اور ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”اس وکٹوریہ کی حالت تو قابل رحم ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ڈاک لے جانے والی اصل وکٹوریہ آج کل زیر مرمت ہے؟“

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا، میری طرف دیکھا

مگر چپ رہا۔ میں تازندگی اس کی وہ نظر نہیں بھول سکوں گا جو اس نے مجھ پر ڈالی تھی۔ اس سے نظریں ملتے ہی میرا خون خشک ہوگیا۔ ایسی سرد کپکپی مجھ پر طاری ہوئی جیسے دل برف کی ڈلی بن گیا ہو۔ اب اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی اس کا تصور کرتے ہوئے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ اف! اس کا چہرہ لاش کی مانند نیلگوں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں خون کی رمق تک نہ تھی اور وہ اسی طرح کھنچے ہوئے تھے جیسے اس پر موت کا کرب طاری ہو۔ اور چرے ہوئے ہونٹوں میں سے اس کے دانت دکھائی دے رہے تھے۔

میرے اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ ایک عجیب خوف نے مجھے دبوچ لیا۔ ایک خوفناک دہشت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب میری نگاہ وکٹوریہ کی نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوچکی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنے سامنے والے مسافر کی طرف دیکھا اس کی بھی وہی کیفیت تھی۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور وہی دل میں اتر جانے والی تیز نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انتہائی سردی کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میں نے پہلو میں بیٹھے ہوئے مسافر پر نظر ڈالی۔ اف خدایا میں بیان نہیں کرسکتا کہ کیا دیکھا۔ وہ مردہ تھا۔

ان میں سے کوئی بھی زندہ انسان نہیں تھا۔ اور میں خود بھی اپنے آپ کو زندہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کے بھیانک اور عفونت چہروں پر کافور کی سی چمک تھی۔ ان کے بالوں میں قبر کے سیلے ہوئے ذرات جمے تھے۔ ان کے کپڑوں پر مٹی لگی تھی اور وہ کرم خوردہ ہوکر جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے لمبے لمبے تھے، لگتا تھا انہیں دفن ہوئے مدت گزر چکی اور وہ ابھی ابھی قبروں سے اٹھ کر آئے ہیں۔ ان کی کوئی چیز اگر زندہ دکھائی دیتی تھی تو وہ صرف ان کی بھیانک اور خوفناک آنکھیں تھیں جو بدستور مجھے گھورے جارہی تھیں۔

ایک دہشت زدہ، ایک دل دوز اور دردناک چیخ، بے اختیار میرے منہ سے نکلی اور میں نے بوکھلا کر دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ اسی لمحہ بادل کی اوٹ سے پل بھر کے لئے چاند نے اپنا چہرہ نکالا اور اسی روشنی میں، میں نے چوراہے پر اس کھمبے کو بھوت کی طرح کھڑا دیکھا جس پر راستوں کے اشارے لگے تھے اور پلک جھپکنے میں دیوار کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی نظروں کے سامنے آگیا۔

پھر پلک جھپکتے میں وکٹوریہ اور ہنہناتے ہوئے گھوڑے لڑکھڑاتے اور گھومتے ہوئے نیچے اتھاہ گہرے کھڈ میں جا گرے۔ ایک زبردست کان پھاڑنے والا دھماکہ ہوا۔ میرے دل کو زبردست دھچکا لگا اور پھر کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے میں برسوں کی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ میری بیوی پٹی سے لگی آبدیدہ اور غمگین نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یہ تھا کہ میں ایک چٹان پر گرا تھا۔ میری موت یقینی تھی مگر اس برف کی تہہ نے بچالیا جو چٹان پر تقریباً ایک فٹ جمی ہوئی تھی دن چڑھے چند چرواہوں کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے وہاں سے اٹھالائے۔ اور ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے مجھے ہذیانی حالت میں پایا۔ میرا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔

میری جیب میں موجود کاغذات سے میرا پتہ چلا۔ میری بیوی کو بلایا گیا۔ جس کی محبت بھری تیمارداری نے مسیحائی کا کام کیا۔ جہاں میں گرا تھا، یہ وہی جگہ تھی جہاں نو برس پہلے رات کی ڈاک لانے والی وکٹوریہ کو حادثہ پیش آیا تھا۔ ان ڈراؤنے واقعات کا جن سے میں دوچار ہوا تھا اپنی بیوی سے قطعاً ذکر نہیں کیا تھا البتہ ڈاکٹر کو بتایا مگر اس نے دماغ پر بخار چڑھنے سے ڈراؤنے خواب دکھائی دینا تعبیر کیا۔ ہماری کافی بحث ہوئی۔ میں اسے حقیقت تسلیم کرانا اور منوانا چاہتا تھا۔ اور ڈاکٹر اسے بخار کی حالت میں دکھائی دینے والا خواب قرار دیتا رہا۔

قارئین! اب آپ بھی جو چاہیں رائے قائم کرلیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بیس سال قبل روحوں والی اس خوفناک وکٹوریہ میں چوتھی سواری، میں تھا۔



تاکیدکی اور دھمکی دی کہ اس منصوبے کے بارے میں کسی کو بھنک نہ پڑے۔ ورنہ بڑا عبرتناک انجام ہوگا۔

مجھے اپنی مظلومیت کی کہانی سنانے کی نوبت نہ آسکی۔ کیوں کہ عین اس وقت ایک گمنام تیر سنسناتا ہوا میرے قدموں کے بالکل قریب ہی زمین میں پیوست ہوگیا۔ میں ایک دم سے اچھل پڑا۔

''ایسے تیر ہر وقت تمہارے تعاقب میں رہیں گے۔'' مقدس سردنا نے پر تعین لہجے میں کہا تو میں چونک کر اسے دہشت نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک چمک سی ابھری۔ ''تم ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنا۔''

مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تیر سردار جیون کے کسی نمک خوار نے چلایا تھا۔ محض یہ بات یاد دلانے کے لئے کہ میں نے بستی میں کسی کو بھی یہ بتانے کی کوشش کی کہ مجھے رانی کا دعوے دار بنانے کے لئے سردار نے مجبور کیا تھا۔ مجھ پر اس مقصد کے لئے جبر و زبردستی کی گئی ہے۔ اگر یہ راز افشا ہوا تو مجھے موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ باہر آہٹوں سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ تیر انداز بھاگا جارہا ہے جس نے تیر چلا کر تنبیہ کی تھی۔

''تمہارا شکریہ مقدس سردنا کہ تم نے مجھے بہت بڑے خطرے سے آگاہ کیا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا...... اب میں جارہی ہوں...... تم میری باتیں یاد رکھنا۔ اسے بھولنا نہیں......'' مقدس سردنا نے کہا۔

''یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں رات کے وقت اس کے مکان میں آکر اس کا مہمان رہوں۔ یہ بات نہیں بھولوں۔

مقدس سردنا کی باتوں کی روشنی میں پگوڈا میرے لئے مقبرہ ثابت ہوسکتا تھا۔ اس لئے میں نے جلد از جلد کھلی فضا میں یہاں سے نکل کر آنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں ابھی باہر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مقدس سردنا نے اپنے بھیڑیے کو اشارہ کیا تو وہ ایک دروازے سے گزر کر اندر کی طرف روپوش ہوگیا۔

مقدس سردنا میرے پاس آئی اور اس نے اپنی مرمریں باہیں جو خنجروں کی طرح بے نیام تھیں۔ میرے گلے میں حمائل کردیں اور خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا تو میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جو بھیڑیے کی کھال کے مختصر لباس میں ملبوس ہے۔ اس میں کھال کی بو ہوگی...... لیکن اس کا رسیلا بدن ایک دلکش اور مست کردینے والی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میرے لب اس کے رسیلے ہونٹوں کی مٹھاس سے بندھ گئے۔ پھر ہم دونوں ہی جذباتی ہوگئے۔ بہکتے گئے میں حد سے تجاوز کرنے والا تھا کہ وہ بڑی نرمی اور غیر محسوس انداز سے میرے بازوؤں کی گرفت سے نکلی۔

آج کی رات ہم جشن منائیں گے...... دل تو اس وقت بھی کررہا ہے۔ لیکن سردار کا کوئی مخبر یا کارندہ کسی بہانے ٹپک سکتا ہے......''

پھر وہ سامنے والے کمرے میں گھس گئی۔ میں پگوڈا سے نکل کر مقدس سردنا کے دلکش تصور میں کھویا ہوا بستی کی طرف جارہا تھا جس کے اچھوتے اور انوکھے لمس، اس کا تیکھا چہرہ اور سنسنی خیز سراپا اور ہیجان خیز نشیب و فراز نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ اس نے مجھے جیسے پاگل کردیا تھا۔ اس نے رات کے وقت مجھے مدعو کیا تھا۔ بھلا میں ایسی دعوت کو کیسے قبول نہیں کرتا۔

میں مقدس سردنا کے حسن کے طلسم میں ایسا غرق تھا کہ مجھے کتے کے تعاقب کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں اس وقت چونکا جب تیز سانسوں کی آواز اور پھر ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے فوراً ہی مڑ کے دیکھا تو ایک دیوہیکل خون خوار شکاری کتا پتھر کی قید سے آزاد ہانپتا ہوا تیزی سے میری طرف اس طرح بڑھا جیسے مجھے دبوچ لے گا......

مجھے لمحے کے لئے خیال آیا کہ یہ کتا شاید سردار کا مخبر ہو۔ اس نے جو مقدس سردنا کو اور مجھے لپٹتا دیکھا تو میری تکا بوٹی کرنا چاہتا ہے...... شاید سردار کے کسی منتر کے زیر اثر تو نہیں ہے......؟

(جاری ہے)



خونی ڈرامہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اور جب نوجوان کے ہاتھوں میں دبی ہوئی لکڑی کی موٹی کیل اسے اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تو کرب کی کف اڑاتی لہروں تلے اس نے پہلی بار جانا...... کہ حقیقت اور ڈرامے میں کتنا فرق ہے اور پھر......

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والے اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں، ثبوت کہانی میں موجود ہے

وہ پورے دن آرام کرتا رہا۔ اس دوران نیچے گاؤں سے متواتر گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ دن ڈھلتا گیا اور شام کے سائے گہرے ہوتے ہوتے خاموشی چھا گئی۔ گویا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ امریکی فوجوں نے دریا پار کرلیا تھا اور شاید اب جا چکی تھیں۔ وہ ایک بار پھر پوری طرح محفوظ تھا۔

گاؤں کے اوپر پھیلی ہوئی پہاڑی کے گھنے درختوں کے درمیان، پرانا قلعہ سنسان کھڑا تھا۔ کاؤنٹ بارساک نے اطمینان کا سانس لیا اور باہر آ گیا۔

کاؤنٹ ایک لمبا شخص تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا اور ہاتھ پیر کسی موی مجسمے کے مانند پیلے پیلے تھے اس کا چہرہ سیاہ تھا لیکن اس کی آنکھیں اس سے بھی زیادہ سیاہ تھیں۔ اور ان کے نیچے پڑے ہوئے گڑھے ان سے بھی زیادہ سیاہ تھے اور اس کے جسم پر ایک سیاہ لبادہ پڑا

ہوا تھا۔ اور لبادہ کی سیاہی میں سے سب سے زیادہ نمایاں چیز جو تھی وہ تھے اس کے ہونٹ، سرخ سرخ ہونٹ جن پر ایک منحوس سی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی۔

یہ اس کے کھیل کا وقت تھا اور یہ مسکراہٹ اسی کی غماز تھی۔

اس کھیل کا نام تھا "موت" اور کاؤنٹ اس کھیل کا ماہر تھا وہ کھیل پیرس کے مشہور اسٹیج گوگنال میں کئی بار کھیل چکا تھا۔ اس وقت وہ ایرک کیرون کے نام سے مشہور تھا۔ پھر جنگ چھڑ گئی اور ساتھ ہی ساتھ اسے بہتر مواقع ملنے لگے۔

پیرس پر جرمنوں کے قبضے سے قبل ہی وہ ان کے ساتھ زیر زمین ہو گیا تھا۔ ایک مشاق اداکار کی حیثیت سے اس کی خاصی شہرت تھی۔ اور یہ اس کی شہرت کا انعام تھا کہ اب اسے اسٹیج کی نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں اپنا پسندیدہ کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اس میں کس قدر سادگی ہے۔ اس نے اپنے افسروں سے کہا۔ "بارساک کا قلعہ انقلاب کے زمانے سے اجاڑ پڑا ہے۔ گاؤں کا کوئی شخص ادھر جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ دن میں بھی ادھر سے کوئی نہیں گزرتا۔ کیونکہ ان میں یہ کہانی بہت عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاؤنٹ بارساک ایک "خون آشام" تھا۔ آپ یقین کریں میں اس کے روپ میں جاسوسی کے فرائض عمدگی سے انجام دے سکوں گا۔"

اور پھر ساری تیاری مکمل ہو گئی۔ ایک شارٹ ویو ٹرانسمیٹر قلعے میں ایک محفوظ مقام پر نصب کر دیا گیا۔ جس پر تین مشاق آپریٹر تعینات تھے۔ اور ان تینوں کا انچارج اسے مقرر کر دیا گیا۔ تین بدروحوں کی انچارج "روح" کی حیثیت سے۔

"پہاڑی کے ساتھ پیچھے ایک قبرستان ہے۔" اس نے اپنے افسروں کو بتایا۔ "اور اس قبرستان میں ایک گوشہ ایسا ہے جو صرف بارساک خاندان کے لئے مخصوص ہے۔ ہم اس گوشے پر قبضہ کر کے کاؤنٹ کی لاش کا ڈھانچہ کہیں اور کھسکا دیں گے۔ اور ایسی ترکیب کریں گے کہ گاؤں والے کاؤنٹ کے خالی تابوت کو دیکھ لیں۔ اس طرح گاؤں والے اور گھبرا جائیں۔ انہیں یقین ہو جائے گا کہ کاؤنٹ واقعی ایک ویمپائر یا خون آشام تھا اور یہ کہ وہ اب بھی اپنی کارروائیوں میں لگا ہوا ہے۔"

سوال کیا گیا۔ "فرض کرو ان میں کوئی ایسا بھی ہو جسے یقین نہ ہو؟"

اس کا جواب تیار تھا۔ "میں انہیں یقین کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ کیوں کہ میں راتوں میں گشت کرتا رہوں گا میں یعنی کاؤنٹ پارساک"!!

اور جب انہوں نے اسے لبادہ میں، میک اپ کے بعد دیکھا تو سب مطمئن ہو گئے۔ وہ واقعی اس کردار پر ٹھیک اتر رہا تھا۔

کاؤنٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ کردار سو فیصدی میرا ہے۔" وہ آہستہ سے چلتا ہوا قلعہ کے تاراج حصے کی سمت بڑھا۔ جہاں جا بجا مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے اور چھت غائب تھی۔ جہاں سے پورا چاند نظر آ رہا تھا۔

اب اگر امریکی فوج جا چکی ہے تو پردہ گر جانا چاہئے اور اس کے لئے بھی تیاری مکمل تھی۔

جرمن فوج کی پسپائی کے وقت قبرستان کے مقبرہ کو ایک اور اچھے استعمال کے لئے بھی آزمایا جا سکتا تھا۔ محفوظ مقام پر، ایئر مارشل گورنگ کا تصویری خزانہ اچھی طرح چھپا دیا گیا تھا قلعے کے اندر ایک لاری بھی لا کھڑی کی گئی تھی۔ تینوں آپریٹر اب لاری چلانے پر لگے ہوئے تھے اور وہ اس خزانے کے حصول کو متواتر قلعے میں لا رہے تھے۔ اس کے نیچے تک ہر چیز تیار ہو چکی تھی۔ لاری کے ذریعے، امریکی فوجیوں کی یونیفارم، جعلی شناختی کارڈ اور اجازت نامے اور دوسری اشیاء وہ آسانی سے لے جا سکے گا۔ اور یہ بات پہلے سے طے تھی کہ وہ ایک خاص مقام پر جرمن افواج سے جا ملے گا۔ ہر چیز منصوبے کے مطابق تھی۔ اس نے سوچا۔ "آہ کیا لمحہ ہوگا وہ جب میں اپنی یادداشتیں لکھوں گا۔"

مگر اس مسئلے سے زیادہ اہم چیزیں سامنے تھیں۔

اس نے سر اٹھا کر چڑھتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ باہر نکلنے کا وقت ہو چکا تھا۔

ویسے وہ جانے کے لئے دل سے تیار نہ تھا۔ جہاں دوسروں کو صرف، خاک دھول اور لکڑی کے جالے نظر آتے تھے وہاں وہ با آسانی ایک اسٹیج دیکھ سکتا تھا۔ ایسا اسٹیج جہاں اسے اپنا کردار خوبی سے ادا کرنا تھا۔ کسی ویمپائر کا کردار وہ "خون" کے لالچ میں نہیں بلکہ ایک اداکار کی اداکاری کی فتح کی لالچ کے تحت سرانجام دے رہا تھا۔ وہ یہاں ایک اداکار کی حیثیت سے کامران بھی تھا اور سرخرو بھی۔ اور یہی وہ لذت تھی جو اسے اس کردار کو ادا کرنے کے لئے اکسائے ہوئے تھی۔

"شیکسپیئر" اس نے ایک لمبی سانس لی۔ "شیکسپیئر بھی خوب تھا۔" اس نے سوچا۔ "اسے یقیناً دنیا کو بے وقوف بنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ جبھی تو اس نے جنوں، بھوتوں اور بدروحوں کے ڈرامے لکھے تھے۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہ دنیا آج بھی ان طاقتوں پر یقین رکھتی ہے۔"

پھر وہ تیز قدموں چلتا ہوا قلعے سے باہر چل پڑا۔ گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رک گیا۔ اسی جگہ پر ریمنڈ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ریمنڈ صرف بارساک گاؤں کا میئر ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسا بوڑھا بھی تھا جو اس کی اداکاری کا بڑا معترف واقع ہوا تھا۔ اور اس بے وقوف کی نظر جونہی کاؤنٹ پر پڑی تھی وہ کسی بوڑھی عورت کی مانند چیخنے اور چلانے لگا تھا۔

پتا نہیں وہ رات گئے ادھر کیوں آیا تھا۔ بہر حال اتنا ضرور تھا کہ اس بوڑھے نے کاؤنٹ کا مرگشت کا اچھا اشتہار دیا تھا اور اس کے لئے وہ شکریہ کا مستحق تھا۔ اور اس بے وقوف کی کوشش ہی سے کاؤنٹ کا خالی تابوت بھی گاؤں والوں کو نظر آیا تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ وہ نیچے بہنے والے چشمے کے قریب جا پہنچا۔ اسی جگہ اسے ریمنڈ کی لڑکی نظر آئی تھی۔ سوزانی اپنے لنگڑے محبوب سے ملنے آئی تھی۔ مگر جس وقت ان دونوں کی نظر کاؤنٹ سے ملی تھی۔ لنگڑا تیزی سے بھاگا تھا۔ اس تیزی سے کہ سوزانی پیچھے رہ گئی تھی۔ یہ واقعی بڑی بدقسمتی کی بات تھی کیونکہ سوزانی کی لاش کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا تھا اور یہ کام اس نے اس طرح انجام دیا تھا کہ لڑکی کی بازیابی کا سوال ہی نہ تھا۔ گاؤں والے حیران تھے کہ آخر لڑکی کہاں گئی......؟ اور اس طرح وہ مزید محفوظ ہو گیا تھا کیونکہ اب لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ کاؤنٹ کا بھوت متواتر شکار میں مصروف ہے۔

"قلعے کی سمت جانا موت کو دعوت دینا تھا۔"

غریب ریمنڈ اب گاؤں کا میئر نہیں تھا کیونکہ اس کا گاؤں بمباری کے ذریعے خاصہ تباہ ہو چکا تھا۔

کاؤنٹ ہولے سے مسکرایا اور چلتا رہا۔ اس کا لبادہ ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور پس منظر میں قبرستان کی تاریکیاں اور سناٹا اسے اور پراسرار بنائے ہوئے تھا۔

واقعی یہ ایک بڑا کردار تھا۔ اسے خوشی تھی کہ یہ کردار اب ختم ہونے والا تھا۔ وہ دوبارہ بھوت سے انسان کی زندگی گزارنے جا رہا تھا۔ اور یہ ایک اچھی بات تھی۔

وہ جس وقت قلعے سے نکل کر قبرستان کی سمت بڑھا تو اس نے دیکھا۔ لاری اس کی منتظر کھڑی ہے۔ مخصوص مقبرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے سامان اتار لیا تھا۔ اب صرف اس بات کی کسر رہ گئی تھی کہ وہ اپنا میک اپ اتار کر معقول کپڑے پہن لے اور رخصت ہو جائے۔

کاؤنٹ آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ سائے میں رکی ہوئی لاری کے پاس جا پہنچا تو اچانک اسے لوگوں نے چھاپ لیا۔ اسے اپنی پیٹھ میں نوکیلے کانٹوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں میں لالٹینوں کی روشنیاں گھستی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور تب کسی نے سخت لہجے میں کہا۔

"رک جاؤ۔"

وہ چپ چاپ رک گیا۔ اس نے دیکھا۔ گاؤں والوں کا ایک غول اسے گھیرے ہوئے تھا۔ ریمنڈ ان سب میں نمایاں تھا۔

مگر ان کو یہ جرأت کیونکر ہوئی؟ اس نے سوچا۔

گاؤں کے اس امریکی کارپول کو وہ خوب جانتا تھا جس کے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ اسے لاری کے قریب ہی اپنے تینوں آدمیوں کی لاشیں بھی نظر

آ گئیں۔ شاید انہوں نے کام کرتے وقت ان تینوں کو دیکھ لیا تھا اور ٹھکانے لگا دیا تھا۔

اچانک اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ ''تم کون ہو؟'' یہ آدمی کیا تمہارے تھے؟ تم لاری میں کیا لے جارہے تھے؟''

جواب میں کاؤنٹ آہستہ سے مسکرادیا۔ اسے معلوم تھا چند لمحوں میں یہ لوگ چپ ہوجائیں گے۔

کارپول کے ساتھی نے لاری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں یہ لاری دریا کے پار لے جارہا ہوں۔ پھر وہ لاری پر جا بیٹھا اور لاری چل دی۔ اب وہ متعدد جانے پہچانے چہروں کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ بھاگنے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ وہ لوگ متواتر اسے گھورے جارہے تھے۔

''اسے مقبرے میں لے چلو۔'' ریمنڈ نے کہا۔

اس لمحے اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ شاید وہ لوگ ابھی تک اسے ایک ویمپائر ہی سمجھ رہے تھے۔ اور اسے مقبرہ میں لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے چہروں سے تذبذب اور خوف نمایاں تھا۔ امریکی افسر کے جانے کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی متوحش نظر آتے تھے۔

کاؤنٹ ہولے سے مسکرادیا۔ اور اس کے لبوں کے کنارے سے دو سفید دانت جھانکنے لگے۔ وہ لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ کاؤنٹ نے ایک لمبا ڈگ بھرا اور مقبرہ کے دروازے میں گھس پڑا۔

اس کے پلان کے مطابق کام نہیں ہوسکا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ اب امریکی ہیڈ کوارٹر میں اسے سوالوں کی بوچھاڑ سے نپٹنا ہوگا۔ مگر اسے ایک اطمینان ضرور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چند سال جیل میں رہ کر دوبارہ ضرور نکل آئے گا۔ اسے یقین تھا کہ جب امریکی اس کی داستان سنیں گے تو اس کے حیرت انگیز کردار اور اداکاری کو سراہے بنا نہ رہیں گے۔

مقبرے کا مخصوص گوشہ تخت، تاریک اور حبس زدہ تھا۔ وہیں ایک خالی تابوت دھرا تھا۔ وہ کپکپا کر رہ گیا۔ اندھیرے میں رک کر اس نے لبادہ کی گرہ ڈھیلی کی۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی بہتر تھا۔ کمرے سے باہر کی سرگوشیاں اب خاموش ہوچکی تھیں۔

آخر یہ احمق لوگ اب کیا کررہے ہیں؟ اس نے سوچا کاش امریکی کمک جلد آجائے۔ اندر بے حد گرمی تھی۔ اور اسے باہر چھا جانے والی گہری خاموشی سخت تشویش ناک محسوس ہورہی تھی۔

''ممکن ہے وہ چلے گئے ہوں۔'' اس نے سوچا۔

یہی بات ہوسکتی ہے کیونکہ امریکی نے ان سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کریں اور فوج کی آمد کا انتظار کریں۔ مگر اب اس گاؤں والے خوف زدہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ایک بدروح ہے اور شاید وہ بھاگ لئے ہیں اور اب خود اسے بھی نکل لینا چاہئے۔

اس نے سوچا۔ اور آگے بڑھ کر اس نے مقبرے کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

مگر...... وہ سب کے سب وہیں موجود تھے سب کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ ریمنڈ کے ہاتھوں میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ اور کاؤنٹ نے فوراً پہچان لیا کہ وہ چیز کیا تھی۔

وہ لکڑی کا ایک موٹا سا کھونٹا تھا۔ جو نیچے سے خاصا نوکیلا تھا۔

اور تب وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ انہیں بتانے لگا کہ کوئی روح وغیرہ نہیں بلکہ ایک عام آدمی ہے اور وہ جو کچھ بنا ہوا تھا۔ وہ تو محض ایک ڈھونگ تھا اور......

مگر وہ تو جیسے بہرے بن گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پر پل پڑے۔ اور چند ہی لمحوں میں انہوں نے اسے اٹھا کر کمرے کے اندر رکھے ہوئے خالی تابوت میں جاڈالا۔

اور جب ریمنڈ کے ہاتھوں میں دبی ہوئی لکڑی کی سوئی کیل اسے اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تو کرب کی کف اڑاتی لہروں تلے اس نے پہلی بار جانا...... کہ حقیقت اور ڈرامے میں کتنا بڑا فرق پایا جاتا ہے۔





خونی کاوش

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اپنے دام میں خود صیاد آگیا اسی کے مصداق عقل و شعور کے مالک اور دنیا کے لوگوں کو انگشت بدنداں کرنے والے کی عجیب و غریب دل گرفتہ دل سوز اور ناقابل یقین ذہن کو جھنجھوڑتی حیرت ناک روداد

اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے والے ایک شخص کا عبرتناک اور حیرتناک دل دہلاتا خونی واقعہ

جب ڈینا کے ہاں پلوں کا جوڑا پیدا ہوا تو اس کی زچگی کے لئے پروفیسر ڈاٹل بہ نفس نفیس موجود تھا۔ ڈینا ایک کتیا تھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا پروفیسر ڈاٹل کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ وہ تجربیاتی بیالوجی میں پی ایچ ڈی تھا۔ وہ پریڈک یونیورسٹی میں کئی سال تک سربراہ شعبہ رہ چکا تھا۔ اگر وہ ڈینا پر خصوصی توجہ دے رہا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ڈینا کوئی معمولی کتیا نہیں تھی۔ وہ اور اس کا ساتھی سلیگ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا واحد جوڑا تھے۔ ان پر انتہائی اہم نوعیت کے تجربات کئے جا رہے تھے۔ وہ الاسکا میں دریائے چاینک کے کنارے رہتے تھے جہاں ٹمپریچر نقطہ انجماد سے تمیں درجے کم تھا۔ پروفیسر ڈاٹل ان تجربات کے سلسلے میں وہاں تن تنہا رہائش پذیر تھا۔ قریب ترین انسانی آبادی ڈکن لینڈ تھی جو وہاں سے ساٹھ میل دور تھی۔ پروفیسر ڈاٹل

کے لئے کوئی انسانی آبادی قریب تر رہنے کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا۔ اسے ان تجربات کے لئے مکمل سکوت اور سکون درکار تھا۔ الاسکا کا ماحول اس کے لئے بہترین تھا اور اس وقت وہ پورے انہماک سے حاملہ کتیا کی زچگی میں مدد دے رہا تھا۔

بالآخر جب پروفیسر ڈاتل اس اہم تجرباتی فرض کو سرانجام دے چکا تو اس نے باڑے کا دروازہ کھول کر سکیگ کو بھی اندر آنے کی اجازت دی۔ سکیگ بڑے کائیاں انداز میں پروفیسر کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اندر آیا پھر اس کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلیں جو غراہٹ یا بھونکنے سے مختلف تھیں۔ ڈینا نے بھی اسی انداز میں اس کو جواب دیا پھر سکیگ اندر آنے کے بجائے وہیں باڑے کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ وہ اب پروفیسر کے ہاتھوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

پروفیسر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”ڈرو نہیں سکیگ! میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں تمہاری اور ڈینا کی اولاد میں سے کسی کو لے کر نہیں جا رہا۔ یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا۔ تم اور ڈینا تو میرے کامیاب تجربات کا حاصل ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے بچوں میں یہ قابلیت اور فہم و فراست تم دونوں سے بھی زیادہ اچھے طریقے پر پروان چڑھے گی۔“

اس کے بعد پروفیسر ڈاتل نے باڑے کا بیرونی دروازہ بند کر دیا اور اپنے کیبن میں چلا گیا۔ اس نے یہ رہائش گاہ موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی محنت سے بنائی تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مضبوط شیشے کے دوہرے پرت تھے اور فرش لکڑی کا تھا۔ زیادہ تر تعمیراتی سامان تیار شدہ حالت میں اسی کشتی کے ذریعے دریائے چاہنک کے راستے یہاں تک لایا گیا تھا جس میں اس کی کتابیں اور سائنسی آلات وغیرہ آئے تھے۔

کیبن میں داخل ہو کر پروفیسر ڈاتل نے اپنا اوور کوٹ اتار دیا۔ باہر کے اور اندر کے درجہ حرارت میں خاصا فرق تھا۔ باہر سے یہ مکان جس قدر سادہ اور معمولی سا نظر آتا تھا اندر سے اسی قدر آرام دہ تھا۔ ایک مرتبہ اندر آنے کے بعد تو پروفیسر ڈاتل کو اس میں اور بریڈک یونیورسٹی کے اس بنگلے میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا تھا جہاں سے اس نے ہنگامی حالت میں استعفیٰ دے کر یہاں آنے اور تن تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ از خود مستعفی نہ ہو جاتا تو یونیورسٹی کے حکام اسے برخواست کر دیتے جو زیادہ اہانت آمیز ہوتا۔

وجہ یہ تھی کہ اس روز ایک مقامی اخبار میں تجرباتی بیالوجی کے موضوع پر اس کا ایک مضمون بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بیس منٹ کے بعد ہی گڑبڑ کی ابتدا ہو گئی تھی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر کے آدمی اس کے پاس آ کر عجیب و غریب قسم کا استفسار کرنے لگے تھے۔ اب اسے اطمینان تھا کہ یہاں ان برفانی ویرانوں میں اسے کسی کے سوال جواب یا محتسب کا خدشہ نہیں تھا۔ یہاں اس کے سائنسی تجربات و تحقیقات کو غیر انسانی اور غیر اخلاقی قرار دینے کے لئے کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا اور وہ اطمینان قلب سے اپنے نظریات کے مطابق تجربات جاری رکھ سکتا ہے اور وہ یہی کر رہا تھا۔ اس کی لیبارٹری میں لاتعداد کا پیاں اس کے مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج سے بھری پڑی تھیں اور نمونوں کے جار بھی بہت زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ اس نے چار سالوں میں بے انتہا اہم نوعیت کے تجربات کئے تھے جو وہ کامیاب رہے تھے لیکن پروفیسر ڈاتل کو دنیا کی بے قدری کا شکوہ تھا کیونکہ دنیا والوں کو اس کے طریق کار پر اعتراض تھا۔ دنیا والے ہمیشہ ذہین لوگوں کے مخالف رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاتل نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور پھر اطمینان سے میز پر سے اپنی کاپی اٹھا کر اس میں اپنے تازہ ترین تجربے کے بارے میں نوٹ لکھنے لگا۔ اس نے لکھا۔

”آج ڈینا کے پلے پیدا ہوئے ہیں۔ ڈینا جانتی تھی کہ میں زچگی میں اس کی مدد کر رہا ہوں، اسے نقصان نہیں پہنچا رہا، اس لئے اس کا رویہ ٹھیک رہا۔ سکیگ بھی یہ جانتا ہے۔ میں نے ان میں اتنی دماغی صلاحیت اور شعور تو پیدا کر ہی دیا ہے اس لئے وہ سوچ سکتے ہیں سکیگ نے میری

واپسی پر میرے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھا۔ گویا یہ تسلی کرلینا چاہتا ہو کہ میں کسی پلے کو اٹھا کر ساتھ تو نہیں لے جارہا اس لئے سلیگ کی قوت حافظہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ یہ بات اب تک نہیں بھول سکا کہ اس سے قبل ڈینا کے ہاں جو پلے پیدا ہوئے تھے انہیں میں نے اپنے تجربات کی نذر کردیا تھا۔ اب سلیگ کو یقیناً یہی اندیشہ تھا کہ کہیں ان پلوں کا بھی یہی حشر نہ ہو! بہرحال ابھی ان پلوں پر تجربات کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ان میں کچھ اور جسمانی قوت پیدا ہوجائے تبھی میں ان پر اپنے تجربات کروں گا۔ کیونکہ انہیں تجربات میں تکلیف برداشت کرنا ہوگا.....''

پروفیسر اپنے کیبن میں بیٹھا نوٹس لکھ رہا تھا اور ادھر باڑے میں کتیا ڈینا ماممتا بھری نگاہوں سے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دیکھ رہی تھی اور انہیں زبان سے چاٹ رہی تھی۔ سلیگ کسی چوکنے پہریدار کی طرح دروازے پر کھڑا تھا جیسے اسے کسی کے آنے اور اس کی اولاد کو نقصان پہنچانے کا خطرہ محسوس ہورہا ہو اور وہ پوری مدافعت کرنے کا عزم رکھتا ہو۔

پروفیسر نے نوٹس لکھنے کے بعد کاپی میز پر رکھ دی اور لیبارٹری میں چلا گیا۔ آج وہاں اسے کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن وہاں جاکر اسے عجیب سی خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ وہاں ایک حصے میں بے شمار کاپیاں موجود تھیں۔ جن میں پوری تفصیل سے تمام تجربات و تحقیقات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ خاص طور پر اس نے ان دو کتوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ جو تجربات کے آخری مرحلے پر آکر جان دے بیٹھے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کے سر بھی ڈینا اور سلیگ کی طرح غیر معمولی طور پر بڑی جسامت کے ہوتے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے وہ ایک مرتبہ پھر باڑے میں جا پہنچا۔ جب وہ پلوں کو دیکھ رہا تھا تو سلیگ باڑے کے دروازے پر کھڑا اس پر کڑی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ واپسی پر پروفیسر نے اپنا ایک ہاتھ اوور کوٹ کے اندر یوں چھپالیا جیسے کوئی چیز سلیگ سے چھپانا چاہ رہا ہو۔ سلیگ یہ دیکھتے ہی غرا کر اٹھ پڑا۔ وہ پروفیسر کے اور دروازے کے درمیان حائل ہوگیا۔

پروفیسر نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''لے احمق! دیکھ میں کچھ بھی لے کر نہیں جارہا۔''

لیکن سلیگ اب بھی غیر یقینی انداز میں اسے دیکھتا رہا اور عجیب آواز میں غراتا رہا، پھر پروفیسر کو باڑے کے اندر سے ڈینا کی غراہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد سلیگ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ پروفیسر کے باہر نکلتے ہی سلیگ دوبارہ پہریدار کی طرح دروازے پر ڈٹ گیا۔

پروفیسر نے باڑے کے باہر تاروں کے درمیان سے اسے دیکھ کر کہا۔ ''بڑے چالاک ہو تم سلیگ! تم جانتے ہو کہ میں تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تم میرے کامیاب تجربات میں شامل ہو لیکن یہ نہ سوچنا کہ تم میری حکم عدولی کرسکتے ہو یا میرے تجربات کی راہ میں حائل ہوسکتے ہو! اگر ایسا ہوا تو میں کسی اور عام کتے میں تم جیسی خصوصیات پیدا کرکے اپنا تجربہ مکمل کرلوں گا اور تمہیں ہلاک کردوں گا۔''

کیبن میں پہنچ کر اس کا موڈ ٹھیک ہوگیا اور اس نے آج کے واقعے کے بارے میں اپنی کاپی میں تفصیل سے لکھنا شروع کردیا۔

''ڈینا اور سلیگ آپس میں کسی طریقے سے ضرور اپنا مطلب بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واضح الفاظ کے ذریعے تو نہیں کیونکہ باقاعدہ الفاظ کی تشکیل اور قوت نطق تو ان میں آئندہ کئی نسلوں کے بعد ہی پیدا کی جاسکے گی لیکن اب بھی وہ ایک مخصوص قسم کی غراہٹ سے ایک دوسرے پر اپنا مافی الضمیر واضح کرلیتے ہیں۔ مجھے یہ اس طرح معلوم ہوا کہ آج میں نے اپنی ایک حرکت سے سلیگ کو اس شبہے میں مبتلا کردیا کہ میں اپنے اوور کوٹ میں اس کا ایک پلا چھپا کر باہر نکل رہا ہوں۔ وہ دروازے پر ڈٹ گیا۔ مجھے راستہ دینے پر وہ تیار ہی نہیں تھا۔ لیکن جونہی اندر سے ڈینا کی غراہٹ سنائی دی، سلیگ نے فوراً میرا راستہ چھوڑ دیا۔ گویا ڈینا نے اسے مطمئن کردیا تھا۔

اگر مجھے عوام کے ردعمل کا ڈر نہ ہوتا اور اس میدان میں اپنے حریفوں کی احمقانہ تقلید کا خدشہ نہ ہوتا تو میں ان

کتوں کی ان مخصوص آوازوں کی تفصیلی تحقیق و مشاہدے کے لئے کسی اور سائنسدان کو اپنے معاون کے طور پر رکھ لیتا لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ارتقائی عمل کے تجزیے سے ہمیں انسان کی قوت نطق کا پتا بھی چل سکتا ہے۔"

اس روز برف باری بہت شدید ہوئی اور طوفانی ہوائیں چلتی رہیں کیبن کے اندر بھی سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ پروفیسر کا اندازہ تھا کہ باہر کا ٹمپریچر نقطہ انجماد سے بھی کم از کم چالیس درجہ کم ہو چکا ہوگا۔ لیکن اس نے تھرما میٹر باہر لے جا کر اس کا ٹمپریچر دیکھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا! وہ کوئی معمولی آدمی نہیں، بہت بڑا سائنسدان تھا اور تجرباتی بیالوجی میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ انسانوں اور جانوروں میں مصنوعی طور پر مستقل تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں تجربات کر رہا تھا۔ کتوں میں انسانوں جیسا شعور و ادراک پیدا کرنا بھی اسی وسیع تر تجربے کا ایک حصہ تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر نے ایک کتاب "بیالوجی کے ممکنہ فوائد اور انسانیت" بھی تحریر کی تھی جس میں اس نے اپنے تجربات اور مفروضات تفصیل سے تحریر کئے تھے۔

پروفیسر کا خیال تھا کہ موجودہ تجربات اس کے مفروضات کو سچ ثابت کرنے میں معاون ہو کر دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنیں گے۔ پروفیسر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی کتاب کو سائنسدان کے وسیع حلقے میں صرف "احمقانہ مفروضات" کہہ کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ لیکن اسے یقین کامل تھا کہ کتوں پر تجربات کر کے اس نے جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس کی خبر جب سائنسی حلقوں تک پہنچے گی تو ایک تہلکہ مچ جائے گی۔ دنیا اسے ایک عظیم سائنسدان ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ اسی لئے ان تجربات کے معاملے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔

اس شدت کی برف باری میں بھی وہ روزانہ کیبن سے نکل کر کتوں کے باڑے میں جا کر انہیں خوراک دیتا اور ان کی حرکات کا بغور جائزہ لیتا تھا۔ وہ ان کے نوزائیدہ پلوں کی بتدریج بلوغت کا مشاہدہ بھی کرتا تھا اور واپسی پر اپنے تاثرات کو تفصیل کے ساتھ ڈائری میں قلمبند بھی کر لیا کرتا تھا۔

پروفیسر کے تجربات کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے معمول کو بے ہوش کر کے آپریشن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے تجربات کی کامیابی کا دارومدار ہی اس بات پر تھا کہ اپنے معمول کو بے ہوش کئے بغیر اسے ہوش و حواس میں رکھ کر اس پر تجرباتی آپریشن کئے جائیں۔ وہ ان دنوں بڑی بے چینی سے پلوں میں اتنی جسمانی طاقت پیدا ہونے کا منتظر تھا کہ ان میں آپریشن ٹیبل کی تکالیف سہنے کے لئے قوت برداشت پیدا ہو جائے۔ یہ انتظار خاصا صبر آزما تھا۔ کیونکہ پروفیسر ڈاٹل جلد از جلد دنیا کا واحد سائنسدان بننا چاہتا تھا جس نے ایک بالکل نئے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"انسان میں ذہانت کی موجودگی کی وجہ اس کی کھوپڑی کی اصل شکل برقرار رکھنے کی اہلیت ہے۔ باقی تمام جانوروں کی پیدائش سے پہلے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی بھی انسانی کھوپڑی سے خاصی مشابہت رکھتی ہے اور اگر وہ اسی حالت میں پیدا ہوں تو وہ بھی ذہین اور دماغی صلاحیتوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔ ان میں اور انسانوں میں شاید بہت کم فرق رہ جائے لیکن پیدائش سے پہلے کسی نامعلوم وجہ سے کسی نہ کسی مرحلے پر ان کی کھوپڑی کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ جس سے ان کی دماغی صلاحیتیں وہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ میں اسی لئے بالغ جانوروں پر اپنے تجربات نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی کھوپڑی کی ہیئت انہیں بالکل ناکارہ بنا چکی ہوتی ہے۔

میں ڈینا اور سلیک دونوں میں ان کی پیدائش سے پہلے ہی تجربات کر کے ان کی قبل از پیدائش کھوپڑی کی ہیئت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب یقیناً ان میں اتنی ذہانت موجود ہے جو ایک دس سالہ بچے میں ہوتی ہے اگر اب میں اسی طرح ان کے پلوں میں بھی یہ خصوصیت پیدا کر دوں تو ارتقائی عمل کے ذریعے نتائج مزید حوصلہ افزا ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد میرا پروگرام یہ ہے کہ ان کی اس خصوصیت کو صرف عارضی حد تک محدود نہ رکھوں بلکہ کسی طرح کھوپڑی کی اس ہیئت کو موروثی

دوں تاکہ ان کی آئندہ نسلوں میں ہر کتا کم از کم ڈینا اور ملک جتنی ذہانت اور سوچ بچار کی قوت کا حامل ہو۔

اس کے بعد تو شاید اسی ارتقائی عمل کو مزید بڑھانے کے بعد میں ان کی نسلوں کو ایک ایسے مرحلے تک بھی لے آنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب شکل وصورت کو چھوڑ کر یہ کتے کسی بھی دماغی معاملے میں انسانوں سے کم تر نہیں ہوں گے۔ وہ انسانوں ہی کی طرح سوچ سکیں گے اور منصوبہ بندی کر سکیں گے......"

ہر بار چند دن کے بعد پروفیسر ڈاہل کو ایک دن معمولی قسم کے کاموں میں ضائع کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ بالکل اکیلا رہتا تھا اور اسے اپنے کیبن کو گرم رکھنے کے لئے ایندھن وغیرہ خود ہی اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹے موٹے کام اسے خود ہی کرنے پڑتے تھے۔

ویسے سال میں دو مرتبہ موسم گرما کی ابتدا میں اور موسم سرما شروع ہونے سے عین پہلے الاسکا کا ایک آدمی ٹمن اس کے لئے تازہ ترین سائنسی جرائد اخبارات اور ڈبوں میں بند سامان خورد ونوش وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنی آئندہ ضروریات کی فہرست دے دیا کرتا تھا۔ ٹمن کے علاوہ بھی کبھی کبھار سال چھ ماہ میں کوئی راہگیر اس علاقے میں آ نکلتا تھا۔ لیکن پروفیسر ڈاہل اس سے اتنی سرد مہری سے ملا کرتا تھا کہ راہگیر جلد از جلد جان چھڑا کر جانے کی سوچنے لگتا تھا۔

دراصل پروفیسر ڈاہل کو عام لوگوں پر اپنی ذہنی برتری کا شدید احساس تھا۔ حتیٰ کہ وہ ٹمن سے بھی شاذ و نادر ہی سیدھے منہ بات کیا کرتا تھا۔ پروفیسر اسے اپنے کیبن میں ٹھہرنے بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ بے چارہ جب بھی آتا دریا کے کنارے خیمہ تان کر رات گزارا کرتا تھا۔ پروفیسر ڈاہل محض "چھوٹے لوگوں" سے گریزاں رہنے کی خاطر لکڑیاں کاٹنے کا کام بھی خود ہی کرتا تھا۔ اسے خاصی مقدار میں لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ سردی دور کرنے کے لئے اس خاص قسم کے کیبن میں بھی لکڑی کچھ کم نہیں جلا کرتی تھی۔

پروفیسر نے پلوں پر اپنے تجربات کا آغاز کرنے سے پہلے کئی دن تک لکڑی کاٹ کر اس کی کافی مقدار جمع کرلی کیونکہ اسے احساس تھا کہ ان تجربات کے دوران میں اسے بہت کم فراغت نصیب ہوگی لیکن جب وہ لکڑیاں کاٹ کر فارغ ہوگیا تو بھی اسے انتظار میں کچھ دن گزارنے پڑے کیونکہ اس وقت تک پلوں میں آپریشن ٹیبل پر سرجری کی تکلیف سہنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ناچار اسے انتظار ہی کرنا پڑا۔

پھر ایک اور طوفان آ گیا۔ اس سے پہلے بھی الاسکا کے اس مخصوص جغرافیائی خطے میں دن صرف تین گھنٹوں کا ہی رہ گیا تھا۔ باقی وقت تاریکی میں گزرتا تھا لیکن اب تو اس شدید برف باری اور تاریکی میں رات اور دن کا فرق ہی مٹ گیا۔ ہوا اس قدر تیز وتند تھی کہ باہر نکلنا عذاب سے کم نہیں تھا۔ دو دن میں وہ صرف دو مرتبہ باڑے تک جا کر کتوں کو خوراک دے سکا۔ تیسرے روز اس نے سوچا کہ اب مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک پلے کو لیبارٹری میں لاکر اس پر تجربات کا آغاز ہی کر دینا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ باڑے میں گیا۔

جونہی اس نے ایک پلے پر ہاتھ ڈالا تو ڈینا نے غراہٹ سے احتجاج کیا۔ پروفیسر نے نفرت سے گھور کر کہا۔ "ڈینا! یہ پلے اور تم میری مخلوق ہو۔ میں تمہیں اس دنیا میں لایا ہوں، میں تمہارے ساتھ یا ان پلوں کے ساتھ جو سلوک چاہوں کروں گا۔ اگر تم میری راہ میں حائل ہوئیں تو......" اس نے فقرہ مکمل کرنے کے بجائے بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر ریوالور نکال لیا پھر دائیں ہاتھ سے دوبارہ پلے کو اٹھانے کی کوشش کی تو ڈینا نے جھپٹ کر اس کی کلائی کو دانتوں سے پکڑلیا اور غرانے لگی تاہم اس نے کلائی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

پروفیسر کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک اعلیٰ دماغ کا پروفیسر ایک کتیا سے دب جائے۔ اس کے خوف سے اپنا اہم ترین تجربہ کرنے کا ارادہ ترک کردے یہ ناقابل تصور تھا۔

پروفیسر نے شدید غصے کے عالم میں کتیا کو شوٹ کردینا چاہا اور بایاں ہاتھ بلند کرنا چاہا لیکن پھر کسی نے اس

کی بائیں کلائی کو بھی جکڑ لیا۔ پروفیسر نے چونک کر دیکھا۔ سلیک نہ جانے کب اس کے پیچھے پیچھے باڑے کے اندر آ گیا تھا۔ شاید اس نے ڈینا کی غراہٹ کا مطلب سمجھ لیا تھا اور اب خطرے کا احساس کرتے ہی اس نے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو بھی بے بس کر دیا تھا۔

سلیک غیر معمولی جسامت اور سو پونڈ وزن کا کتا تھا۔ اس کے سر کی مناسبت سے اس میں طاقت بھی زیادہ تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں پروفیسر کی کلائی کو چیر پھاڑ دیتا لیکن اس نے صرف کلائی کو جکڑا ہوا تھا اور کسی بات کا منتظر تھا۔ اس کی خونخوار آنکھیں پروفیسر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ادھر ڈینا پروفیسر کی دوسری کلائی پکڑے ہوئے تھی۔ وہ دونوں غراہٹ کی مخصوص زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پروفیسر ڈائل کا غصہ اب حیرت اور خوف میں بدل چکا تھا۔ وہ اس وقت انسانی آبادی سے دور بہت دور صرف دو کتوں کے آگے بے بس تھا۔

"سلیک، ڈینا! میری کلائیاں چھوڑ دو!" اس نے تندی سے کہا۔

ڈینا یوں غرائی جیسے اس نے پروفیسر کی بات سمجھ لی اور سلیک سے کچھ کہا ہو۔ سلیک نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور پھر اس نے جبڑوں کی ایک جنبش سے پروفیسر کے ریوالور والے ہاتھ کو جھٹکا دیا جس سے ریوالور پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر سلیک کے پاس زمین پر گر گیا۔ پروفیسر ڈائل ریوالور چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ سلیک کے جھٹکے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ دونوں کتے اس کے دونوں ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ کر بازوؤں سے جدا کر دیتے اور وہ اس حالت میں تو اس برفانی خطے میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے ریوالور چھوڑتے وقت غصے، نفرت اور بے بسی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی تو ان کتوں میں ذہانت اور شعور پیدا کیا تھا۔ ایک لحاظ سے وہ اسی کی تخلوق تھے لیکن تھے تو وہ جانور ہی، ان کی یہ جرأت کہ اسی کو قابو میں کرلیں! اس سے نفرت کا کھلا اظہار کریں شاید وہ پاگل ہی ہو جاتا مگر جان کے خوف نے اسے ہوش میں رکھا۔ ریوالور کے گرتے ہی سلیک نے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی اور ریوالور کو جبڑوں میں دبا کر باڑے کے ایک طرف چلا گیا تھا۔ پھر ڈینا نے بھی اس کی کلائی چھوڑ دی گویا اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب کلائی چھوڑ دینے پر بھی پروفیسر انہیں یا ان کے نوزائیدہ پلوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پروفیسر وہاں سے تیز تیز چلتا ہوا اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ اس کے غیض و غضب کا یہ عالم تھا کہ ایک گھنٹے تک تو وہ اس واقعے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکا پھر اس نے اپنے آئندہ لائحہ عمل کو مرتب کیا اور اپنی نوٹ بک اٹھا کر اس میں آج کے واقعے کے بارے میں یادداشت لکھنے لگا۔

"سلیک اور ڈینا اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ان دونوں کو جنسی ملاپ کی اجازت اس لئے دی تھی کہ ان کے پلوں کو اپنے تجربات کے لئے استعمال میں لاؤں انہیں یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ہاں پلوں کا جوڑا جو پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھا اسے بھی میں نے اپنے تجربات میں استعمال کر لیا تھا اور وہ سب بھی مر گئے تھے۔ غالباً وہ اس مرتبہ اسی لئے واضح طور پر تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ میں ان کے پلوں کو کسی صورت میں بھی استعمال نہ کر سکوں ستم ظریفی کی انتہا ہی تو ہے کہ ان میں یہ سمجھ اور فہم میری ہی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں ہی ان کی شعوری صلاحیتوں کا خالق ہوں۔ آج ان کی یہ صلاحیتیں خود میرے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہیں لیکن ان کی اس گستاخی اور بدتمیزی کے باوجود میں نے سوچا ہے کہ سلیک اور ڈینا کو ہلاک نہ کیا جائے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے آئندہ تجربات کی کامیابی پر اگر کوئی پلا زندہ ہے تو ان کی نگہداشت کے لئے سلیک اور ڈینا کا وجود ضروری ہوگا۔ تاہم میں ان کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا ارادہ تو کر ہی چکا ہوں۔

آج انہوں نے جس انداز میں مجھ سے ٹکر لی ہے اور وقتی طور پر مجھے نیچا دکھایا ہے آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اب میں ان کی خوراک میں ایک ایسی دوا ملانے والا ہوں جس سے وہ وقتی طور پر بے ہوش

ہوجائیں اور پھر میں ان پر کوئی اس طرح آپریشن کروں گا کہ آئندہ وہ کبھی بھی میرے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بن پائیں یہ آپریشن کرنے سے قبل بھی مجھے اچھی طرح سوچنا ہوگا کہ ان کا آپریشن کس نوعیت کا کیا جائے جس سے وہ مجھے نقصان پہنچانے کے قابل تو نہ رہیں مگر اپنے پلوں کی دیکھ بھال کے قابل ضرور رہیں اور تھوڑا بہت چل پھر بھی سکیں۔"

طوفان کے شوروغل میں سلیگ اور ڈینا اسی طرح غراہٹ آمیز آوازیں نکال نکال کر آپس میں کچھ کہہ سن رہے تھے پھر سلیگ نے ریوالور کو پنجوں میں اٹھایا اور ایک جگہ سے سخت برف کھود کر اسے خوب گہرے گڑھے میں دبا کر اوپر سے برف ڈال دی۔ برف باری کے سبب فوراً ہی اس کے باڑے تک آنے جانے کے نشانات بھی معدوم ہوگئے۔ اب کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس نے ریوالور کو کہاں چھپایا ہے! پھر اس نے ڈینا کے پاس پہنچ کر اسی مخصوص انداز میں غرا کر کچھ کہا۔ ڈینا بے چینی سے پہلو بدل بدل کر اپنے پلوں کو دیکھنے لگی۔ سلیگ پہلے سے تیز آواز میں غرانے لگا جیسے ڈینا کو کوئی حکم دے رہا ہو۔

آخر ڈینا نے بڑی نرمی سے اپنے ایک پلے کو دانتوں میں پکڑا اور سلیگ نے اسی طرح دوسرے پلے کو اٹھالیا۔ وہ دونوں برف باری میں باہر کی طرف چل دیئے۔ جہاں خاردار تاروں کے قریب برف کی سطح پہلے سے اونچی ہوگئی تھی۔

اگلے روز جب عارضی طور پر طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور سورج کی کمزور کرنیں برفانی وسعتوں پر پھیلیں تو پروفیسر ڈائل حسب معمول ان کے لئے خوراک لے کر باڑے میں پہنچا۔ آج پروفیسر نے خوراک میں وہ دوا بھی ملائی ہوئی تھی جو ڈینا اور سلیگ کو فوری طور پر بے ہوش کرکے انہیں آپریشن کے لئے تیار کردیتی۔ لیکن اس کے بار بار پکارنے کے باوجود کوئی بھی خاردار تاروں کے جنگلے سے باہر نہ آیا۔ اس نے خوراک کا برتن وہیں رکھا اور کیبن سے اپنی رائفل لے کر واپس باڑے میں آیا۔ وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ تالا کھول کر وہ اطمینان سے اس حصے کی جانب بڑھا جدھر اس کے خیال میں ڈینا اور سلیگ سردی اور طوفان سے بچ کر آرام کررہے تھے لیکن باڑہ خالی پڑا تھا۔

سلیگ اور ڈینا اپنے دونوں بچوں سمیت وہاں سے جاچکے تھے۔ پروفیسر ڈائل کو غصے کے ساتھ ساتھ شدید صدمہ بھی ہوا کیونکہ انہی کتوں پر تو اس کی زندگی بھر کے تجربات کا دارو مدار تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کیبن میں چلا گیا اور پھر مناسب لباس اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔ وہ جلد از جلد کتوں کو تلاش کرلینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اور اب تو سلیگ کو ان کے لئے خوراک کا بھی انتظام کرنا تھا۔

پروفیسر کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد انہیں تلاش کرلے گا۔ اس نے سوچا کہ اب اگر دونوں بڑے کتوں کو ہلاک ہی کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے پروفیسر سے ٹکر لینے کی حماقت کی تھی۔ چند لمحے بعد ہی اس نے سوچا کہ نہیں انہیں ہلاک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں زخمی کرکے پکڑ لینا ہی کافی رہے گا یا اگر وہ کسی ایسے وقت ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جائے، جب وہ دونوں وہاں موجود نہ ہوں۔ خوراک وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے نکلے ہوئے ہوں تو وہ چپکے سے ان کے پلوں کو اٹھا کر اپنی لیبارٹری میں لے جائے گا۔ اس صورت میں سلیگ اور ڈینا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ اپنی ذہانت کی بدولت وہ اسے پلوں پر قابض دیکھ کر ان کی زندگی کی خاطر پروفیسر کے سامنے سر تسلیم خم کردیں گے۔ پروفیسر تمام دن ان کی تلاش میں ناکام پھرتا رہا۔ اس کا یہ اندازہ غلط نکلا تھا کہ وہ انہیں بہت جلد ڈھونڈ نکالے گا۔

اگلے روز وہ دوبارہ اسی مہم پر نکلا اور اس کی تلاش بے سود ثابت نہیں ہوئی۔ برف پر سلیگ کے قدموں کے نشانات نظر آئے جو بہت آگے تک جانے کے بعد ایک اور راستے سے دوبارہ واپس آرہے تھے۔

پروفیسر کو یقین ہوگیا کہ اب وہ ان کی پناہ گاہ کے قریب آپہنچا ہے۔ وہ ان نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیا لیکن ایک دم اسے اپنے عقب میں ایک تیز غراہٹ سنائی

دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا بہت دور اسے سلیگ نظر آ گیا لیکن سلیگ اس کے وجود سے بے خبر نظر آتا تھا۔ اور اپنی ہی دھن میں غراتا ہوا کہیں جارہا تھا۔ پروفیسر نے ان نشانات کے سراغ میں چلنا چھوڑ دیا اور چپکے سے سلیگ کے پیچھے چل دیا۔ ان کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ سلیگ کو گولی مار کر ہلاک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ویسے بھی پروفیسر ڈاٹل اسے ہلاک کرنے کے بجائے اس کا پیچھا کر کے اس پناہ گاہ تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں ڈینا اور پلے چھپے ہوئے تھے۔ وہ اسی لئے سلیگ کے قدموں کے تازہ نشانات پر چلنے لگا۔ سلیگ خاصی دور پہنچ چکا تھا۔ اب تو وہ نظر بھی نہیں آرہا تھا مگر پروفیسر کو اطمینان تھا کہ وہ اس کے قدموں کے نشانات پر چلتے چلتے اس تک پہنچ ہی جائے گا۔

وہ بات جس کا پروفیسر ڈاٹل کو علم نہیں تھا، وہ یہ تھی کہ دراصل سلیگ اسے بیچ دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ سلیگ اپنے مستقبل کے تحفظ کی خاطر یہ معلوم کرنے کے لئے اپنے آقا کے کیبن کی طرف گیا تھا کہ وہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے وہاں اس نے پروفیسر کو موجود نہیں پایا تھا۔ وہ پروفیسر کے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتا ہوا اس تک آپہنچا تھا۔ رائفل دیکھ کر اس نے پروفیسر کے قریب آنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پروفیسر تو اس کے اور ڈینا کے پاؤں کے نشانات پر چلتے چلتے ان کی پناہ گاہ کے بالکل قریب آپہنچا ہے تو اس نے غرا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی اور اب وہ اسے پیچھے لگا لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ سلیگ بار بار دوڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا تھا اور پھر پیچھے دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیتا تھا کہ پروفیسر اسی کے پیچھے آرہا ہے۔

پروفیسر کو ابتدا میں کتے کی اس دھوکے بازی کا علم نہ ہوسکا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کا پیچھا کرنے میں لگا رہا۔ کئی میل تک چلنے کے بعد جب تاریکی پھیلنے لگی تو اسے احساس ہوا کہ سلیگ اسے جل دے گیا ہے۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں اس سمت کا رخ کیا جہاں سے سلیگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہاں دو ہی فرلانگ کے فاصلے پر اسے وہ جگہ بھی مل گئی جہاں انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس جگہ کے اردگرد بے شمار پنجوں کے نشانات موجود تھے۔ یقیناً یہی ان کی پناہ گاہ تھی۔

پروفیسر ڈاٹل محتاط قدموں سے پناہ گاہ کی طرف بڑھا مگر اب وہ پناہ گاہ خالی پڑی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ جب ڈینا نے سلیگ کی غراہٹ سنی تھی تو اسے خطرے کا احساس ہوگیا تھا جس دوران میں سلیگ پروفیسر کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے تھا۔ ڈینا نے جلدی سے اپنے دونوں پلے یکے بعد دیگرے کسی اور جگہ منتقل کر دیئے تھے۔

پروفیسر کو شدید جھنجھلاہٹ ہونے لگی لیکن پھر اسے دکھائی دے گیا کہ ان کی نئی پناہ گاہ تک بھی پنجوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔ پروفیسر نے اب ان نشانات پر چلنا شروع کردیا۔ وہ ہر قیمت پر ان کا سراغ لگا لینا چاہتا تھا لیکن اس تک وود میں تاریکی زیادہ ہوگئی تھی۔ ڈاٹل کو سلیگ کی خوفناک غراہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ جیسے وہ اسے آگے بڑھنے پر خوفناک نتائج کی دھمکی دے رہا ہو۔ آخر پروفیسر ڈاٹل نے وہاں سے کیبن کی طرف واپس چلا جانا ہی مناسب سمجھا یہ کام دن کی روشنی میں ہی کرنا بہتر تھا۔ وہ محتاط انداز سے کیبن کی طرف چل دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر کہیں سلیگ اس پر حملہ نہ کردے، وہ بیحد چوکنا تھا۔ ایک کتے سے شکست کھانے پر وہ کسی طرح تیار نہیں تھا۔

کیبن تک پہنچنے کے بعد پروفیسر ڈاٹل اندر داخل نہیں ہوا بلکہ وہیں دروازے کے باہر کھڑا غور سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے متنبہ کررہی تھی کہ سلیگ اس کے کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ بہت دیر کے بعد اس نے دور سے کسی جانور کے ہیولے کو کیبن کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یقیناً وہ سلیگ ہی تھا۔ سلیگ بڑے کائیاں انداز میں چند قدم چل کر رک جاتا تھا پھر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا تھا کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا اور آگے بڑھتا تھا۔

پروفیسر ڈائل اس کے مزید قریب آنے کا منتظر تھا تا کہ سلیک رائفل کی رینج میں آجائے تو اس پر فائر کیا جائے۔ لیکن سلیک بھی بڑا کائیاں اور چوکنا ثابت ہوا۔ وہ پروفیسر کی رائفل کی رینج میں آہی نہیں رہا تھا اور پھر ایک موقع پر وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس چل دیا۔ پروفیسر نے اسے واپس جاتا دیکھ کر اس کے غیر واضح ہیولے پر ہی گولی چلادی لیکن گولی چلاتے وقت پروفیسر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ متحرک ہیولہ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

کیبن کے اندر پہنچ کر پروفیسر نے غصے اور جھلاہٹ کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک ٹھنڈے متوازن مزاج اور ہوش مند سائنس دان کی طرح اس واقعے پر خوب غور وخوض کرنے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

"اب مجھے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ سلیک اور ڈینا کی ذہانت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آج چالاک کتے سلیک نے اپنے پنجوں کے نشانات کے ذریعے مجھے خوب گمراہ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر مجھے اس راستے سے کسی طرح ہٹایا نہ گیا تو میں پندرہ منٹ بعد ان کی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد جب میں ان کی پہلی پناہ گاہ کو خالی دیکھ کر دوسری پناہ گاہ تک جانے لگا تو واضح طور پر سلیک نے مجھے اس کام سے روکا۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اگر میں آگے بڑھا تو وہ مجھ پر ضرور حملہ آور ہو جائے گا۔ جب میں کیبن میں واپس آیا تو وہ احتیاط سے میرے تعاقب میں آیا تا کہ یہ یقین کر سکے کہ میں آج رات دوبارہ اس کے پلوں تک پہنچنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا! یہاں بھی سلیک کی ذہانت کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ وہ کیبن کے نزدیک اس لئے نہیں آیا کہ کیبن کے اندر روشنی نہیں تھی اور اسے اس تاریکی میں کیبن سے قریب آتے ہوئے اپنے لئے خطرے کے وجود کا احساس تھا۔ اب تو میں اس پر فائر بھی کر چکا ہوں اس لئے اسے خطرے کا اور زیادہ احساس ہو چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی اتنی زیادہ ذہانت آئندہ میرے لئے نقصان کا باعث بنے اس لئے اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اسے اپاہج نہ کر سکا تو ہلاک ہی کر ڈالوں گا۔

کاش! وہ پلے جلدی سے میرے ہاتھ لگ جائیں تا کہ میں اپنے تجربات کا آغاز کر سکوں۔ سلیک اور ڈینا کی ذہانت دیکھتے ہوئے مجھے ان کے پلوں پر اپنے تجربات کی کامیابی کا یقین سا ہونے لگا پھر ساری دنیا کے احمق سائنسدان میری برتری اور عظمت کا اعتراف کریں گے....."

اگلی صبح پروفیسر دوبارہ ان کی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیا۔ اس رات برف نہیں پڑی تھی اس لئے ان کے پنجوں کے نشانات ابھی تک برف پر موجود تھے۔ وہ ان کی تلاش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ ان دونوں کو پنجروں میں بند کر کے لیبارٹری میں رکھے گا تا کہ وہ دونوں اپنے پلوں پر ہونے والے تمام تجربات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ بعد میں وہ ان دونوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلاکت سے پہلے وہ دونوں کم از کم یہ احساس تو کر لیں کہ آخر انسانی ذہانت وہ بھی ایک برتر انسان اور ایک عظیم سائنسدان کی ذہانت ان کی حیوانی ذہانت سے بدرجہ زیادہ اعلیٰ افضل اور برتر ہے۔ وہی ان کا آقا ہے لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا برف پر ان کے پنجوں کے نشانات دھندلے پڑتے گئے کیونکہ وہاں کی برف بہت نرم تھی۔ رفتہ رفتہ نشانات بالکل معدوم ہی ہو گئے۔ شام تک وہ بالکل ناکام ہو کر دوبارہ کیبن کی طرف جا رہا تھا۔

کیبن کے پاس پہنچتے ہی پروفیسر کو محسوس ہوا کہ سلیک پھر وہاں تک آیا تھا۔ کیبن کے آس پاس اس کے پنجوں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سلیک اس کی غیر حاضری کا یقین کر لینے کے بعد بڑی جرأت کے ساتھ دروازے کے ہینڈل کو دانتوں سے گھما کر کھول لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ خشک گوشت کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا اٹھا کر لے گیا تھا۔ کھانے پینے کی اور کئی چیزیں بھی ڈبوں میں بند وہاں موجود تھیں لیکن سلیک نے ان میں سے کوئی چیز نہیں اٹھائی

تھی کیونکہ اسے یقیناً یہ علم تھا کہ ہوا بند ڈبوں کو کھولنا اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔

پہلے تو پروفیسر ڈائل کو سلیگ کی اس حرکت پر غصہ آیا لیکن پھر جب پروفیسر کو اس کی بڑھتی ہوئی ذہانت کا خیال آیا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو۔ بھلا میرا اور ایک کتے کا کیا مقابلہ، وہ ایک جانور اور میں عام انسانوں سے کہیں زیادہ ذہین سائنسدان، اس نے اپنے اسٹور روم میں جا کر وہ آہنی پھندے نکالے جو ریچھ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ اس نے انہیں صرف کر کے صبح کا انتظار شروع کر دیا اور اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں تفصیل سے ڈائری لکھتا رہا۔ باہر ساری رات برف باری ہوتی رہی۔

ادھر سلیگ اس برف باری میں اپنی نئی پناہ گاہ کے باہر کھڑا پہرہ دے رہا تھا شاید اسے خطرہ تھا کہ کہیں پروفیسر ڈائل رات کو بھی ان کے تعاقب میں وہاں نہ آ پہنچے! یہ پناہ گاہ ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں تھی اور اس میں ڈینا مامتا کے جذبے سے سرشار ہو کر بار بار اپنے پلوں کو چوم چاٹ رہی تھی۔ اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر سے سلیگ کی ہلکی ہلکی غراہٹ کی صدا سنائی دے رہی تھی جسے سن کر وہ مطمئن ہو جاتی تھی کہ انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

چار دن تک برف باری اتنی شدت سے ہوتی رہی کہ پروفیسر ڈائل کیبن سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ تاہم اس نے موسم کی اس خرابی کو بڑے صبر سے برداشت کیا کیونکہ ایک لحاظ سے وہ اسے اپنے حق میں بھی سمجھ رہا تھا۔ اس طوفانی موسم میں یقیناً کتوں کو کوئی شکل نہ مل پایا ہوگا اور پلے بھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے نڈھال ہو چکے ہوں گے۔ پروفیسر یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ سلیگ ان کی بھوک مٹانے کی خاطر کیبن کی طرف ضرور آئے گا اور پھر وہ اس کا شکار کر لے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سلیگ نہیں آیا۔

پانچویں دن جب برف گرنی بند ہوئی تو پروفیسر نے خاص لباس اور جوتے پہنے، رائفل اٹھائی اور کیبن سے باہر آ گیا، اسے ان کی تلاش نہ ہوتی تو بھی وہ آج کیبن سے ضرور نکلتا کیونکہ اسے امید تھی کہ آج سلیگ اس کے کیبن سے خوراک حاصل کرنے ضرور آئے گا اور ان پھندوں میں سے کسی ایک میں ضرور پھنس جائے گا۔ اس نے یہ پھندے کیبن کے دروازے کے پاس اس طرح بچھا دیئے تھے کہ اندر پاؤں رکھنے والے کی ٹانگیں فوراً ان میں پھنس جائیں۔

برف پر چلتے ہوئے پروفیسر ڈائل مسکرا مسکرا کر یہی سوچ رہا تھا۔ پروفیسر کو آج بھی یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ ان کی پناہ گاہ تلاش کر سکے گا۔ اس لئے وہ اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔ وہ تو صرف واپسی کے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا تاکہ سلیگ اس کے بچھائے ہوئے پھندوں میں پھنس چکا ہو۔ اسے یقین تھا کہ سلیگ کے پھنسنے کے بعد ڈینا اسے چھڑانے کے لئے ضرور وہاں تک آئے گی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی ہوائی فائر کر دے گا اور پھر ڈینا ضرور خوفزدہ ہو کر سیدھی اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگے گی پھر وہ اس کا تعاقب کرے گا اور یوں پلے بھی اس کے ہاتھ آ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ چاہے تو ڈینا کو ہلاک بھی کر سکتا ہے اور واپسی پر سلیگ تو اس کے قبضے میں ہی ہوگا۔

لیکن اچانک پروفیسر ڈائل کو ان کی دوسری پناہ گاہ نظر آ گئی۔ یہ ستم ظریفی ہی تو تھی کہ اس سے پہلے وہ پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا اور کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ پناہ گاہ کی تلاش نہیں کر رہا تھا اور وہاں تک آ پہنچا تھا۔ کچھ دور اسے ایک گرے ہوئے درخت تک کتوں کے پنجوں کے بہت سے نشانات نظر آ رہے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ ضرور وہیں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر نے فوراً رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور آگے بڑھ کر زور زور سے آواز دی۔ ”سلیگ، ڈینا! باہر نکل آؤ۔“

اسے یقین تھا کہ وہ فوراً باہر آ جائیں گے اور اتنے دنوں کے بعد دوڑ دھوپ کا ڈراپ سین ہو جائے گا کیونکہ انسانوں کی طرح سلیگ اور ڈینا بھی رائفل چلنے کے خطرناک نتائج سے آگاہ تھے۔ اب پروفیسر اپنی فتح مندی

کے احساس سے مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ "انسان آخر انسان ہی ہے، بھلا جانور اس کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے! اس نے دوبارہ چلا کر کہا۔ "باہر نکل آؤ سلیگ اور ڈینا! نہیں تو میں وہیں آ کر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

کھوہ میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی اور پھر ڈینا غراتے ہوئے باہر نکلی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہی تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ وہ رائفل سے ڈر کر فرار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس طرح اس کے پلے پروفیسر کے قبضے میں آ جاتے۔ بھلا وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اور پروفیسر کی طرف بڑھ بھی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس صورت میں پروفیسر یقیناً اس پر گولی چلا دے گا۔ بس وہ وہاں کھڑی اسے گھورتی جا رہی تھی۔

"ہوں، اب بتاؤ قابو میں آئی ہو یا نہیں!" پروفیسر نفرت سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ سلیگ یا ڈینا اس کے الفاظ سمجھنے کی کتنی اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس سے پہلے بھی تو وہ ان سے باتیں کرتا ہی رہا تھا۔

"ڈینا اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں تمہیں فوراً شوٹ کر دوں گا۔ میں اب تمہارے اور سلیگ کے بچوں کو ساتھ لے کر کیبن میں جا رہا ہوں۔ اب مجھے ان میں ذہانت کے ساتھ ساتھ اطاعت کا جذبہ بھی پیدا کرنا پڑے گا تا کہ وہ تمہاری طرح بے وفا اور نافرمان نہ نکلیں سمجھیں!"

اب پروفیسر ڈائل آہستہ آہستہ ڈینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے کسی طرف سے بھی اپنے لئے خطرے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلیگ تو اب تک اس کے کیبن میں جا کر پھندے میں پھنس چکا ہوگا۔ اب وہ ڈینا کی دو ٹانگیں بیکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تا کہ وہ پلوں کی پرورش کے لئے زندہ رہے اس کے بعد وہ ان سب کو کیبن میں لے جانا چاہتا تھا تا کہ وہاں پہنچ کر بے بس سلیگ کے زخموں پر نمک چھڑکے اور اسے تلملانے پر مجبور کرے۔ سلیگ کو تو وہ ہلاک ہی کر دینا چاہتا تھا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

پروفیسر نے رائفل کی نال کا رخ ڈینا کی طرف کر دیا۔ ڈینا کے حلق سے شدید غصے اور نفرت کی غراہٹ بلند ہوئی پھر اچانک کوئی بھاری بھرکم شے پروفیسر ڈائل پر اتنے زور سے آ پڑی کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سلیگ اس کے عقب سے پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کے پنجوں میں پروفیسر کے اوور کوٹ کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

رائفل پروفیسر کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب ڈینا بھی اس پر حملہ آور ہوگی۔ مگر پھر یہ دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کہ ڈینا اور سلیگ دونوں اسے چھوڑ کر اس کی رائفل کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ سلیگ نے رائفل چھوڑ دی جو ڈینا کے جبڑوں میں دبی ہوئی تھی۔ سلیگ اپنی زبان میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ڈینا اس کا مطلب سمجھ کر رائفل کو گھسیٹ کر بہت دور لے جا رہی تھی۔ اور سلیگ اب اس کھوہ کے باہر کھڑا تھا۔ جہاں سے پلوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے پروفیسر کو گھور رہا تھا۔ اس کے تیور بے حد خطرناک تھے۔

پروفیسر نے چپ چاپ وہاں سے کھسکنا چاہا۔ اس حالت میں ان کے مقابلے کا خیال بھی حماقت سے کم نہ ہوتا۔ پروفیسر نے بھاگ نکلنا چاہا لیکن اب ڈینا رائفل کو کہیں دور چھوڑ کر واپس آ گئی تھی اور وہ سلیگ سے بھی زیادہ برہم نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ آخر وہ ماں تھی اور اس شخص نے اس کی اولاد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی تھی۔ اب وہ اس پر حملہ آور ہونے کے لئے لپکی۔ پروفیسر ڈائل نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور پھر اس کے حملے سے بچنے کے لئے بھاگا۔

وہ حیرت انگیز پھرتی سے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ ڈینا غراتی ہوئی اس درخت کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ وہ درخت پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ ورنہ اب تک اس نے پروفیسر کی تکا بوٹی کر ڈالی ہوتی۔ اب وہ دونوں پروفیسر سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نہیں تھے۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ غیر مسلح ہونے کے بعد وہ ان کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا۔

پروفیسر ڈائل کی انا کو شدید ترین ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ

پروفیسر بی ایچ ڈائل بریڈک یونیورسٹی کا مانا ہوا سائنسدان ایک عظیم اور برتر انسان، جو دوسرے انسانوں سے بھی مات نہیں کھاتا تھا، آج دو حقیر کتوں نے اسے بے بس کردیا تھا۔ کتے بھی وہ جن میں ذہانت اورشعور خود اس کی تجربات کے ذریعے پیدا ہوئی تھی لیکن وہ انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ انتظار اس بات کا کہ اب وہ دوبارہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں چل دیں گے پھر وہ درخت سے اتر کر کیبن میں چلا جائے گا۔ لیکن کتوں کا ارادہ وہاں سے ٹلنے کا نہیں آتا تھا۔ بھلا اب انہیں اس جگہ پر کیا خطرہ درپیش تھا کہ وہ کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلیں، پروفیسر ڈائل تو بے بس انداز میں درخت پر چڑھا ہوا تھا۔

چنانچہ پروفیسر ان کے وہاں سے ٹلنے کا انتظار کرتا رہا۔ سردی میں بھی شدت پیدا ہوگئی اور پھر برف باری شروع ہوگئی، اسے اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہورہا تھا، اور چار دہکتی ہوئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ پروفیسر ڈائل نے سلیک اور ڈینا کے درمیان غراہٹوں کا تبادلہ محسوس کیا۔ برف باری اب تھم چکی تھی۔ پروفیسر نے سوچا کہ یقیناً ان دونوں نے اسی کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا ہے۔ اس نے دونوں کے ہیولوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں اسے اونگھتے نظر آئے پھر جیسے وہ اپنے گلے پر سر رکھ کر سو گئے۔

پروفیسر کے کانپتے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ وہ بہت احتیاط اور خاموشی کے ساتھ پیڑ سے نیچے اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب انسان اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہوتو یوں بھی اس کی قوت دوچند ہوجاتی ہے۔ پروفیسر انتہائی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کیبن کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن اس کے حواس پر کتوں کا خطرہ بھی مسلط تھا۔ ابھی اس نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اسے احساس ہوا جیسے دبے پاؤں کوئی اس کا تعاقب کررہا ہو۔ اس برفانی ویرانے میں اس کا تعاقب صرف سلیک یا ڈینا ہی کرسکتے تھے۔

پروفیسر کے تمام جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ غالباً سلیک اور ڈینا بیدار ہوگئے تھے اور پروفیسر کو درخت پر نہ پاکر اس کی تلاش میں روانہ ہوگئے تھے۔ اب وہ پروفیسر کو ڈھونڈ چکے تھے اور کسی بھی لمحے اس پر حملہ آور ہوسکتے تھے۔

پروفیسر کے اندازے کے مطابق اب کیبن زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اسے کیبن کا ہیولہ نظر آنے لگا تھا اگر وہ اپنے جسم کی پوری قوت وطاقت صرف کرکے ایک دم دوڑ لگادے تو ان خونخوار کتوں کے حملے سے محفوظ ہوسکتا تھا۔ کیبن میں پہنچ جانے کے بعد کتے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

پروفیسر ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے تیز غراہٹیں سنائی دیں۔ یقیناً کتے اس پر حملہ کرنے والے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پوری قوت سے کیبن کی طرف دوڑ پڑا۔

پروفیسر بھاگتا ہوا کیبن کے دروازے میں داخل ہوا اور اسی وقت اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ وہ منہ کے بل ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ پھر اس کی گردن شکنجے میں پھنس گئی تھی۔

سلیک اور ڈینا جب کیبن کے دروازے پر پہنچے پروفیسر دم توڑ چکا تھا۔ سلیک نے غرا کر ڈینا سے کچھ کہا اور دونوں ہی کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ سلیک کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔

پروفیسر شکنجے لگاتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ سلیک شکنجوں کو دیکھ رہا ہے اور ان کے استعمال سے بھی واقف ہے۔ جب پروفیسر ان کی تلاش میں بھٹک رہا تھا تو سلیک کیبن تک آکر شکنجوں کو دیکھ چکا تھا اور کیبن میں داخل ہوئے بغیر واپس ہوگیا تھا۔ سلیک اور ڈینا نے دانستہ طور پر پروفیسر کو فرار کا موقع دیا تھا تاکہ پروفیسر کیبن کی طرف روانہ ہوجائے اور وہ دونوں راستے میں اسے اتنا بدحواس کردیں کہ پروفیسر کو ان شکنجوں کا خیال ہی نہ آئے جو اس نے کیبن کے دروازے سے لگا کر رکھ دیئے تھے۔



میں خوف سے چیخا۔اور قریب پڑے ہوئے گندگی کے ڈرم سے جاٹکرایا مگر پھر میں تیزی سے اٹھا، میری ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ میں جیسے تیسے کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ موت کے خوف نے میرے اندر طاقت بھر دی تھی۔ گرم گرم لمس اب بھی محسوس ہورہا تھا۔ میرا دل گیند کی مانند اچھلنے لگا۔ موت کا خوف پوری طرح میرے اعصاب پر سوار تھا۔ جلد ہی میں فلیٹ میں آ گیا ۔تیزی سے دروازہ کھولا اور پھر اسی تیزی سے بند کردیا، میں نے جلدی سے فریج سے پانی کی بوتل نکالی، میرا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ پوری بوتل ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اس سے کچھ فرق محسوس ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کمرے کے اندر سے کسی کے سانس لینے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ان آوازوں میں تیزی آ گئی، غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ہوا کی سرسراہٹ ہے۔ جو دم بدم بڑھتی جارہی ہے۔ کھڑکی کے پردے پھڑ پھڑانے لگے۔ میں نے تیزی سے کھڑکیاں بند کردیں۔ ہوا کا راستہ بند ہوگیا ۔میں نے سکھ کا سانس لیا جیب سے نوٹ بک نکالی۔ میز پر رکھ دی۔ میرا سکون عارضی ثابت ہوا۔

اچانک نوٹ بک کی پشت پر وہی تصویر ابھری۔ دیوتا ڈمبالا کی تصویر جو سیاہ فام جنگلیوں کے گلے میں ہوتی تھی۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اچانک مجھے گردن پر وہی گرم لمس محسوس ہوا۔ اور ناک میں تیز بدبو سی آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے واضح طور پر کمرے میں کسی کا وجود محسوس ہوا۔

اچانک کمرے کی تمام لائٹس بجھ گئیں۔ دھندلی تاریکی میں مجھے ایک خوف ناک چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مسخ شدہ چہرہ ہو بہو دیوتا ڈمبالا کی طرح تھا۔ یہ محض ایک تصویر نہیں بلکہ حقیقی چہرہ تھا۔ پراسرار دیوتا ڈمبالا جو کہ پورے غیض و غضب کے عالم میں پورے وجود کے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ اس کے اردگرد کئی سائے رقص کرتے نظر آرہے تھے۔ ان کا کوئی وجود نہیں تھا وہ بس سائے ہی تھے۔ مجھے اچانک کانوں میں وہی طلسمی موسیقی سنائی دینے لگی اور باہر سے شدید طوفان کا شور بھی۔

دیوتا میرے قریب آ گیا۔ خوف سے میرا جسم پتھر کا بن گیا۔ میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ دیوتا کا خوف ناک چہرہ لحہ بہ لحہ میرے قریب ہوتا چلا گیا۔ شدید بدبو کے بھبکے اس کے وجود سے اٹھ رہے تھے جن سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ مگر میں بت بنا ہوا تھا۔ مجھ میں ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ پھیل چکے تھے، ان ہونٹوں کے درمیان جھانکتے ہوئے دانت اس کی خوف ناکی میں مزید اضافہ کررہے تھے۔

اچانک دو بازو جو پنجوں کے مانند تھے میری جانب بڑھے۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ خوف نے میرے بدن سے طاقت چھین لی۔ دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ بدبو میری برداشت سے باہر ہونے لگی۔ میں نے آخری بار بھاگنے کے لئے اٹھنا چاہا مگر مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے باندھ دیا ہو۔ اچانک اس کی انگلیوں کے بڑے اور تیز ناخن میری گردن میں پیوست ہوگئے تو ایک فلک شگاف بھیانک چیخ میرے منہ سے نکلی۔

موت مجھ سے بغل گیر ہورہی تھی کہ اچانک میرا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا، اور میرا ہاتھ سامنے کی طرف آ کر وہ چیز ڈمبالا کے وجود سے ٹکرائی، پھر اسی دوران ایک کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "خبردار جو آئندہ یہ دھن بجائی......تو......" اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا، میرے ہاتھ میں وہ سخت چیز "مقدس صلیب" تھی۔ وہ صلیب میرے بستر پر پہلے سے پڑی تھی جو کہ نزع کے وقت اچانک میرے ہاتھ لگ گئی تھی، میری زندگی ابھی باقی تھی۔ ڈمبالا اس صلیب کی طاقت سے مجھے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کے بعد آئندہ کبھی میں نے اس دھن کے متعلق سوچا بھی نہیں لیکن آج بھی کبھی مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے تو دل پر خوف سا طاری ہوجاتا ہے۔



خونی کراسنگ

ایس امتیاز احمد۔کراچی

رات کی تاریکی میں چنگھاڑتی اور دھواں اڑاتی ہوئی ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے آرہی تھی کہ سگنل کے پاس پہنچتے ہی ایک زور دار دھماکے سے الٹ گئی، چشم دید فائرمین کا بیان تھا کہ ایک زخمی عورت نے انجن کو اپنے دونوں ھاتھوں سے پکڑ کر الٹ دیا۔

ایک نادیدہ قوت کی انتقام کی ایک لرزہ خیز داستان حیرت جوکہ خوف سے پر ہے

"سگنل مین" ایک آواز سنائی دی تو۔ میں کھڑکی کی طرف لپکا لیکن ٹھہریے پہلے میں کچھ اپنے بارے میں بتاتا چلوں ۔ میں عرصہ بیس سال سے ریلوے کے محکمے میں ملازم ہوں۔ یہ ملازمت مجھے وراثت میں ملی ہے۔ یعنی میرے باپ کی وفات کے بعد مجھے اس ملازمت میں بھرتی کرلیا گیا۔ عرصہ بیس سال سے محکمے والوں کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوئی۔ میری اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر محکمے والوں نے مجھے انعامی سرٹیفکیٹ بھی دیئے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ میری تقرری ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہوئی تھی اور آج تک اسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ہوں۔ افسران اعلیٰ نے کبھی میرے ٹرانسفر کی کوشش نہیں کی۔

اور نہ ہی میں نے کبھی اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔ اکثر لوگ

میرے اس کام کو "بور" خیال کرتے ہیں۔ لیکن مجھے کبھی بوریت محسوس نہیں ہوئی۔

بچپن میں بھی میں اپنے دوستوں میں تنہائی پسند کے نام سے مشہور تھا۔ میں شوروغل کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ تنہائی خاموشی میری جان ہیں۔ اب اکثر میں سوچا کرتا ہوں کہ ریٹائر ہونے کے بعد میں کیا کروں گا۔ ایسا سکون اور قرار تو مجھے کہیں نہ ملے گا۔ شہروں کی ہنگامہ خیز اور دھواں دار زندگی تو میری زندگی اجیرن کردے گی۔

میں جس اسٹیشن پر ڈیوٹی دیتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ یہاں پر گاڑیاں اسٹاپ نہیں کرتیں البتہ جب گاڑی گزرتی ہے تو اسپیڈ کم کرنے کی بجائے ڈرائیور رفتار میں اضافہ کردیتا ہے۔ گاڑی کے وقت پر میں بالکونی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جب گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی گزرتی ہے تو مسافروں کے دھندلے چہرے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ نظر آتے ہیں وہ میری نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔

"سگنل مین" آواز پھر آئی تو میں کھڑکی کی طرف لپکا۔ سرد ہوا کا جھونکا میرے چہرے اور جسم سے ٹکراتا ہوا کمرے کی فضا کو سرد کرگیا۔ میں نے علامتی بتی کی روشنی میں باہر کا جائزہ لیا، دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نہ تھا۔ تیز ہوا کی سیٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جھٹ کھڑکی بند کردی۔

ہاں تو! میں اپنے متعلق بتارہا تھا۔ مسافروں کے چہروں کو دیکھ کر میرے دل میں یہاں سے فرار ہونے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی۔

ارے ہاں! ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گیا! کرسٹین! جسے میں پیار سے کرسٹی کہا کرتا تھا۔ ہم دونوں کا بچپن ایک ساتھ گذرا۔ ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ اکٹھے کھیلتے اور اکٹھے اسکول پڑھنے جاتے۔ اکثر اوقات کھانا بھی اکٹھا ہی کھاتے۔ کرسٹی کی ماں مجھے پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھتی تھی۔ جانے اسے مجھ میں کیا برائی نظر آتی جو وہ میری دشمن بن بیٹھی۔ وہ کرسٹی کو مجھ سے ملنے سے منع کرتی۔ اس کے باوجود ہم چوری چھپے مل لیا کرتے اور

پھر ایک دن کرسٹی کی ماں کا انتقال ہوگیا۔

میں اس دن بہت مسرور تھا۔ کیونکہ مجھے اس بڑھیا سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ جب کرسٹی میرے پاس آنسو بہاتی ہوئی آئی تو میں نے اسے بجائے تسلی دینے کے خوش ہونے کو کہا۔ پھر میں نے اپنی منطق جھاڑنا شروع کی۔

آج بھی جب میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے میں اور کرسٹی تقریباً ایک جیسے حالات کا شکار تھے۔ ہم دونوں کے مزاجوں میں خاصی یکسانیت تھی۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ تنہائی اور خاموشی سے بھاگتی تھی۔ اور میں ان سے پیار کرتا تھا۔ خدا کی مرضی دیکھئے ہمارے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوا۔

اب میں اور کرسٹی جوانی کی منزل کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ ایسی عمر میں دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں اور انسان کسی ساتھی کا متلاشی ہوتا ہے جو اس کا ہم خیال بن کر زندگی کا ہم سفر بن سکے۔ کرسٹی اور میں نے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ان دنوں میں ملازمت میں تھا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں جس اسٹیشن پر تعینات تھا۔ اس کے قرب وجوار میں دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ دراصل یہ اسٹیشن ایک دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ چونکہ یہاں گاڑی رکتی نہیں تھی۔ اس لئے بھیڑ بھاڑ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ اسٹیشن صرف پل کی وجہ سے تعمیر کیا گیا تھا۔

پچھلے چند مہینوں سے محکمے کی طرف سے ایک سروے کمیٹی نے پل کا معائنہ کیا تھا اور اسے مخدوش قرار دے کر گرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر ابھی تک اس تجویز پر عمل نہیں ہوا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ یہ پل گرایا نہ جائے۔ جانے کیوں میں ایسی خواہش کرتا تھا۔

ایک دن گاؤں کے چرچ میں میں نے اور کرسٹی نے بڑے پادری کے سامنے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ بڑے پادری نے ہمیں دعائیں دیں۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بناؤں۔ ایسا گھر جس میں میرے علاوہ کرسٹی اور چند پھول سے بچے ہوں۔

محکمے والوں نے میری درخواست پر سگنل ٹاور کے نزدیک ہی ایک کوارٹر تعمیر کرادیا۔ میں کرسٹی کو لے کر یہاں چلا آیا۔ کرسٹی کی جدائی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔

کچھ دن بڑے سکون سے گزرے اور پھر میں نے کرسٹی کے مزاج میں چڑچڑاپن محسوس کرنے لگا۔ اس کی وجہ شاید تنہائی تھی۔ میں نے اس کا دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ ہر بات پر بے رخی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ میں نے اس کے رویے پر احتجاج کیا تو وہ پھٹ پڑی اس نے جگہ تبدیل کرا لینے کو کہا۔ یہ بات میرے بس میں نہ تھی اس کے پرزور اصرار پر میں نے محکمے والوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اوپر سے جواب آیا کہ "ابھی کوئی ایسا آدمی ہمارے پاس موجود نہیں جو اس اسٹیشن کو سنبھال سکے۔"

کرسٹی کے مزاج میں زبردست تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں۔ وہ بات بات پر مجھ سے لڑتی اور پھر خود بخود رونے لگتی مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ میں نے محکمے سے چھٹی لینے کی کوشش کی تاکہ تبدیلی آب وہوا کے لئے کہیں لے جاسکوں۔ محکمے والے اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ایک دن میں گاڑی کے انتظار میں تھا۔ گاڑی کے انجن کی جلتی ہوئی بتی قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ میں نے انجانے میں دوسری طرف دیکھا تو ایک ہیولا سا دوسری طرف لہراتا محسوس کیا۔ پہلے تو میں نے اسے آنکھوں کا دھوکہ سمجھا لیکن جب غور سے دیکھا تو واقعی وہ کوئی وجود تھا۔

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری طرف گاڑی بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ میں فوراً نیچے آیا اس طرف بھاگا جہاں میں نے ہیولا ریلوے لائن پر منڈلاتا دیکھا تھا۔ گاڑی بہت قریب آ گئی۔ میں چیخا۔ ! میری آواز گاڑی کے شور میں دب کر رہ گئی، انجن نے ریلوے لائن پر سے کوئی چیز اچھال کر دور پھینک دی۔ ذرا دور جاکر گاڑی رک گئی۔ میں ادھر لپکا جدھر انجن سے ٹکرا کر وہ وجود گرا تھا۔ کسی عورت کی لاش تھی۔ میں نے انجانے خوف سے لاش کا منہ اوپر اٹھایا۔ جب بتی کی روشنی اس پر ڈالی تو میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

وہ کرسٹی تھی جس نے خودکشی کر لی تھی۔

میں چیخ مار کر اس سے لپٹ گیا۔ اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کرسٹی کو پکارا لیکن کرسٹی اتنی دور جا چکی تھی جہاں میری آواز کی پہنچ نہیں تھی۔ کرسٹی کی موت مجھ پر بجلی بن کر گری۔

محکمے والوں نے مجھے دو ماہ کی چھٹی دے دی۔ ان چھٹیوں میں میں نے کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھالا۔ میں ڈیوٹی پر آیا تو اس جگہ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جہاں کرسٹی نے خود کو ریل گاڑی کے بے رحم انجن کے رحم وکرم پر چھوڑا تھا۔ اور اس انجن نے کرسٹی کے پھول سے جسم کو مسل ڈالا۔ میں ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ یہ واقعہ 24 جون کو پیش آیا تھا۔

وقت گزرتا گیا کرسٹی کی جدائی کا زخم بھی وقت کے مرہم نے کسی حد تک مندمل کردیا۔ میں نے کرسٹی کی قبر بالکل وہیں تھوڑا ہٹ کر بنائی تھی، جہاں وہ انجن سے ٹکرا کر گری تھی۔ ایک سال بعد میں نے کرسٹی کی قبر پر پھول چڑھائے اور آ کر سگنل ٹاور میں بیٹھ گیا۔ آج کرسٹی کی یاد پھر تازہ ہوگئی تھی۔ ابھی تک کوئی گاڑی نہ آئی تھی۔ گاڑی آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

میں بیٹھ کر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر دوسری طرف سے ٹیلیفون آیا۔ یہ اسٹیشن ماسٹر کا ٹیلیفون تھا۔ میں نے لائن کلیئر کا سگنل دے دیا کیونکہ میں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر لی تھی۔ گاڑی آئی اور عین اس جگہ جہاں پچھلے سال کرسٹی نے خودکشی کی تھی، ایک زوردار گڑگڑاہٹ سے گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ ایک دھماکہ ہوا اور چیخ وپکار کی آوازیں آنے لگیں، میں حیران تھا کہ یہ حادثہ کس طرح رونما ہوا؟ جبکہ میں نے پٹری کو اچھی طرح چیک کیا تھا۔ کانٹا بدلنے کا تو کوئی سسٹم موجود ہی نہ تھا، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میرا ذہن مفلوج ہوگیا۔

میں گاڑی کی طرف بھاگا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ زخمیوں کی دلدوز چیخوں نے قیامت ڈھائی تھی۔ میں نے واپس آ کر ٹیلیفون کیا اور دوسرے اسٹیشن والوں کو حادثے کی اطلاع دی۔ کافی دیر بعد امدادی ٹیمیں آئیں۔ اتنی دیر میں کئی ایک قیمتی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ٹرینوں کی آمدو رفت رک گئی۔

دوسرے دن اس ہولناک حادثے کی خبر تقریباً تمام اخباروں میں جلی سرخیوں سے چھپی تھی، کچھ اخباروں نے محکمہ ریلوے پر کڑی نکتہ چینی کی تھی، کچھ اخباروں نے اسے میری غلطی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ خیر تفتیش ہوئی، تفتیش کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے کہ حادثے میں ٹیکنیکل خرابی کا نشان نہیں ملتا جو حادثے کا باعث بنتی۔

البتہ ڈرائیور کا بیان خاصا حیران کن تھا۔ اس نے ریل کے انجن کے بالکل سامنے خون میں لتھڑی کسی عورت کو دیکھا تھا۔ فائر مین نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کی، جبکہ اس عورت کی تلاش نہ کی جا سکی۔ میرے لئے یہ بیان خاصا پریشان کن تھا۔ مجھے کرسٹی کی خودکشی کا خیال آیا۔ ”کیا کرسٹی انتقام لے رہی ہے؟“

”نہیں! نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ میں نے اپنے دل میں سوچا ”وہ تو بہت معصوم تھی، میں نے یقیناً اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ لیکن اس میں میرا ابھی قصور کیا تھا۔ قصور تو سارا ریلوے کے افسران کا تھا جنہوں نے میری تبدیلی نہ کی اور چھٹی بھی نہ دی۔“

کچھ دنوں اس حادثے کا اخباروں میں خوب چرچا رہا۔ پھر بات دبتی چلی گئی۔ محکمے والوں نے اس دفعہ بھی میری ٹرانسفر نہ کی۔ حالانکہ اصولی طور پر ایسا ہونا چاہئے تھا۔ دراصل حادثے میں میری کسی کوتاہی یا سستی کو ملوث نہ پایا گیا۔ اسے محض اتفاقی حادثہ خیال کر لیا گیا تھا۔

زندگی پھر اپنی ڈگر پر چل نکلی۔ گاڑیوں کی آمدو رفت اور میرے سگنل جاری رہے۔ دن گزرتے رہے اور پھر 24 جون کا دن آ گیا۔ میں نے بتی لے کر سگنل ٹاور سے آگے تک لائن کا جائزہ لیا کسی قسم کی خرابی یا نقص موجود نہ تھا۔ میں ٹاور میں آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کی آمد کا وقت قریب تر آتا جا رہا تھا۔ نہ جانے میرے دل میں ایک انجان سا خوف کیوں جنم لے رہا تھا؟ میں نے ایک دوبار اس خوف سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اس میں کچھ خاص کامیابی نہ ہوئی میں نے دل بہلانے کے لئے رسالہ اٹھایا۔ رسالے میں سے ایک تصویر نکل کر نیچے گری۔ یہ کرسٹی کی تصویر تھی معصوم اور بھولی بھالی کرسٹی تبسم کناں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کرسٹی تو مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ تو نے تو زندگی بھر ساتھ دینے کا پیمان باندھا تھا۔“ میرے لب سے نکلا۔

”ٹرن! ٹرن!“ ٹیلیفون کی گھنٹی نے میرے تصورات کا تانا بانا تار تار کر دیا۔ اسٹیشن ماسٹر کا فون تھا۔ گاڑی کی آمد سے مطلع کر رہا تھا۔ میں علامتی بتی لے کر بالکونی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ سردی سے بچنے کے لئے میں نے مفلر اپنے کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ باہر کس قدر گھپ اندھیرا تھا۔ لائن کے سلیپر مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اندھیرے میں درخت جنوں بھوتوں کے سائے معلوم دے رہے تھے۔ دور انجن کی روشنی نظر آئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے لائن کا جائزہ لیا۔ سب کام ٹھیک تھا۔ اب گاڑی کی چھک چھک بھی سنائی دینے لگی تھی۔ چھک چھک بتدریج نزدیک آتی چلی گئی۔ میں نے بتی اوپر اٹھائی اور اشارہ دیا۔ انجن ٹاور کے سامنے سے گزرا اور پھر......

ایک زور دار دھماکہ سے گاڑی کے ڈبے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ جھٹکا اتنے زور کا تھا کہ مسافر کھڑکیوں کے راستے باہر اچھل اچھل کر گر گئے۔ پھر وہی ہوا چیخ و پکار کی آوازیں۔ ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارا جا رہا تھا، ٹیلیفون پر حادثے کی اطلاع دے کر میں انجن کی طرف بھاگا۔

لائن کے دوسرے پار ایک سایہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں بتی لے کر اس کے پیچھے بھاگا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ کرسٹی تھی! بالکل کرسٹی!

میں نے اسے رکنے کو کہا لیکن وہ آگے بڑھتی گئی۔

میں پیچھے بھاگا وہ اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ اس کے سر سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ میں نے خون کے چھینٹے خود زمین پر پڑے ہوئے دیکھے۔ واپس آکر قبر کو دیکھا تو اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

ٹاور کے نزدیک کربناک حشر برپا تھا، لوگ چیخ رہے تھے تڑپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد امدادی پارٹیاں پہنچ گئیں۔ امدادی گاڑیوں میں زخمیوں اور مردوں کو لاد لاد کر شہر منتقل کیا گیا۔ دوسرے دن سے پھر تفتیش شروع ہوئی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ سب بیکار ہے اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ تو کرسٹی کی روح ہے۔ جو انتقامی کارروائی میں مشغول ہے۔

ڈرائیور نے دم توڑتے وقت بیان دیا کہ "کسی زخمی عورت نے گاڑی کو الٹ دیا۔" اس نے خود اس عورت کو دیکھا تھا۔

نورمین کا بیان ذرا مختلف تھا۔ اس نے بتایا کہ "مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گاڑی چند ساعتوں کے لئے رک گئی ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک زخمی عورت نے آگے سے انجن کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھ سکا۔"

تفتیش کرنے والوں کے سامنے ایک اور بات آئی۔ حادثہ اسی وقت والی گاڑی سے ہوا جس سے پچھلے سال ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ کرسٹی نے خودکشی بھی اسی گاڑی کے نیچے آکر کی تھی۔ میرے بیان جب لئے گئے تو میں نے عورت کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کردیا۔ میں نے جھوٹ بول کر اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

افسران اعلیٰ نے اس حادثے کے پس پردہ کسی ان دیکھی طاقت کی نشاندہی کی تھی۔ افسر اعلیٰ کے پاس حادثے کی رپورٹ گئی تو اس نے اس وقت کی گاڑی کو 24 جون کی تاریخ کے لئے منسوخ کردیا۔ تین سال تک کوئی حادثہ رونما نہ ہوا۔ مسٹر فارمن ریلوے کے نئے سربراہ بن کر آئے تو انہوں نے اس گاڑی کو بحال کردیا۔

☆......☆......☆

"سگنل مین، سگنل مین، گاڑی حادثہ" پھر آواز آئی۔ اب کے آواز کچھ زیادہ ہی صاف تھی۔ میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ بتی کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا، مگر جھینگروں کے ٹرانے اور سرد ہوا کے جھونکوں کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔

میں نے اسے اپنے دل کا وہم جانا۔ آج 24 جون کی تاریخ تھی۔ گاڑی کی آمد میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

"سگنل مین، گاڑی حادثہ" آواز میں خاصی بے چینی تھی۔ میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اچانک باہر نکل کر آواز دینے والے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا۔ ٹاور کے بالکل قریب ایک انسانی ہیولا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں علامتی بتی تھی۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس اجاڑ اور بیابان علاقے میں یہ دوسرا سگنل مین کہاں سے آگیا؟ اتنی سخت سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میں نے دل کڑا کر کے اسے للکارا۔

"تم کون ہو؟" میری آواز فضا میں منتشر ہوگئی۔ میں نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر "جواب کیوں نہیں دیتے۔ تم کون ہو؟" میں نے دوسری بار آواز دی۔ وہ ہیولا وہیں کھڑا رہا لیکن جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ وہ ایک لمبے سے لبادے میں ملبوس تھا۔

"اچھا! تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھتا وہ ہیولا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پل کی طرف چل پڑا۔ اور پھر وہ اندھیرے کی دبیز چادر میں گم ہوگیا۔ میں واپس پلٹا۔ "ارے! یہ کیا؟"

کرسٹی میرے سامنے موجود تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا! اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا! اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے قدم زمین نے پکڑ لئے ہوں۔

"آج 24 جون ہے۔ تمہیں یاد ہوگا آج سے ٹھیک چھ سال پہلے میں نے خودکشی کی تھی۔ شاید تم اس بات سے بے خبر ہو کہ میں نے خودکشی کیوں کی؟ سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے رکی۔ بہتا

ہوا خون اس کے رخساروں تک آ گیا تھا۔ میں نے قدم اٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"تم مجھے بیاہ کر یہاں لے آئے۔ اس ویرانے میں تم خوش تھے۔ لیکن مجھے یہ ویرانی کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ میں نے تمہیں شہر چلنے کو کہا، تم نے انکار کردیا۔ میرے جذباتی اصرار پر تم نے حامی بھرلی! پھر تمہارے محکمے نے کارستانی دکھائی اور چھٹی دینے سے انکار کردیا، میرے لئے زندگی ایک عذاب بن گئی، تمہیں معلوم ہے کہ میں تنہائی اور خاموشی سے کس قدر نفرت کرتی تھی۔ تم نے مجھے ایک ایسی جگہ لا ڈالا جہاں کوئی دوسرا ذی روح نہ تھا، میں یہ قید تنہائی برداشت نہ کرسکی اور خودکشی کرلی۔ اس میں تمہارا کچھ زیادہ قصور نہیں تم نے کسی حد تک مجھے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، چھٹی لینے اور ٹرانسفر کرانے کی بھی کوشش کی، لیکن نوکرشاہی نے تمہاری ایک نہ سنی۔ میں انہیں اسی طرح سزا دیتی رہوں گی۔" وہ کچھ دیر کے لئے رکی۔

"تو کیا ان حادثوں میں تمہارا دخل ہے؟" میں نے جانتے ہوئے بھی پوچھا۔

"یہ تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"لیکن تمہیں اس سے حاصل کیا ہوگا؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"حاصل! کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ بھی" اس نے چہرے پر بہتے ہوئے خون کو پونچھا اور پھر کہنے لگی۔

"میں انتقام لیتی رہوں گی! میں اس محکمے کو تباہ کردوں گی۔ برباد کردوں گی، آج اس گاڑی میں ریلوے کے بڑے بڑے افسران بھی آرہے ہیں جیسا کہ تم جانتے ہو۔ آج یہ سب میرے انتقام کا نشانہ بنیں گے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ آواز بڑی خوفناک تھی اس کے قہقہے بڑھتے گئے۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ فائر کردیا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا، پستول کی گولی دیوار میں پیوست ہوگئی تھی۔ میں نے اسے اپنا وہم جانا۔ آرام دہ کرسی پر دراز ہوگیا۔ وہسکی کے دو گھونٹ لئے تو کچھ سکون ملا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، آخر کرسٹی دوبارہ کیسے زندہ ہوگئی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میں بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی! چہ معنی دارد؟" کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

میری سوچنے سمجھنے کی قوت مفلوج ہوگئی، میں نے وہسکی کا ایک اور پیگ بنایا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کردیا۔ اس نے مجھے فرحت بخشی، میں نے آنکھیں موندلیں۔ نیند کی ایک جھپکی سی آئی۔

"ٹرن، ٹرن" ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، دخل اندازی مجھے کچھ اچھی نہ لگی۔ بڑی بے دلی سے فون اٹھایا، گھڑی پر نگاہ پڑی تو سمجھ گیا کہ فون اسٹیشن ماسٹر کا ہوگا۔ سیڈن اپ کے آنے میں پون گھنٹہ باقی تھا۔

"ہیلو! سگنل مین اسپیکنگ" میں نے کہا۔ دوسری طرف سے اسٹیشن ماسٹر نے لائن کلیئر کا اشارہ کرتے ہوئے چوکنا رہنے کی تلقین کی۔

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میری زبان میرا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بات کہہ رہا ہوں۔ میں کیا کہہ رہا تھا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے ایک دو بار زبان پر قابو پانے کی کوشش بھی کی۔ مگر زبان تو گویا میرے قابو سے باہر تھی، دوسری طرف سے اسٹیشن ماسٹر بھی کچھ عجیب وغریب قسم کی باتیں کررہا تھا۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوا تو میں نے فون رکھ دیا۔

میں حیران تھا کہ آج مجھے کیا ہورہا ہے؟ گھڑی نے ڈیڑھ بجنے کا اعلان کیا۔ گاڑی آنے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے خوف سا آنے لگا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ گاڑی آنے پر میں ہمیشہ خوشی محسوس کرتا۔ گاڑی کے گزر جانے پر تو مجھے بے انتہا خوشی ہوتی کہ چلو میں نے اپنی ڈیوٹی احسن طریقے سے انجام دی۔ پھر دوسری آنے والی گاڑی کا انتظام کرنے لگتا۔ اسی طرح میرے صبح وشام بسر ہوتے تھے۔

آج جانے کیوں میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔ میں نے وہسکی کا ایک اور پیگ بنایا۔ گلاس اٹھا کر ہونٹوں کو لگایا ہی تھا کہ "سگنل مین، گاڑی حادثہ۔" کی آواز پھر کانوں میں پڑی۔ اب کے آواز میں کچھ زیادہ ہی بے چینی تھی۔

خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی۔ مجھے یوں احساس ہوا جیسے کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر "سگنل مین، گاڑی، حادثہ" کہہ رہا ہو۔ پھر یوں لگا جیسے چاروں طرف سے یہی آواز آرہی ہو۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا اور دھم سے کرسی پر گر گیا۔ آواز ڈوبتی چلی گئی۔ گاڑی آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔

"ٹرن، ٹرن"...... ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی، اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ "گاڑی روانہ ہو رہی ہے۔"

میں نے اسے گاڑی روانہ کرنے سے منع نہیں کیا۔ یہ الفاظ اگرچہ میری زبان سے ادا ہوئے تھے لیکن ان کی ادائیگی میں میری مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ کوئی ان دیکھی قوت نے یہ الفاظ مجھ سے کہلوائے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے کیا جواب دیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم میں باہر آیا۔ سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔ "ارے یہ کس نے ڈاؤن کر دیا؟" میں نے خود سے سوال کیا۔ یقیناً سگنل میں نے ڈاؤن نہیں کیا تھا۔ "اگر میں نے نہیں کیا تو پھر کس نے کیا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اسی وقت ایک سایہ سگنل کے قریب بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بتی تھی۔ بتی کی مدھم روشنی میں وہ کچھ اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم جانا۔ ایک دو بار آنکھوں کا مسئلہ کہ شاید نظر کا دھوکہ ہو۔ لیکن وہ نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ سامنے نظر گئی تو گاڑی کے انجن کی جھلملاتی بتی نظر آئی۔ میں فوراً بتی لے کر نیچے اترا۔ میرا رخ سگنل کی طرف تھا۔ شاید اس سائے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ برق رفتاری سے پلٹا، میں بھاگا مگر وہ تو اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ میں سگنل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اپنے بائیں طرف دیکھا تو ایک سائے کو لائن کے قریب منڈلاتے دیکھا۔ سایہ یقیناً پہلے والا نہیں تھا۔

کسی انجانے خوف سے میں لرز گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی۔ اب وہ اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اس سائے کی طرف لپکا جو یقیناً کرسٹی تھی۔ جو ریلوے والوں سے انتقام لینے پہنچی تھی۔ گاڑی بالکل میرے قریب پہنچ گئی۔ میں اور تیزی سے بھاگا پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی طاقت نے مجھے ہوا میں اچھال دیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ اور میں گہرے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

میری آنکھ کھلی تو خود کو ایک چٹیل میدان میں پایا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو ایک ایک کر کے گذرا ہوا واقعہ یاد آنے لگا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ سر پر ہاتھ پھیرا تو وہاں ایک گومڑا سا بنا ہوا تھا۔ ہاتھ ٹکراتے ہی درد سے میری چیخیں تک نکل گئیں۔ میں پھر لیٹ گیا۔ جانے کب تک یونہی بے سدھ پڑا رہا۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو ہرے بھرے میدان میں پایا جگہ کچھ جانی پہچانی سی لگی، تھوڑی سی کوشش کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر میں درد اب بھی ہو رہا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ پھوڑا ہو رہا تھا۔ اتنے میں اڑتا ہوا کسی اخبار کا ایک ٹکڑا میرے قریب آیا، میں نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر اسے اچک لیا۔ وہ کوئی پرانا اخبار تھا۔ میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک بڑی سرخی پر میری نظر پڑی "بائیلے برج کے سگنل مین کی قربانی"

خبر کی تفصیلات کچھ یوں تھیں۔ "بائیلے برج کے سگنل مین کی قربانی نے سیون اپ کو ایک بڑے حادثہ سے بچالیا۔ سگنل مین نیلسن نے اس بلا کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی، 24 جون کو آنے والی سیون اپ کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ بلا ایک عورت تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ سگنل مین نیلسن کی بیوی کرسٹی کی روح تھی جو ہر سال 24 جون کو سیون اپ کے حادثے کا باعث بنتی تھی۔ سگنل مین کی اس قربانی کو سراہتے ہوئے حکومت نے اس کا ایک شاندار مقبرہ ریلوے لائن کے بالکل قریب تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ تمام ڈرائیوروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نیلسن کی قبر کو سلامی دے کر گزریں۔"

اخبار میرے ہاتھوں میں لرزنے لگا۔ "تو کیا میں مر چکا ہوں؟" میں نے خود سے سوال کیا۔ پھر اپنے جسم کو ٹٹولا جب مجھے اپنے زندہ ہونے کا اچھی طرح یقین ہو گیا تو میں سوچنے لگا کہ "پھر وہ کون تھا جو مر گیا۔ وہ کوئی اور

ہوگا؟ یقیناً ریلوے والوں کو دھوکا ہوا ہوگا۔“

اس خیال سے جیسے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ درد کی ٹیسیں بھی کچھ کم ہوگئی تھیں۔

اٹھا اور انداز ے سے ایک طرف چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ سگنل ٹاور کی عمارت نظر آئی۔ میرے قدموں میں تیزی پیدا ہوئی۔ سگنل ٹاور کے عمارت کے قریب ہی ایک قبر پر نظر پڑی۔ قبر پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن میں اخبار کی خبر دوڑ گئی میں بلا ارادہ قبر کی طرف بڑھ گیا۔ مقبرہ اچھا خاصا شاندار تھا۔ لوح قبر پڑھتے ہی حیرانیوں کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ”سگنل مین نیلسن، تاریخ وفات 24 جون“ اس کے علاوہ کچھ توصیفی کلمات بھی لکھے گئے تھے۔

”تو کیا میں واقعی مر گیا؟“ میرے ذہن کے کسی کونے سے سرگوشی ہوئی۔ ”نہیں نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔“ میں یہ کہہ کر سگنل ٹاور کی طرف لپکا۔

سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ سامنے کوئی دوسرا سگنل مین بیٹھا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پاکر وہ پلٹا۔ وہ شیفرڈ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ڈر اور خوف کے سائے اس کے چہرے پر لہرانے لگے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے ایک طرف جھکائی دی۔ وہ فرش پر آرہا۔ اور پھر ”بھوت، بھوت“ چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اٹھایا، اور دوسرے اسٹیشن کے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف سے اسٹیشن ماسٹر پیٹر کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ میں نے نیلسن کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام سنتے ہی انہوں نے کس قسم کا تاثر لیا۔ ان کی آواز بخوبی اس کی غمازی کر رہی تھی۔ ہکلاتے الفاظ ان کے گلے میں اٹک گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ بات کروں، مگر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ مجھے اپنی حالت پر بے حد رحم آیا۔ اس بے چارگی کے عالم میں چند آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ سامنے کیلنڈر پر نظر پڑی، آج اگست کی 24 تاریخ تھی۔ ”تو گویا میں پورے دو مہینے بے ہوش پڑا رہا۔“ اس دوران انسانی زندگی میں کیا کچھ تبدیلی نہ آچکی تھی۔

”ٹرن ٹرن!“ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے جھٹ فون اٹھایا۔ اور انجانے میں اپنا نام نیلسن بتایا۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اب یہاں ٹھہرنا میرے لئے بیکار تھا۔ میں نے دوسرے اسٹیشن جاکر اسٹیشن ماسٹر کو پورے حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرا اسٹیشن یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سواری کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس خراب موسم میں پندرہ میل کا پیدل سفر! اس کے تصور سے ہی میں کانپ اٹھا۔ اس ”موت“ سے تو بہرحال چھٹکارا پانا ہی تھا۔ بہتر ہے کہ میں اس ”موت“ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں جان دے دوں۔ یہ فیصلہ کرکے میرے دل میں کچھ سکون ہوا۔ میں نے میز پر پڑی وہسکی کا ایک گلاس چڑھایا۔ اس نے مجھے تازہ دم کر دیا۔

میں ایک نئے ولولے کو دل میں لئے کیبن سے باہر آیا۔ شیفرڈ باہر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر بے تحاشہ بھاگا مجھے اس کی حالت پر بڑی ہنسی آئی۔

میں گرتا پڑتا دوسرے دن رات کے تقریباً دو بجے لارڈ گوئے اسٹیشن پہنچا۔ اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم سونا پڑا تھا۔ ایک بینچ کے نیچے لیٹا ہوا خارش زدہ کتا اپنے آپ کو سردی سے بچانے کی فکر میں تھا۔ میری آہٹ سنی تو عادتاً بھونکا اور پھر مجھے بھی اپنے جیسا بے یارو مددگار جان کر خاموش ہوگیا۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے ہلکی روشنی کی کرنیں روشندان سے چھن چھن کر باہر آرہی تھیں۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ مجھے اسٹیشن ماسٹر کی حماقت پر بڑا غصہ آیا کہ دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اگر کوئی چور چکا گھس آئے تو؟ لیکن اس وقت اس کا دروازہ کھلا رکھنا میرے لئے باعث رحمت ثابت ہوا۔ دروازہ بند ہوتا تو ممکن ہے میری آواز سن کر وہ دروازہ نہ کھولتا۔ لیمپ کی زرد روشنی کمرے کے ماحول کو خاصا پراسرار بنا رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ دروازہ پھر بند کیا اور کنڈی

چڑھا دی۔ میں اب شیفر ڈ والی غلطی دوبارہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر پر فرار کے دروازے بند کر کے اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلانا چاہتا تھا۔

بے خیالی میں میرا ہاتھ دروازے پر زور سے پڑ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر جو میز پر اوندھے منہ پڑا اونگھ رہا تھا، ایک دم اٹھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس طرح اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

''بھ......بھو......ت......بھوت......'' ڈر کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا وہ ہکلایا۔

''پیٹر صاحب! میں بھوت نہیں ہوں ۔ نیلسن ہوں! نیلسن!'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹا اور پھر اس نے پیٹر ویٹ مجھ پر دے مارا۔ اگر میں چوکنا نہ ہوتا تو پیپر ویٹ میرا کام تمام کر دیتا۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ پیٹر کی آنکھیں پھیل گئیں اور پھر وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں فوراً ایک پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارے۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ''بھوت'' کہہ کر وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اب تو میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ میں نے دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ اب پیٹر کو جو ہوش آیا تو وہ تڑپ کر میری گود سے نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ڈورے اب تک تھے۔ میں نے برق رفتاری دکھائی اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

''پیٹر یقین کرو! میں بھوت ووت نہیں ہوں، یہ سب تمہارا وہم ہے۔'' میری آواز گلوگیر تھی۔ اب پیٹر بھی ہوش و حواس میں آ چکا تھا۔

''پھر وہ کون تھا، جس نے گاڑی کو حادثے سے بچایا؟'' اس کی آواز میں اب تک کسی قدر ڈر کے آثار تھے۔

''میں کیا جانوں'' میں واقعی نہیں جانتا۔

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، ہم دونوں کے درمیان میز تھی۔ ایک لمحہ توقف کے بعد وہ اٹھا۔ اس کا رخ سیف کی طرف تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔

''دیکھو پیٹر! کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرنا'' میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ریوالور نکال کر فائر نہ جھونک دے۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ایک بڑی سی فائل نکالی۔ پھر اس نے کچھ صفحے الٹ پلٹ کئے۔ ایک جگہ آ کر رک گیا۔ پھر میری طرف دیکھا اور فائل لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ ''یہ دیکھو!'' اس نے فائل میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔ وہ کسی اخبار کی کٹنگ تھی۔

اس میں ایک فوٹو تھی۔ فوٹو میں ایک مرد اور عورت مردہ پڑے تھے۔ میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی تصویر میں پڑی ہوئی مردہ عورت کرسٹی تھی۔ اور مرد میں خود تھا، لمبا سا لبادہ پہن رکھا تھا میں نے! سگنل دینے والی بتی بھی ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی۔ ''آخر یہ سب کیا ہے؟ میں نے سوچا۔

''اب کہو! کیا یہ تصویر تمہاری نہیں؟'' پیٹر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ تصویر تو یقیناً میری ہے لیکن میں تو آپ کے سامنے زندہ سلامت موجود ہوں۔'' میرا جواب سن کر پیٹر کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر اس کے لب ہلے۔

''یہ ساتھ والی عورت کون ہے؟'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کرسٹی ہے پیٹر! میری بیوی......'' اور پھر میں نے شروع سے پوری رام کہانی پیٹر کو سنائی۔

تھوڑے دنوں کی دوڑ دھوپ سے میری نوکری بحال ہو گئی اور میں بائٹلے برج پر دوبارہ مقرر کر دیا گیا۔

آج 24 جون ہے! میرے کان کسی آواز کے منتظر ہیں۔ اور پھر ''سگنل مین گاڑی، حادثہ'' کی آواز دور بہت دور سے آئی۔ میں کھڑکی کی طرف لپکا! آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے بتی کی روشنی میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

''سگنل مین، گاڑی، حادثہ'' کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ دور بہت دور۔



''کتنا نادان ہے تو، کیا تو نہیں جانتا ہم جہاں بسیرا کرتے ہیں وہاں سے اتنی آسانی سے نہیں جاتے۔'' اور یہ کہہ کروہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھی، اگر مولوی صاحب اور ابا نے اسے نہ پکڑلیا ہوتا تو وہ بزرگ کا منہ نوچ چکی ہوتی۔ زینب بہت دھان پان سی لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔ بزرگ مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے۔ زینب کے قریب آتے ہی انہوں نے اس پر پھونک ماری اور اپنے ساتھ لائی ہوئی رسی سے اسے باندھ دیا۔ پھر انہوں نے ابا جی اور مولوی صاحب کی مدد سے اسے اٹھایا اور باہر آنگن میں لے آئے۔

زینب مسلسل چیخ رہی تھی بزرگ نے جلدی سے سب کے گرد ایک حصار کھینچا اور زمین پر بیٹھ گئے۔

بزرگ کی آواز سنائی دی'' جا چلا جا یہاں سے جہاں سے تو آیا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' لیکن زینب مسلسل چیختی رہی اور مولوی صاحب اور بزرگ کو برا بھلا کہتی رہی اس کے بعد بزرگ نے ہم سے ایک بالٹی پانی لانے کو کہا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ پڑھنا شروع کردیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بزرگ نے اس جگہ ایک چھوٹا گڑھا کھودا اور پھر اس گڑھے میں بالٹی سے پانی نکال نکال کر اس گڑھے میں ڈالنے لگے۔ ہم سب حیران تھے کہ آدھی بالٹی پانی ڈالنے کے باوجود وہ گڑھا خشک تھا، پانی گڑھے میں پڑتے ہی غائب ہوجاتا تھا، یہ عمل بھی وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک کرتے رہے کہ زینب ایک دم سے خاموش ہوگئی۔

ہم سب حیران تھے کہ اچانک کچھ فاصلے پر سے ایک بلا نمودار ہوا اور بزرگ کے حصار سے کچھ دور آکر بیٹھ گیا۔ وہ بزرگ کو گھور رہا تھا اور غرا رہا تھا بزرگ نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا۔'' جا چلا جا یہاں سے ورنہ تیرا حشر بھی تیرے اس ساتھی جیسا ہوگا۔''

بلے نے حصار کے چاروں طرف ایک چکر کاٹا اور ہوا میں غائب ہوگیا، ہم سب خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ ایسا منظر ہم نے اپنے خواب میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بزرگ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور ان کے چہرے پر اب مسکراہٹ تھی۔ وہ مولوی صاحب اور ابا جی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے آپ بچی کو اندر لے جائیں اور سلا دیجیے جب یہ صبح اٹھے گی تو سب ٹھیک ہوگا۔''

ابا زینب کو اندر لے آئے تو اماں نے اپنے کمرے میں اسے سلا دیا۔

بزرگ ابا جی سے مخاطب ہوئے۔'' اس جن کا خاتمہ ہوچکا ہے اور جو باہر آپ نے دیکھا وہ اس کا ساتھی تھا لیکن اب وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔''

یہ سن کر ابا اور ہماری جان میں جان آئی اور ہم نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اگر وہ نہ ہوتے اور ہمارا ساتھ نہ دیتے تو نہ جانے زینب کا کیا ہوتا۔''

دادی نے اپنی کہانی ختم کی اور مجھے مخاطب کیا۔'' زینی میں تمہیں بس یہی سمجھانا چاہتی تھی کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کب تک ہوں لیکن تم اپنا خیال خود رکھا کرو، ذرا سی احتیاط سے ہم بہت بڑی بڑی آزمائشوں سے بچ سکتے ہیں۔''

میں نے دادی کی یہ بات سنی تو دادی کے گلے لگ گئی اور وعدہ کیا'' دادی ایسا نہ بولیں، اللہ! آپ کی عمر دراز کرے، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی ہر بات پر عمل کروں گی۔''

تمام بہنوں سے میری گزارش ہے کہ وہ بھی ذرا سی احتیاط سے خود کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین)۔





راج دلاری

ایس امتیاز احمد-کراچی

آسمان پر اچانک دودھیا روشنی پھیل گئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ روشنی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آنے لگی، جب روشنی بالکل نیچے آگئی تو لوگوں کی آنکھیں چندھیاگئیں اور پھر لوگوں کے سامنے اچانک......

صدیوں پر محیط عجیب وغریب سوچ کی حامل نا قابل فراموش......دل کو مسوستی کہانی

پہلی بار میں نے راج دلادی کا نام سنا تو کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے کہ ہندوؤں میں عورتوں کے نام عام طور پر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

"راج دلاری"

لیکن جب دوسری بار یہی نام سنا تو سوچنے لگا کہ یہ راج دلاری ہے کون؟ لیکن پوچھنے کی پھر بھی اس مجھ سے ہمت نہیں ہوئی کہ ماتحت عملہ نہ معلوم کیا خیال کرے لیکن جب "راج دلاری، راج دلاری" کا نام بار بار سننے میں آیا تو پھر مجبور ہوگیا کہ معلوم کروں کہ راج دلاری ہے کون؟

مگر بات پھر بھی تشنہ رہی۔ کوئی بھی تفصیل سے نہیں بتاسکا کہ راج دلاری کون ہے؟ البتہ اتنا معلوم ہوسکا کہ کسی زمانے میں راج دلاری نام کی لڑکی رام پور میں تھی۔ جس کے متعلق طرح طرح کے مافوق الفطرت

کہانیاں منسوب تھیں۔ میں نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں سنا اس پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ یہ ایسی من گھڑت کہانیاں تھیں جن کو انسانی عقل کسی صورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

میرا حال ہی میں رام پور میں تبادلہ ہوا تھا۔ یہ دو گاؤں کے مجموعہ کا نام ہے ان میں سے ایک رام ہے۔ یہاں بدھ مذہب کی بڑی بڑی یادگاریں۔ پہاڑ پر بہت بڑے بڑے اسٹوپ بنے ہوئے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے دو میل سے زائد رقبے میں چہار دیواری تعمیر کرکے ان آثار کا حصار کرلیا ہے۔ جگہ جگہ گوتم بدھ کے بڑے بڑے بت رکھے ہوئے ہیں پتھروں کی سلوں پر تحریرات اور تصاویر کندہ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ایک عجائب گھر بھی پہاڑ پر بنا ہوا ہے۔ اس میں اس دور کی ہر چیز موجود ہے۔ یہاں موٹی موٹی کتابیں موجود ہیں جو بتوں اور متعلقہ چیزوں کی مکمل تاریخ ہیں۔

تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ جن کے قیام کے لئے پہاڑی سے نیچے سرکاری ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ ان بنگلوں میں آسائش اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اس کے علاوہ کھانے کے انتظام کے لئے باورچی اور منشی وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں۔ ڈاک بنگلوں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ آثار سے قریب پہاڑ پر ہی رام نام کا گاؤں آباد ہے۔ اسی پہاڑ سے نیچے پور نام کا گاؤں ہے۔ اس سے کچھ دور چل کر سڑک کے کنارے کا بھون نامی گاؤں ہے۔ یہ بھوپال کا سرحدی گاؤں ہے۔

یہ تمام علاقہ پہاڑی اور میدانی ہے۔ اونچے نیچے پہاڑوں اور میدانوں میں سرسبز تناور درخت کثرت کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بھون کے پہاڑی گھروں میں کھڑے ہوکر دیکھا جائے تو ریلوے لائن کے اس پار موضع منڈوائی دکھائی دیتا ہے۔ دوسری جانب موضع بھون ہے جس کے نیچے ایک کشادہ مذہبی بستی ہے۔ ان موضع جات میں کسٹم کے ناکے ہیں جہاں ناکیدار اور سپاہی تعینات ہیں۔

تبادلہ پر آنے کے دو ہفتے بعد میں گشت پر نکلا۔ اریا چوپڑہ اور بہار کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے کئی دن صرف ہوگئے۔ یہ بارش کا موسم تھا اور ان دنوں موسلا دھار بارش ہونے کی وجہ سے ندی نالے طغیانی پر تھے جس کی وجہ سے مجھے کئی دن قیام کرنا پڑا۔ بہار سے جس وقت روانہ ہوا تو شام ہونے والی تھی۔ ناکے دار اور سپاہی نے مجھے روکا بھی لیکن میں نے کوئی خیال نہیں کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ جس وقت پور اور رام پور کے درمیان پہنچا تو بارش میں تیزی آ گئی۔ اندھیری رات ہونے کی وجہ سے قد آدم گھاس میں راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے سے چلتا ہوا جب ایک جگہ پہنچا تو نالہ پورے شباب کے ساتھ طغیانی پر تھا۔ کچھ دیر تک کھڑا ہوا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہئے؟ آخر یہی فیصلہ کیا کہ واپس ہوکر کسی طرح رام گاؤں پہنچا جائے۔ گھوڑے کو پلٹا کر اندازے سے روانہ ہوا لیکن اندازہ غلط ہی رہا۔ کافی دیر تک بھٹکنے کے بعد بھی پور تک پہنچنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید آج تمام رات یونہی پانی میں بھیگتے ہوئے بھٹکنا پڑے گا۔

یکا یک ایک بار زور سے بجلی چمکی جس کی روشنی میں کچھ دوری پر کسی سادھی پر بنی ہوئی چھتری دکھائی دی۔ میں نے اس وقت اس کو ہی غنیمت جانا۔ ویسے مرگھٹ میں اندھیری رات گزارنا کچھ خوش کن بات نہیں تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مرگھٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔ کچھ دور چلنے پر مجھے چھتری کے پاس ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی دکھائی دی۔

''کیا یہاں کوئی رہتا ہے؟'' میں نے دل میں سوچا۔ ''دیکھا جائے گا۔ اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو میں اس کے گھر میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔ اس بارش میں بھیگنے سے بہتر تو یہی ہوگا کہ تمام رات بھوت سے ہی دل لگی رہے۔''

یہی کچھ سوچتا ہوا میں مرگھٹ کی جانب بڑھتا رہا۔ لیکن جب میں مرگھٹ کے حدود میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سادھی کی چھتری کے قریب ایک کٹیا بنی ہوئی جس میں سے وہ روشنی آرہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس میں کوئی انسان ہی رہتا ہوگا ورنہ بھوت کو مکان کی ضرورت کیا ضرورت تھی۔ روشنی اور گھر دیکھ کر گھوڑا دور سے ہنہنایا۔ وہ غریب بھی مسلسل کئی گھنٹے سے بارش اور کیچڑ میں پھرتے ہوئے پریشان ہو رہا تھا۔

گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سن کر کٹیا کا دروازہ کھلا اور گیروا (گہرے پیلے) رنگ کی کفنی پہنے ایک سادھو باہر نکل کر آیا۔ یہ بہت ضعیف آدمی تھا۔ سر کے اور داڑھی کے بالوں کے علاوہ بھنویں تک سفید تھیں۔ اس نے پہلے مجھے بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''حضور اتنی رات کو آپ کہاں؟''

میں نے سادھو کو بغور دیکھا اور پھر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا ''مہاراج۔ بارش کی وجہ سے ندی نالے پورے طغیانی پر ہیں اس لئے آج رات شاید آپ کے پاس ٹھہرنا ہوگا۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے حضور۔ مگر آپ کو شاید آپ کی شان کے مطابق آرام نہ مل سکے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''آپ اندر چلیں میں گھوڑا باندھ کر ابھی آتا ہوں۔''

گھوڑے کی لگام سادھو کو دے کر میں کٹیا میں داخل ہوگیا ایک کونے میں صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ پاس میں ہی مرگ چھالا بچھا ہوا تھا۔ سادھو کے دھوتی لگانے کا تکیہ اٹھو تھا۔ میں نے برساتی اور ہیٹ اتار کر دروازے کے قریب لٹکا دیا۔ جوتے اور موزے اتار کر ایک طرف پھینکے اور خود آگ کے پاس جا بیٹھا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سادھو بھی گھوڑا باندھ کر میرے قریب آ بیٹھا۔

''یہاں سے رام کتنی دور ہے؟'' میں نے سادھو سے پوچھا۔ ''دوکوس (چار میل)''

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں چار میل کے اندر ہی اب تک چکر لگا تا رہا۔ بہرحال اب تو پریشان ہو چکا تھا اور اس وقت دوبارہ روانہ ہونا بھی کچھ مناسب نہیں تھا اس لئے رات یہیں کاٹنے کا فیصلہ کرلیا۔

''حضور کھانے کے لئے کچھ پیش کروں؟'' سادھو نے پوچھا ''نہیں مہاراج۔ اس کی ضرورت نہیں ہے تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ یہ تو بتاؤ کہ کس کی سادھی ہے؟''

''گنگا چمار اور اس کی بیوی کی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ چمار کی اور سادھی؟ یہ کیسی انوکھی بات تھی اور پھر اس پر سادھو استھان یہ بات سمجھ میں آرہی تھی۔

''مطلب یہ ہے کہ جن کی یہ سادھی ہے وہ اتنی عظیم شخصیتیں تھیں کہ ان کا ثانی ابھی تک کوئی پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ اور آج سینکڑوں برس سے ہمارا خاندان اس سادھی کی خدمت کررہا ہے۔ ہم برہمن لوگ اس سادھی کی خدمت کرتے ہیں یہ واقعی تعجب کی بات ہے لیکن اس سادھی کے باشی لاکھوں برہمنوں سے بہتر تھے۔''

''مہاراج بات سمجھ میں نہیں آئی ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

''حضور یہ لمبی لیکن حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ کیا سنیں گے؟''

''ضرور سنوں گا۔'' میں نے کہا ویسے مجھے بھی رات گزاری کے لئے یہی صورت بہتر معلوم ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ وقت باتوں میں گزارا جائے۔

''آج سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔'' مہاراج نے کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''رام پور میں ایک لڑکی راج دلاری تھی۔''

''راج دلاری؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تو یہ بھی راج دلاری کا قصہ ہے۔''

''ہاں بیٹا یہ راج دلاری کا ہی قصہ ہے۔ راج

دلاری گنگا چمار کے یہاں پیدا ہوئی۔ لیکن پیدائش کے وقت ایسے عجیب وغریب اور پراسرار حالات رونما ہوئے جس کی بناء پر ماں باپ کے علاوہ گاؤں والے بھی پریشان ہوگئے۔

جس رات یہ لڑکی پیدا ہوئی وہ پورنماشی کی رات تھی۔ لیکن اس دن شام کے وقت سے ہی تیز ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں اور پھر جیسے جیسے رات زیادہ ہورہی تھی اسی طرح سے ہوا بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ دس گیارہ بجے رات کو ہوا نے طوفانی صورت اختیار کرلی تھی۔ ہوا کی وجہ سے اتنا گرد وغبار اٹھا کہ چاند چھپ گیا مگر ہلکی ہلکی روشنی پھر بھی باقی تھی۔ درختوں کے پتوں میں سے گزرتی ہوائیں سیٹیاں بجارہی تھیں اور ان سیٹیوں کی آوازوں میں ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ہزاروں بھوت ناچ رہے ہیں۔ اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ بھوتوں کو ناچتے ہوئے تو نہیں دیکھا جاسکا لیکن ہر شخص کو محسوس ہورہا تھا کہ جیسے انسان کی قسم کے کچھ لوگ آسمان سے اتر کر زمین پر آجارہے ہیں۔ ان آنے جانے والوں کو لوگ دیکھنے کے بجائے صرف محسوس کررہے تھے۔

طوفانی ہواؤں کی وجہ سے عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر گھروں میں چھپ گئی تھیں لیکن مردوں کو ایسا معلوم ہورہا تھا کہ جیسے کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔ طوفان سے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا اس لئے کہ اس قسم کے طوفان تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن حیات کی بناء پر ان کے دل بے چینی محسوس کررہے تھے اور ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھو آگے کیا ہونے والا ہے۔

رات کو کوئی گیارہ بجے یعنی لڑکی کی پیدائش سے ایک گھنٹہ قبل ہلکی ہلکی روشنی کے ہالے آسمان سے اترنا شروع ہوئے۔ ہر شخص ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کا رخ گنگا چمار کے گھر کی جانب تھا۔ گاؤں کے سب مرد ہی یہ کرشمہ دیکھ رہے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان بادلوں میں ایک خاص صورت پیدا ہوگئی تھی۔ ہالے جس طرح اتر رہے تھے اسی طرح ان میں سے کچھ واپس بھی جارہے تھے اور اب صرف آنے والوں کا ہی نہیں بلکہ جانے والوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک اور چیز رونما ہوئی یعنی اب بادلوں کے بجائے انسان اترتے ہوئے معلوم ہورہے تھے ان کے جسم تو اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے لیکن ان جسموں کے متعلق سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کے جسم ہیں جو ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد بھی جسم ہی معلوم ہورہے تھے۔ سب سے پہلے تو کچھ ایسے مرد اترے جو صرف ساڑھی نما دھوتی باندھے ہوئے تھے اور اس دھوتی کا ایک پلو ان کے کاندھوں پر تھا۔ سر، داڑھی اور مونچھ کے بال بالکل صاف تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں عجیب طرز کا برتن تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں پانی ہے اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔ لیکن جس طرح سے ان لوگوں کی ہر چیز تعجب خیز تھی اسی طرح یہ پھول بھی عجیب قسم کے تھے۔ کسی نے بھی ایسے پھول کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے پھول ہزاروں سال قبل کبھی ہوتے ہوں لیکن اب ان کا وجود ختم ہوچکا ہے۔ آنے والوں کی تعداد پندرہ بیس تھی لیکن حلیے اور وضع قطع سے یہ مذہبی آدمی معلوم ہوتے تھے یا پھر یہ اس زمانے کے وید ہوں گے لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ان لوگوں کے اترنے کے بعد عورتوں کے اترنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ عورتیں انتہائی حسین نوجوان اور نورانی معلوم ہورہی تھیں۔ وہ بھی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھیں مگر ان کے ہاتھوں میں کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ سب سے آگے جو عورت تھی اس کے ہاتھ میں عوددان تھا جس سے نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس میں شاید عود وعنبر قسم کی کوئی چیز ڈال کر جلائی جارہی تھی۔ عوددان سے نکلی ہوئی خوشبو کی لپٹوں سے پوری فضا معطر ہورہی تھی۔ چاروں طرف عطر بیز ہوائیں چل رہی تھیں اور جو خوشبو سب لوگ سونگھ رہے تھے وہ ایک قسم کی نہیں تھی بلکہ کبھی ایک قسم کی

خوشبو آتی اور کبھی دوسرے قسم کی۔

اس عورت کے پیچھے کثرت سے عورتیں تھیں منظم طریقے سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں عجیب عجیب قسم کے سامان تھے لیکن ان کو دیکھنے کے بعد اندازہ بھی ہورہا تھا کہ یہ سب سامان بچی سے متعلق ہے۔ یہ عورتیں کورس کے انداز میں کوئی گیت گا رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی قسم کی دعا ہو لیکن الفاظ کی ادائیگی سے خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔

ابھی اس قسم کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا کہ یکایک آسمان پر روشنی کا ایک بہت بڑا گولہ نمودار ہوا۔ سب لوگ گھبرا کر اس کی جانب دیکھنے لگے کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ جس وقت یہ گولہ زمین کی طرف آرہا تھا۔ اس وقت آدھی رات کا وقت تھا۔

جب وہ نورانی گولہ زمین کے قریب پہنچا تو اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ جس کو وہ گولہ سمجھ رہے تھے وہ ایک اتنا بڑا ہالہ تھا جس کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس ہالے میں آگے آگے کافی تعداد میں فوجی گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ ایک ہاتھ میں راس اور دوسرے میں نیزہ پکڑے ہوئے تھے۔ پہلو میں چوڑے پھل کا خنجر لٹک رہا تھا۔ پیٹھ پر ڈھال اور کاندھے پر کمان تھی۔ ترکش اچھے قسم کے تیروں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ فوجی بڑے منظم طریقے سے نیچے اتر رہے تھے۔

گھڑ سواروں کے پیچھے رتھوں کی قطار تھی۔ ان میں بھی فوجی سوار تھے۔ ان رتھ سواروں کی بھی شان نرالی تھی۔ ہر ایک فوجی اسلحہ سے لیس گھوڑوں کی باگیں تھامے ہوئے رتھ میں کھڑا تھا۔

رتھوں کی لائن ختم ہونے کے بعد پھر کچھ لوگ سامان لئے ہوئے نظر آئے۔ اس سامان کو اٹھانے والے شکل وصورت سے غلام دکھائی دے رہے تھے۔ تمام سامان قیمتی اور عجیب وضع کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں لایا جارہا ہے۔ اس سامان میں ایک بہت قیمتی گہوارہ تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے گدے تکیے لگے ہوئے تھے۔ تھالوں میں چھوٹے چھوٹے کھلونے اور گھنٹیاں تھیں۔ کچھ تھالوں میں بچے کے نئے جڑاؤ زیورات اور کپڑے تھے۔ ایک تھالی میں چھوٹا سا تاج بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ تمام لوازمات کسی بچے کے لئے ہی ہوسکتے تھے۔

ابھی لوگ یہ سب چیزیں دیکھ ہی رہے تھے کہ ہالے کی روشنی تیز ہونا شروع ہوگئی۔ پھر وہ روشنی اتنی زیادہ تیز ہوئی کہ آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ یکایک کچھ اور ہی نقشہ نظر آیا۔ وہ تھا تخت شاہی۔ اس کو چالیس آدمی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ چھپر شاہی پورا کا پورا سنہری تھا اور اس میں کثرت سے چھوٹے بڑے، رنگ برنگے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی جگمگاہٹ پر آنکھ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اس تخت پر ایک دیوتا اور ایک دیوی بیٹھے ہوئے تھے دونوں کے سروں پر جڑاؤ تاج تھے دیوتا کے ہاتھ میں ایک جڑاؤ چھڑی بھی تھی۔

تخت شاہی سیدھا گنگا چمار کے گھر پر اترا۔ اس وقت ٹھیک آدھی رات تھی۔ یکایک فضا میں ایک گولہ بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف نورانی، ہلکی ٹھنڈی اور دودھیا سی روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے پھیلتے ہی گنگا چمار کے گھر سے سوپ بجنے کی آواز سنائی دی۔

دیہات میں دستور ہے کہ گھر میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہو تو تھالی اور لڑکی ہو تو دائی فوراً سوپ بجاتی ہے۔ اس سے آس پاس کے گھروں میں معلوم ہوجاتا ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے۔

سوپ کی آواز سن کر سب کو معلوم ہوگیا کہ گنگا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ابھی سوپ کی آواز بند ہی ہوئی تھی کہ یکایک فضا میں سازوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ کس قسم کے ساز تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بہرحال جس قسم کے بھی ہوں، تھے کچھ عجیب سے جن کو شاید نہ تو کسی نے دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔ کوئی بھی سمجھ نہیں پارہا تھا کہ کیا بجایا جارہا ہے لیکن جو کچھ بھی بجایا جارہا تھا اس میں ایک قسم کی کشش

تھی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ روح کھنچی چلی جارہی ہے۔ ابھی یہ ساز بج رہے تھے کہ گنگا چمار کے گھر میں سے کورس کی دھن میں آواز آنا شروع ہوئی۔اس میں عورتوں اور مردوں دونوں کی آوازیں شامل تھیں۔مگر اس کورس میں کیا تھا؟ اس کے نا تو الفاظ سمجھ میں آرہے تھے اور نہ معنی و مطلب کا اظہار ہورہا تھا۔لیکن اندازہ یہی ہورہا تھا کہ شاید یہ بچی کی پیدائش کے بعد کی دعا ہے۔

رات کے تین بجے کورس ختم ہوا۔اس کے ساتھ ہی ساز کی آوازیں بھی آنا بند ہوگئیں اور پھر گنگا چمار کے گھر سے اٹھتے ہوئے ہالے فضا میں بلند ہوگئے۔ چار بجے صبح دیوتا اور دیوی بھی اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے واپس ہوگئے لیکن اس وقت دونوں بہت زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔

دن نکلنے پر سب لوگ گنگا کے گھر پہنچے تاکہ معلوم ہوسکے کہ تمام رات کیا تماشہ ہوا ہے۔گنگا چمار کو دیکھا تو اس کی حالت بھی غیر تھی۔ بہت ہی گھبرایا اور پریشان تھا۔لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بچی کی پیدائش کے وقت اس کی بیوی کے پاس صرف آسمان سے اتری ہوئی عورتیں تھیں۔ان کے ہاتھوں ہی بچی کی پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے بعد بچی کو کسی خوشبودار پانی میں نہلایا گیا۔آسمان سے لائے ہوئے کپڑے پہنائے گئے۔ دیوتا اور دیوی نے اتر کر خود لڑکی کے سر پر تاج رکھا۔ پھر عورتوں اور مردوں نے مل کر گانا شروع کردیا۔فوجی اور دوسرے لوگوں نے لڑکی کو سجدے کئے۔

دیوتا نے کہا۔’’میں دیوتا برہسپت (Jupiter) اور میری بیوی ،دیوی جونو (Juno) جو بیکنٹھ کی رانی ہے آج بہت خوش ہیں کہ ہماری بیٹی یورانیا (Urania) جو علم ہیت کی دیوی ہے پانچ ہزار سال بعد پھر دنیا میں واپس آئی۔ جس گھر میں یہ پیدا ہوئی ہے ہم اسے وہاں سولہ سال تک رہنے دیں گے۔ پھر اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ آج میں اور میری بیوی بہت خوش ہیں۔‘‘

اور پھر چار بجے سے پہلے پہلے دیوتا اور دیوی بچی کو پیار کرنے کے بعد اپنے تخت پر بیٹھ کر واپس ہوگئے۔

اس واقعہ کے بعد گنگا چمار تو کیا بلکہ نوزائیدہ بچی راج دلاری کی وجہ سے پورے گاؤں کی حالت بدل گئی۔ فصل اچھی ہونے لگی۔لوگوں کے پاس روپے پیسے کی بہتات ہوئی۔ جتنے بیمار تھے سب اچھے ہوگئے۔ ہر شخص ہنسی خوشی کھا پی رہا تھا لیکن خود بچی کی یہ حالت تھی کہ ایک بار بھی اس نے ماں کا دودھ نہیں پیا۔ماں نے جب بھی دودھ پلانے کی کوشش کی تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ بڑی ہونے پر اس نے کبھی کوئی چیز نہیں کھائی جب بھی اسے کھانے کی خواہش ہوئی غیبی طاقتوں نے ہی اسے کھلایا پلایا۔وہی اس کو نہلاتے کپڑے تبدیل کراتے پیدائش کے بعد سے ماں باپ یا کسی اور نے سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ پیروں کے جسم کا ایک بال بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کے اختیارات اور احکامات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی ایک عظیم طاقت کی مالک ہے۔وہ جس وقت جو چاہتی وہی ہوتا۔ویسے وہ کسی کو نقصان بھی پہنچاتی تھی۔ بڑی ہونے کے باوجود اسے بچوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔وہ ان کے ساتھ کھیلتی اور ان سے نامعلوم زبان میں باتیں کرتی۔

ایک روز صحن میں بیٹھی ہوئی ایک بچی کو کھلا رہی تھی کہ نامعلوم اس کے دل میں کیا آیا۔اس نے کسی اجنبی زبان میں کسی کو کچھ حکم دیتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔لمحہ بھر کے اندر ہی دو سانپ آموجود ہوئے۔ یہ ایسے نایاب سانپ تھے جو صرف بھوپال کے علاقہ میں ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی بہت کمی کے ساتھ ان میں سے ایک گھوڑا پچھاڑ اور دوسری چار انگلی کی ناگن تھی۔ یہ دونوں اس قدر خطرناک سانپ ہیں کہ ان کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔

ان دونوں سانپوں کو دیکھ کر سب لوگ گھبرائے

لیکن کر کچھ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ سانپ پہلے تو تن کر سیدھے کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنے پھن اس طرح زمین پر رکھے جیسے وہ راج دلاری کو سجدہ کر رہے ہوں۔

لڑکی کے حکم پر دونوں سانپوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ان کے سامنے وہ اس طرح ناچ رہے تھے کہ جیسے اس کے ازلی غلام ہوں۔ ویسے ان کا ناچ تھا بھی بہت دلچسپ جسے وہ خود اور پاس میں بیٹھے ہوئے بچے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔

ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا نیا واقعہ پیش آتا جس کو گاؤں والے حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور یہ سب ہی ایسے ہوتے جن کے وجود کو عقل تسلیم کرنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری طرف لوگ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ وہ بوڑھا ہو یا جوان، ناممکن تھا کہ اسے دیکھے اور نظر بھکالے۔ وہ تو ایک ایسا حسن تھا جس کا ثانی اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ اس کا شباب ایسا ناقابل تسخیر قلعہ تھا جس پر دنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی قابض نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں اس کو اپنانے کا ایک جذبہ تھا، ولولہ تھا۔ جوش تھا، آرزو تھی۔ دلوں میں چھپے ہوئے کانٹے کسی پل ان کو چین لینے نہیں دے رہے تھے۔ اسی بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے گھر پھیرے لگاتے مگر دور تک کسی طرح رسائی نہیں ہوتی۔ گاؤں تو پھر گاؤں تھا لیکن آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی حسن ملکوتی کی ایک جھلک کے لئے اس کے گھر کا پرکما (طواف) کرتے۔ لیکن راج دلاری ایسی ہستی نہیں تھی جو کسی میں دلچسپی لیتی یا توجہ سے دیکھتی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی شخص کو بھی بات کرنے یا آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کے مالدار لوگ راج دلاری کی پوشیدہ طاقتوں سے واقف نہیں تھے یا پھر اس کی طاقت کو اپنی طاقت کے آگے ہیچ سمجھتے تھے۔

شاید اسی لئے منڈوائی کے پٹیل کے لڑکے رنجیت سنگھ نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ ویسے رنجیت سنگھ بذات خود بہت حسین جواں تھا۔ لیکن تھا آوارہ...... روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ جوانی کا نشہ چڑھا تو گاؤں میں ہاتھ پیر نکالنا شروع کر دیئے۔ پہلے تو اس نے نیچ ذات کنیاؤں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا جب یہاں کچھ مہارت حاصل ہو گئی تو اونچی پروازیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں کے علاوہ آس پاس کے بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں رہے۔

راج دلاری کی پیدائش اور اس سے متعلق مافوق الفطرت حالات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ دور دور تک ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ ان کی بناء پر سب ہی اسے دیوی مانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس سے یہ دیوی خوش ہو جائے وہ نہال ہو سکتا ہے لیکن جس سے یہ ناراض ہو جائے اس پر بڑی سے بڑی مصیبت آ سکتی ہے لیکن نوجوان طبقے کو اس پر یقین نہیں تھا اور نہ وہ راج دلاری کی طاقت کو گردانتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ رنجیت سنگھ نے رام پور کی ہیرا پھیری شروع کر دی۔ انوپ سنگھ اپنے بیٹے کے کرتوت خوب جانتا تھا۔ اس کے علم میں جب یہ بات آئی تو بیوی کو پابند کیا کہ وہ بیٹے کو سمجھائے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو تو اپنی جوانی اور طاقت پر گھمنڈ تھا۔ ماں کی بات ماننے کے بجائے اپنی جوانی کا زعم دکھانے لگا وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ کوئی بھی اس کے مقابلہ میں نہیں آ سکتا۔

انوپ سنگھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بیٹے نے ماں کی بات کی کوئی پرواہ نہیں کی تو اسے سخت افسوس ہوا۔ وہ پہلے ہی بیٹے کی بدکرداراور تکبر کی وجہ سے نالاں تھا مگر اسے یہ امید تھی کہ ممکن ہے کہ وہ راہ راست پر آ جائے اور باپ دادا کو رسوا کرنے کے بجائے ان کا نام روشن کرے لیکن یہ امید موہوم تھی بظاہر اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادہ نے راج دلاری کے چکر میں رام پور کے پھیرے لگانا شروع کر دیئے ہیں تو اسے

سخت فکر ہوئی۔ پھر اس کے سمجھانے پر بھی جب بیٹا نہیں مانا تو وہ سمجھ گیا کہ اب اس پر کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے۔ یہ اس کا تجربہ تھا کہ کمین کو اگر سمجھایا جائے تو اکثر بات اس کی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن جب کوئی شریف زادہ بے لگام ہوجائے اور گری ہوئی حرکتیں کرنے لگے تو اس کی سمجھ میں پھر کوئی بات نہیں آتی ہے اور وہ سمجھانے والے کو بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔

پہلے تو رنجیت سنگھ کئی دنوں تک رام پور کے پٹیل کے گھر جاتا رہا پھر اس نے گنگا چمار کے گھر کے چکر لگانا شروع کردیئے۔ لیکن ان چکروں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ راج دلاری یا اس کے گھر والوں نے اس کے چکر لگانے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ آخر مجبور ہو کر ایک روز رنجیت سنگھ نے رام پور پہنچنے کے بعد گنگا چمار کو پٹیل کی بیٹھک میں بلوالیا۔

پٹیل اور اس کے لڑکوں کو رنجیت سنگھ کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔ اب تک صرف اس خیال سے کہ یہ بھی منڈوائی کے پٹیل کا لڑکا ہے اور اس کے باپ کے ساتھ بھی گھریلو تعلقات ہیں یہ لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے رہے۔ لیکن اس کے بار بار آنے اور پھر گنگا چمار کے گھر کے پھیرے لگانے سے یہ ناراض تھے۔ دوسرے دیہاتوں میں بہن یا بیٹی کی عزت وآبرو کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے خواہ وہ کسی قوم اور گھرانے کی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کی آمد کو اچھا خیال نہیں کرتے تھے اور ان باتوں کی اطلاع وہ انوپ سنگھ کو دینے والے تھے لیکن ان کے اطلاع دینے سے پہلے ہی رنجیت سنگھ نے آدمی بھیج کر گنگا کو بلالیا۔ رام پور کے پٹیل نے جب گنگا کو بیٹھک میں آتے دیکھا تو انہیں بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ گنگا ہونے کو اب بھی چمار ہی تھا لیکن راج دلاری کے جنم لینے کے بعد سے جو واقعات پیش آرہے تھے ان کی بنا پر اس کو جو عزت ومنزلت تھی اس کا لحاظ ہر چھوٹا بڑا کرتا تھا۔

''کہو گنگا کیسے آنا ہوا؟'' پٹیل نے پوچھا۔

''سرکار، ان منڈوائی والے چھوٹے بھیا جی نے آدمی بھیج کر بلایا ہے۔'' گنگا نے رنجیت سنگھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ بات سن کر رام پور کے پٹیل کو بڑا تعجب ہوا۔ لیکن گنگا آہی گیا تھا اس لئے کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ یہی بہتر سمجھا کہ خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھیں لیکن دل میں ضرور ڈر رہے تھے کہ دیکھو اب کیا تماشا ہوتا ہے۔

''کہو گنگا جی خیریت سے تو ہو؟'' رنجیت سنگھ نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''میں نے اس لئے تکلیف دی تھی کہ تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔''

''کہو چھوٹے بھیا جی؟''

''یہ تو تم جانتے ہی ہو گنگا جی کہ اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں بھیا جی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم راج دلاری کو میرے ساتھ بھیج دو۔ اس کو کسی بات کی تکلیف نہیں......''

ابھی رنجیت سنگھ اپنی بات پوری کرنے نہیں پایا تھا کہ کسی پوشیدہ طاقت نے اس کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ اس کے تین چار دانت ٹوٹ کر باہر گر پڑے اور ابھی وہ سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ کسی نے اسے اٹھا کر بیٹھک سے باہر ہوا میں اچھال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پچاس ساٹھ گز دور ایک گڑھے میں جا گرا۔

یہ پورا کھیل زیادہ سے زیادہ ایک دو منٹ میں ختم ہوگیا۔ بیٹھک میں موجود آدمیوں کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آیا تھا۔ کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ اور جب ان کی سمجھ میں آیا تو رنجیت دور گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔

گنگا یہ تماشا دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ راج دلاری کا غصہ کی وجہ سے منہ سرخ ہورہا ہے۔ اور وہ طیش کے عالم میں آنگن میں ٹہل رہی ہے۔ گنگا رام خاموش کھڑا ہوا بیٹی کو دیکھتا رہا پھر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

"شریف ماں باپ کی کمین اولاد کا یہی حشر ہوتا ہے۔" پنڈت نے حسرت اور افسوس کے ساتھ دوسرے لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اب چل کر اسے اٹھا کر انوپ سنگھ کے پاس روانہ کردو۔"

لوگ ہمت کر کے آگے بڑھے لیکن گڑھے کے پاس پہنچ کر سب کے منہ سے یکایک چیخیں نکلیں اور وہ فوراً تیزی سے پلٹ کر دوڑتے ہوئے بیٹھک میں آگئے۔ ڈر کی وجہ سے سب کے چہرے سفید ہورہے تھے۔ ان لوگوں کی چیخیں سن کر گاؤں کے اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے لیکن کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ کچھ لوگوں نے ان سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن خوف کی وجہ سے ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

یکایک رنجیت سنگھ کے جسم میں حرکت شروع ہوئی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ اٹھنے کی کوشش کررہا ہے۔ تمام لوگ اس کے ہلنے جلنے پر گڑھے کی جانب دیکھنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ کوشش کر کے کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کا پورا لباس بدن سے ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بدن سے کپڑے اتار کر کسی نے نیچے ڈال دیئے ہوں۔

کپڑوں کے نیچے گرتے ہی سب دیکھنے والے چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ نوجوان لاٹھیاں اور بلم لئے ہوئے ایک جگہ اکٹھا ہوکر مقابلہ کے لئے تیار کھڑے ہوگئے۔ لیکن یہ تمام ہنگامہ صرف رنجیت سنگھ کی وجہ سے تھا۔ اس لئے کہ جب اس کے جسم سے کپڑے پھسل کر نیچے گرے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا سر منہ، ہاتھ، پیر، پیٹھ غرض جسم کے ہر حصے میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور ہر پھوڑے میں سے ایک ناگ اپنی گردن باہر نکالے زبان کو ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

رنجیت سنگھ کھڑے ہونے کے بعد چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھراس کے منہ سے دل ہلا دینے والی بھیانک چیخیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا جنگل میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ دوسرے دن جب اس کی لاش جنگل میں ملی تو پوری کی پوری ایسی کالی تھی جیسے کسی نے کالک مل دی ہو۔

رام پور میں رنجیت سنگھ کی جو درگت بنی تھی اس کا چرچا گاؤں گاؤں ہورہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ان اوباش نوجوانوں نے جو راج دلاری کو رام کرنے کی فکر میں تھے اپنے ارادے بدل دیئے اور اب کوئی بھی رام پور کے راستے سے گزرنے کو تیار نہیں تھا۔

کچھ دن کے بعد رام کے ایک برہمن کی لڑکی کی شادی تھی۔ بارات مرہٹے گاؤں سے آئی تھی۔ ایک تو گاؤں کی لڑکی کی شادی اور وہ بھی برہموں کے یہاں اسی لئے گاؤں کے سب ہی لوگ ہنسی خوشی شریک ہوئے تھے۔ بارات کے آنے پر بڑی چہل پہل تھی۔ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ مہمانوں کا سواگت کیا جارہا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ باراتی کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد تفریح میں وقت گزارنے لگے۔ بڑے بوڑھے جگہ جگہ بیٹھے باتوں میں مصروف ہوگئے نوجوان لڑکے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ان ہی لڑکوں میں ایک لڑکا جگدیش نارائن بھی تھا۔ اس میں ویسے تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ عام لڑکوں کی طرح وہ بھی ایک لڑکا تھا۔ چھریرہ بدن، سانولا رنگ معمولی خدوخال مگر تھا بہت مہذب اور شرمیلا عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کا ہوگا مزاج اور طبیعت عام لڑکوں سے ہٹ کر تھی۔ نہ کبھی شرارت کرتا نہ کھیل کود میں شریک ہوتا۔ اسے تنہائی بہت زیادہ پسند تھی۔ گھر پر بھی یا تو سب سے الگ اپنی کوٹھڑی میں رہتا یا پھر جنگلوں اور کھیتوں کی جانب ٹہلنے نکل جاتا۔ اس کی اس عادت کو گھر کے لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر ٹوکتے بھی رہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ جگدیش کو انسانوں سے یا تو نفرت ہے یا پھر وہ ان سے خوف کھاتا ہے۔ گھر میں بھی تنہا پڑا خلاء میں یوں گھورا کرتا، جیسے کسی چیز کو تلاش کررہا ہو۔ جب بھی اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ ٹال گیا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ بارات کے ساتھ رام پور آنے کے بعد کچھ دیر تک لڑکوں کے ساتھ گاؤں کی گلیوں میں پھرا پھر ان سے علیحدہ ہوکر ندی کے کنارے ٹہلتا ہوا چلا گیا۔ اس کی یہ پرانی عادت ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی۔

جب وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کافی دور نکل گیا تو یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دور آ گیا ہے۔ اس نے جائزہ لینے کے لئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ اس وقت ندی کے کنارے کھڑا ہوا تھا، ہر طرف کھیت تھے لیکن فصل کٹ چکی تھی اس لئے دور دور تک کسی آدم کا وجود نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر رام پور کو دیکھا۔ گاؤں کافی فاصلہ پر نظر آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹہلتا ہوا کئی میل دور نکل آیا تھا۔ دھوپ کافی تیز تھی اس لئے سوچا کہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے تھوڑی دیر آرام کے بعد گاؤں واپس چلے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی سایہ دار درخت قریب میں نہ تھا۔ یکایک اس کی نظر ایک جانب پڑی چند قدم کے فاصلہ پر ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ خیالوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے اس نے اس مندر کو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔

یہ ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی لیکن اب آدھے سے زیادہ منہدم ہوچکا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ صدیوں سے یہاں کوئی آیا ہی نہیں۔ جگدیش نے سوچا کہ چلو اسے دیکھیں تو یہ کیسا مندر ہے؟ یہیں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد گاؤں واپس چلے چلیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مندر کی جانب بڑھا۔ لیکن مندر کی بناوٹ دیکھ کر بڑا تعجب ہورہا تھا کہ یہ کس قسم کا مندر ہے۔ اس طرح کا مندر تو اس نے آج تک دیکھا نہیں تھا۔

یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا اور وہ

پوچھنے لگا۔ "یہ غلط ہے کہ میں نے اس بناوٹ کا مندر آج تک نہیں دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ میں ایسے مندروں کو جانتا ہوں۔ میں ان کو مدتوں سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اپنے جنم لینے سے بھی ہزاروں سال پہلے میں ان کو جانتا تھا۔ لیکن ایسے مندر کہاں دیکھے ہیں، کب سے میں جانتا ہوں؟" یہ بات اسے بالکل یاد نہیں آرہی تھی اور جیسے جیسے وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا اس کا دماغ الجھتا جاتا۔ مگر دماغی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ مندر کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے کوئی نامعلوم طاقت اسے کھینچ کر وہاں لے جارہی ہو۔

"اوہو...... اب یاد آیا" یکا یک اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس قسم کے مندروں کی تصویریں اس نے اپنے باپ کی پشتک میں بنی ہوئی دیکھی ہیں۔ اور ان کے بارے میں پتا جی نے بتایا تھا کہ بیٹے یہ پشتک اپنے باپ دادا اور ان کے بھی باپ داداؤں سے ہمارے پاس چلی آرہی ہے۔" اس کو یاد آیا کہ یہ پشتک کاغذ کے بجائے کسی جانور کی کھال پر لکھی ہوئی تھی۔

وہ یہی سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جس طرح کی تصویریں اس نے پتا کی پشتک میں بنی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ مندر بھی بالکل اسی طرح کا تھا۔ مندر کے بارے میں یاد آجانے پر جو حیرانگی اور ایک نامعلوم سا خوف اس کے دل میں تھا اس کے بجائے اب ایک قسم کی خوشی کا احساس ہورہا تھا۔ اس وقت اس کو یہ محسوس ہورہا تھا کہ جیسے وہ اپنے جانے پہچانے مندر میں ہی جارہا ہے۔

جگدیش جس وقت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یکا یک ایک تیز جھونکا اندر سے آیا اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی خوشبو ہے۔

ایسی خوشبو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ کتنی اچھا ہے یہ خوشبو بھینی بھینی، میٹھی میٹھی، مست کرنے والی خوشبو۔ ایسی خوشبو جس کے سونگھنے سے آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں اور پھر آدمی سو جائے۔

اور واقعی وہ سونے لگا تھا۔ اس کو اتنا احساس تو ضرور تھا کہ خوشبو کے اثر سے اس کی آنکھیں بند ہورہی ہیں اور اب وہ دالان میں کھمبے سے ٹیک لگا کر سو رہا ہے۔

مگر یہ اس کی بھول تھی۔ بظاہر وہ سو رہا تھا لیکن اس کے دل و دماغ برابر کام کررہے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد اس کے کانوں میں سازوں کی عجیب قسم کی دھنیں سنائی دینے لگیں۔ ان دھنوں کو وہ سمجھ تو نہیں پارہا تھا لیکن ان دھنوں پر اس کو اپنی روح کھنچتی اور بیدار ہوتی معلوم ہورہی تھی۔

ابھی خوشبو اور سازوں کے بارے میں وہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ یکا یک اسے پورے مندر میں نورانی روشنی پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی جس میں تیزی کے علاوہ ایک قسم کی خنکی اور لطافت بھی تھی۔ دودھیالی ہونے کے باوجود ہر چیز بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس نورانی روشنی میں شکستہ مندر اور دیوار پر بنی ہوئی کسی دیوتا کی شبیہ کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ مگر پلک جھپکتے ہی جب اسے نے دوبارہ دیکھا تو منظر ہی دوسرا تھا۔

اب وہاں شکستہ مندر کے بجاء ایک بہت بڑے مندر کی عمارت تھی۔ سامنے کی دیوار ہٹ چکی تھی اور حد نظر تک مندر ہی مندر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ یہ مندر کے ساتھ ساتھ کسی دیوتا کے رہنے کی جگہ بھی ہے۔ لوگ اس میں بڑی آزادی کے ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ یہ لوگ بڑے اچھے قسم کی ریشمی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھے لیکن عورتوں اور مردوں کے باندھنے کا انداز جدا جدا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ آج یہاں یا تو کوئی تہوار ہو یا کسی بات کی خوشی ہے۔ سب ہی خوش خوش نظر آرہے تھے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔

جگدیش ابھی یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ یکا یک اس کی نظر اپنے جسم پر پڑی۔ حیرت کی وجہ سے

اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ تعجب کے ساتھ اپنے جسم کے لباس کو دیکھ رہا تھا۔ جو لباس وہ پہن کر آیا تھا اس کے بجائے وہ بھی اب ایسی ساڑھی باندھے ہوئے تھا جیسے اس وقت اور لوگ باندھے ہوئے چل پھر رہے تھے اور ساڑھی کا ایک پلو اس کے کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ پیروں میں سنہری کھٹ پٹیا تھیں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سر پر ایک چھوٹا تاج بھی تھا اور وہ زمین کے بجائے پالکی نما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خود کو دیکھنے کے بعد جب آس پاس نظر دوڑائی تو اپنے چاروں طرف خادم کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ لوگ بھی نفیس ساڑھیاں باندھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بھی پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔

ان سب لوگوں نے جگدیش کی جانب دیکھتے ہوئے خوشی کے تین نعرے بلند کر کے کرسی اپنے کاندھوں پر اٹھالی اور پھر بھجن گاتے ہوئے مندر کے اندر چلنے لگے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جس سمت سے اس کی سواری گزرتی لوگ ادب کے ساتھ گردنیں جھکا کر کھڑے ہو جاتے اس وقت جگدیش کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور کس لئے ہو رہا ہے؟ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے لئے ہر شخص نیا تھا اس لئے کسی سے وہ کوئی بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ لوگ کافی دیر تک چلنے کے بعد اس کی سواری لئے ہوئے ایک بڑے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو آگے جانے کی ممانعت ہے۔ خادموں نے اس کی سواری زمین پر رکھی اور پھر سب لوگ سینوں پر ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

یکا یک دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا اور پھر اسے سامنے ایک چبوترہ نظر آیا۔ جہاں ایک دیوتا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی اندر سے اس کے پاس پہنچا۔ ادب کے ساتھ کرسی سے کھڑا کرتے ہوئے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے پر جگدیش نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا سامنے کے چبوترے پر تخت نما چار کرسیاں تھیں۔ ان میں سے بیچ کی کرسیوں پر ایک دیوتا اور ایک دیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوی کے پاس ہی کرسی پر ایک بارہ برس کی بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور دیوتا کے پاس والی کرسی خالی تھی۔ اس کے قریب پہنچنے پر دیوتا نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "آؤ میرے بیٹے میں تو ہزاروں سال سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں دیوتا برہسپت (JUPITER) اور دیوی سیملے (SEMELE) کا بیٹا شراب کا دیوتا باکس (BACHUS) ہوں۔ تم میرے بیٹے، مسرت و شادمانی کے دیوتا کومس (COMUS) ہو۔ یہ تمہاری ماں دیوی سرسے (CIRCE) ہے اور یہ برہسپت کی لڑکی یورانیا ہیئت کی دیوی ہے۔

بیٹا جو کچھ میں نے بتایا اس میں حیران ہونے کی بات نہیں ہے۔ ایک بات یاد رکھو کہ دیوتاؤں کی طاقت بھی ایک حد پر پہنچنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں سے ایک عظیم طاقت شروع ہوتی ہے جو ہر طاقت پر حاوی ہے۔ اسی عظیم طاقت نے تمہیں بھی ہزاروں سال بعد پیدا کیا اور آج کا دن تم سے ملنے کے لئے مقرر کیا۔ آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو یہ کرسی تمہارے لئے ہے۔"

دیوتا باکس کی بات ختم کرنے کے بعد ایک راہب جگدیش کو لئے ہوئے آگے بڑھا۔ راہب نے پہلے اسے باپ کے قدموں میں جھکایا۔ اس کے جھکتے ہی دیوتا نے اس کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ باپ کے ہاتھ پھیرتے ہی چاروں طرف سے سازوں کی آوازیں آنے لگیں اور فوراً ہی اوپر سے پھول برسنا شروع ہو گئے۔

دیوتا باکس کے ہاتھ پھیرنے کے بعد راہب

ئے دیوی سیملیے کے قدموں میں جھکایا۔ دیوی نے پہلے تو سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پھر اسے اٹھا کر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ بیٹے کو سینے سے لگانے کے بعد ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ لیکن اس کے آنسو زمین پر نہیں گر رہے تھے بلکہ گالوں سے ڈھلک کر نیچے جاتے تو دو بہت ہی خوبصورت چڑیاں آ کے وہ ان کو اپنی چونچوں میں لے لیتیں۔ بڑی دیر کے بعد جب ماں بیٹوں کا جی سنبھلا تو دیوتا باکس نے کہا۔"

"میری خواہش تو یہ تھی کہ تم دیوتاؤں کے گھر ہی پیدا ہوتے لیکن اس عظیم طاقت نے جس کے آگے دیوتا بھی مجبور ہیں تمہیں فانی انسان کے یہاں پیدا کیا۔ ویسے جہاں تمہیں پیدا کیا گیا ہے وہ بھی دیوتاؤں کی اولاد ہیں لیکن اب وہ فانی ہیں۔ تمہارے اصل ماں باپ ہم ہیں وہ لوگ نہیں۔ یورانیا بھی ایک فانی انسان کے یہاں پیدا ہوئی اس کے اصلی ماں باپ دیوتا ہیں لیکن اب جس کے یہاں اس نے جنم لیا ہے وہ بھی دیوتاؤں کی اولاد ہیں مگر فانی ہیں۔

ہزاروں سال پہلے پچھلے جنم میں تمہاری شادی یورانیا کے ساتھ طے ہوئی تھی لیکن اس وقت یہ کام تکمیل تک پہنچنے میں اس عظیم طاقت کی مرضی نہیں تھی اس لئے دیوتاؤں کی کوشش کے باوجود تم دونوں مر گئے۔

اب پھر تم دونوں نے جنم لیا ہے لیکن دیوتا یہمپت تو یورانیا کو آب حیات لا کر غسل دے چکا ہے اس لئے وہ نورانی ہو چکی ہے لیکن تمہیں اولمپیا پہاڑ پر جا کر آب حیات کا چشمہ تلاش کرنا ہے۔ اگر تم چشمہ تلاش کر کے غسل کر سکے تو پھر تمہاری اور یورانیا کی شادی ہو جائے ورنہ تم فانی ہونے کی وجہ سے دنیا میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکو گے اور یورانیا کو تمہارے دوبارہ جنم لینے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تمہارا آب حیات سے غسل کرنا ضروری ہے اس لئے کہ فانی اور غیر فانی اکٹھا نہیں رہ سکتے۔"

دیوتا باکس کی بات ختم ہونے پر یورانیا اپنی جگہ سے اٹھ کر جگدیش کے قریب پہنچی۔ وہ بھی اسے آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ یورانیا اپنے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں لئے ہوئے تھی۔ اس نے آدھی ڈالیاں جگدیش کو دیتے ہوئے کہا "کومس۔ میں ہزاروں سال سے تیری آمد کی منتظر تھی۔ تیرے دوبارہ جنم لینے پر میری دلی خواہش تو پوری ہو گئی لیکن افسوس ہے کہ تو ابھی تک فانی ہے اس لئے میں تجھے پیار نہیں کر سکتی کیونکہ میرے بوسے کی لمس سے تیری سانس ختم ہو جائے گی اور مجھے پھر ہزاروں سال تیرے دوبارہ جنم لینے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"بیٹے کومس اب تم روانہ ہو کر اولمپیا جاؤ لیکن راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ جاؤ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

یکا یک جگدیش کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے جھنکا دے کر نیند سے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو زور زور سے ملا اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دھوپ کی تیزی کی وجہ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ جو کچھ وہ اب تک دیکھتا رہا تھا اس کے بجائے اب وہی شکستہ مندر تھا جہاں وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے وقت کا اندازہ کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ابھی آ کر ہی بیٹھا ہے۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ یکا یک اس کی نظر اپنے پر پڑی جس میں نامعلوم قسم کے پھولوں کی بڑی خوبصورت ڈالیاں تھیں۔ جو کچھ دیکھا وہ سب صحیح تھا مجھے آب حیات کے لئے اولمپیا جانا ہی ہوگا۔ میری یورانیاں اور میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہونگے۔" جگدیش نے اپنے دل میں کہا اور پھر اس کے منہ سے نامعلوم زبان میں الفاظ نکلنا شروع ہو گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ وہ جگدیش ہی نہیں جو اب سے کچھ لمحوں پہلے یہاں آیا تھا۔

وہ پھولوں کی ڈالیاں ہاتھ میں لئے ہوئے رام پور روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں جب وہ گنگا چمار کے گھر کے قریب پہنچا تو چلتے چلتے یکا یک ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا

معلوم ہورہا تھا کہ جیسے آگے بڑھنے کے لئے اس کے قدموں میں جان ہی نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے صحن میں راج دلاری کھڑی ہوئی تھی۔ وہی صورت، وہی قد، وہی رنگ روپ تھا جس کو ابھی مندر میں دیکھ کر آیا تھا۔ راج دلاری کے ہاتھ میں بھی وہی پھولوں کی ڈالیاں تھیں جو اس کے ہاتھ میں تھیں "یورانیا" یکا یک اس کے منہ سے نکلا۔

"کومس" اس کو جواب سنائی دیا۔ "آؤ تم اپنی یورانیا سے دور کیوں کھڑے ہو؟"

اور پھر ایسا معلوم ہورہا تھا کہ جیسے مقناطیسی طاقت جگدیش کو کھینچ رہی ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے راج دلاری کے پاس پہنچا اور پھر دونوں بے اختیار ہوکر ایک دوسرے سے ایسے لپٹ گئے جیسے ہزاروں برس کے بچھڑے ہوئے مل رہے ہوں۔ یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ یکا یک محبت کے سیلاب میں بہتے ہوئے اور جذبات سے مغلوب ہوکر راج دلاری نے جگدیش کو پیار کرلیا...... لیکن یہی پیار جگدیش کے لئے پیام اجل تھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی اور چند لمحوں کے بعد ہی وہ مردہ حالت میں اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

راج دلاری نے جگدیش کو مردہ حالت میں دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اس چیخ کو سن کر عورتیں اور مرد گنگا چمار کے گھر کی جانب دوڑے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہر شخص دور کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جگدیش مردہ حالت میں راج دلاری کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے۔ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور وہ جگدیش کی لاش کو سینے سے لگائے ہوئے بڑبڑا رہی ہے "اوہ کومس یہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر کیا کیا مجھے تمہیں پیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم تو فانی تھے اسی وجہ سے میں نے دیوتا باکس کے دربار میں بھی پیار نہیں کیا تھا۔ مگر محبت کے جوش میں مجھ سے کیسی بھول ہوئی۔ اب پھر مجھے تمہارا ہزاروں سال انتظار کرنا ہوگا۔ میرے کومس تم عظیم طاقت سے کہنا کہ تمہاری یورانیا تمہارا انتظار کررہی ہے۔ اس لئے وہ تم کو جلد ہی بھیج دیں۔

اپنی بات پوری کرنے کے بعد اس نے جگدیش کی لاش کو نیچے رکھا۔ جھک کر آخری بار پیار کیا۔ ہاتھ میں تھامے ہوئے پھول سینے پر رکھے کھڑے ہوکر اسے بغور دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اور روتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

جگدیش کے ماں باپ اور عزیز واقارب کی حالت غیر تھی۔ گاؤں کا ہر فرد افسردہ اور پریشان تھا۔ راج دلاری کے کوٹھری میں چلے جانے کے بعد لوگ جگدیش کی لاش اٹھا کر لے گئے اور پھر اس کے کریا کرم میں آس پاس کے تمام گاؤں کے لوگ شریک ہوئے۔ سب ہی طرح طرح کی باتیں کررہے تھے لیکن کسی کو بھی اصلیت کا پتہ نہیں تھا۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے بہت کم راج دلاری کو دیکھا۔ ماں باپ اس کی صورت کو ترس گئے۔ ہفتوں وہ کوٹھری سے باہر نہیں آتی۔ اور اگر آتی بھی تو کچھ دیر کے لئے اور پھر واپس کوٹھری میں چلی جاتی۔

غرض اسی طرح سولہ برس پورے ہونے کو آئے۔ کہ چاند کی چودہ تاریخ کی رات میں یکا یک آسمان سے پھر ہالے اترنا شروع ہوئے۔ ان ہالوں سے نورانی مخلوق کی آمد شروع ہوئی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ان لوگوں کی وضع ایلچیوں جیسی تھی۔ ان کے ساتھ فوجی سوار دستے بھی تھے۔ یہ سب کے سب گنگا چمار کے گھر میں اترے۔ ان لوگوں نے پہلے تو راج دلاری کو سجدہ کیا دوبارہ کھڑے ہونے کے بعد ایک آدمی فرمان لئے ہوئے آگے بڑھا اور پھر دوزانو ہونے کے بعد اس نے یہ فرمان راج دلاری کو پڑھ کر سنایا۔ اس عرصہ میں راج دلاری خاموشی کے ساتھ کھڑی سنتی رہی۔ فرمان ختم ہونے کے بعد وہ سب گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔

شاید وہ جواب کے منتظر تھے۔

راج دلاری خاموش کھڑی ہوئی کسی بات پر غور کررہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل

دماغ میں کوئی ایسی الجھن ہے جس کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے نظر اٹھا کر سب کو دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھی اور پیامبر کے سامنے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر گردن خم کر دی۔ اس کے گردن خم ہوتے ہی سب لوگوں نے ایک نعرہ بلند کیا۔ لیکن یہ نعرہ کیا تھا کوئی بھی سمجھ نہ سکا۔ جب یہ لوگ نعرہ لگا کر خاموش ہوئے تو راج دلاری نے اپنی گردن سیدھی کر کے ایک ہاتھ دراز کیا اور ساتھ ہی نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کو سن کر نورانی مخلوق نے پھر نعرہ بلند کیا اور راج دلاری کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ اور پھر سجدے سے اٹھنے کے بعد جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس ہو گئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد راج دلاری سونے کے بجائے تمام رات ٹہلتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات اسے پریشان کئے ہوئے ہے۔ آخر دن نکلنے پر اس نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماں''

''میری بیٹی۔ میری لاڈو'' ماں نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا ''ماں'' راج دلاری بے چین ہوتے ہوئے بولی اور پھر دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

جب سے راج دلاری پیدا ہوئی تھی یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ اس طرح ماں سے لپٹی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بڑی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی روتی رہیں۔ آخر جب کچھ آنسو تھمے تو ماں سے علیحدہ ہونے کے بعد راج دلاری نے باپ کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔

''پتا جی''

''بیٹی'' گنگا چمار نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس وقت خود اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''پتا جی...... میرے جانے کا وقت آ گیا ہے''

''کیسا وقت بیٹی؟'' ماں باپ نے یک زبان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ماں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں دیوتا برہسپت کی بیٹی ہوں۔ البتہ دنیا میں دوبارہ آنے کے لئے میں تمہارے پیٹ میں رہی اور تمہارے یہاں پیدا ہوئی اس لئے تم بھی میرے ماں باپ ہو یہی وجہ ہے کہ تمہیں چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔

رات کو دیوتا پتا اور دیوی ماتا کے پاس سے بلاوے کا سندیسہ آیا تھا۔ میں اگلے مہینے آج کی رات چلی جاؤں گی۔ لیکن وعدہ کرتی ہوں کہ ہر سال پورنماشی کی رات تمہارے پاس آیا کروں گی۔ اس کے علاوہ جب بھی تم بلاؤ گی میں ہر حالت میں تمہارے پاس آؤں گی لیکن خواب میں۔ اور جب تم اس دنیا میں نہیں رہو گے تو بھی میں تمہاری سمادھی پر آؤں گی۔

میرے جانے کے بعد بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تمہاری حفاظت کے لئے میں ایک ایسی طاقت چھوڑ جاؤں گی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت نہیں کر سکے گی۔

لیکن اس ایک مہینے میں راج دلاری کی عجیب حالت تھی۔ کبھی وہ خوش ہوتی اور کبھی روتی۔ ماں باپ کے ساتھ بھی وہ بہت زیادہ گھل مل گئی تھی۔ اب وہ اکثر ماں کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتی۔

گھر کا کام بھی وہ بڑی محنت کے ساتھ کرنے لگی تھی۔ پورے مہینے اس نے کام میں ماں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کھانا پکاتی، برتن صاف کرتی، جھاڑو دیتی، ماں کے کپڑے دھوتی۔ جس طرح اور گھر گرہست لڑکیاں گھروں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی اور کام کاج کرتیں لیکن رونا اور ہنسنا اب بھی اس کا بند نہیں ہوا تھا۔

آخر کار وہ رات آ ہی گئی جس کی آمد سے راج دلاری کے ماں باپ خوف زدہ اور پریشان تھے۔ کئی دن پہلے سے ماں باپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ راج دلاری بڑی محنت سے کھانا تیار کرتی اور پھر بڑی چاہت کے ساتھ ماں کے منہ میں نوالہ ڈالتی۔

مگر گنگا چمار اور اس کی بیوی کو کسی حالت قرار نہیں تھا۔ پریشانی کی وجہ سے ان کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ جب دونوں یہ سوچتے کہ ان کی جوان بیٹی ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہونے والی ہے تو ان کے کلیجے پھٹنے لگتے۔ وہ انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں تھے لیکن کر کچھ بھی نہیں سکتے تھے۔

پورنماشی کی رات میں ایک بار پھر آسمان سے ہالے اترنا شروع ہوئے وہی سازوں کی آوازیں تھیں اور پہلے کی طرح آج بھی فضا معطر تھی۔

تخت اترنے کے بعد راج دلاری اپنی کوٹھری میں سے نکلی اس وقت وہ نور میں نہائی ہوئی حریری لباس میں ملبوس اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ نورانی لڑکیاں تھیں جو اس کے لباس کو تھامے ہوئے چل رہی تھیں۔

تخت کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے نظر جھکائے ادب کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ دیوتا اور دیوی اپنے تخت سے اترے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہت ہی خوبصورت تاج تھا جس کو انہوں نے راج دلاری کے سر پر رکھ دیا۔

تاج سر پر رکھتے ہی عورتوں مردوں کو ملا جلا کر کورس شروع ہوا۔ کورس کے خاتمہ پر راج دلاری دیوتا اور دیوی کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ خاموش کھڑے رہنے کے بعد تینوں آگے بڑھتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں گنگا چمار اور اس کی بیوی بت بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ یہ لوگ پہلے تو ان کے پاس خاموش کھڑے رہے۔ اس کے بعد دیوتا اور دیوی نے اپنے اپنے سیدھے ہاتھ پھیلا کر ان سے کچھ کہنا شروع کیا۔ پھر بات ختم کرنے کے بعد گردنیں جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

یکا یک راج دلاری آگے بڑھی اور پھر زمین دوز ہوتے ہوئے اس نے ماں کے پیر پکڑ لئے۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

بڑی دیر رونے کے بعد راج دلاری نے ماں کے سینے سے علیحدہ ہو کر باپ کے پیر پکڑ لئے۔ گنگا چمار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اس نے بیٹی کو کھڑا کیا اور بڑی دیر تک اس کی پیٹھ اور شانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

دیوی دیوتا اب بھی سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ یکا یک نقیب نے روانی کا اعلان کیا اس اعلان کو سنتے ہی راج دلاری ایک بار پھر ماں سے لپٹ کر جھول گئی۔

نقیب کے اعلان کے دہرانے پر راج دلاری ماں کے سینے سے علیحدہ ہو کر دیوی دیوتا کے بیچ میں آ کھڑی ہوئی۔ تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے تخت پر جا بیٹھے۔ یکا یک فضا سازوں کی طربیہ دھن سے گونج اٹھی اور پھر جس ترتیب سے یہ نورانی مخلوق اتری تھی اسی طرح روانہ ہوگی۔

راج دلاری کے جانے کے بعد دونوں میاں بیوی کئی برس زندہ رہے لیکن ان کا پورا سال پورنماشی کے انتظار میں گزرتا اور پھر وہ دن گزرنے کے بعد دوبارہ اس کا انتظار دیکھنے لگتے۔

راج دلاری ان کے ساتھ نہیں تھی لیکن دونوں کے دل راج دلاری کی یاد سے آباد تھے۔

یہ گنگا چمار اس کی بیوی اور جگدیش کی سادھی ہے۔ اب بھی ہر پورنماشی کی رات کو راج دلاری پابندی کے ساتھ پہلے ماں باپ کی سادھی پر آتی ہے اور پھر جگدیش کی سادھی پر صبح تک رہنے کے بعد واپس چلی جاتی ہے۔"

سادھو کہانی ختم کرنے کے بعد خاموش ہوگیا۔ وہ اس وقت خلا میں اپنی آنکھیں لگائے ہوئے نہ معلوم کیا تلاش کر رہا تھا۔

صبح ہونے والی تھی۔ پانی بھی تھم گیا تھا اس لئے میں بھی روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

روح کا انتقام

ایس۔امتیاز احمد۔کراچی

ایک انجانی قوت زور زبردستی نوجوان کو قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔اور آخر کار وہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ پھر اچانک وہ ایک قبر پر گرا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے گرد سائے وحشیانہ رقص کر رہے ہوں۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک......اچھوتی اورانوکھی کہانی

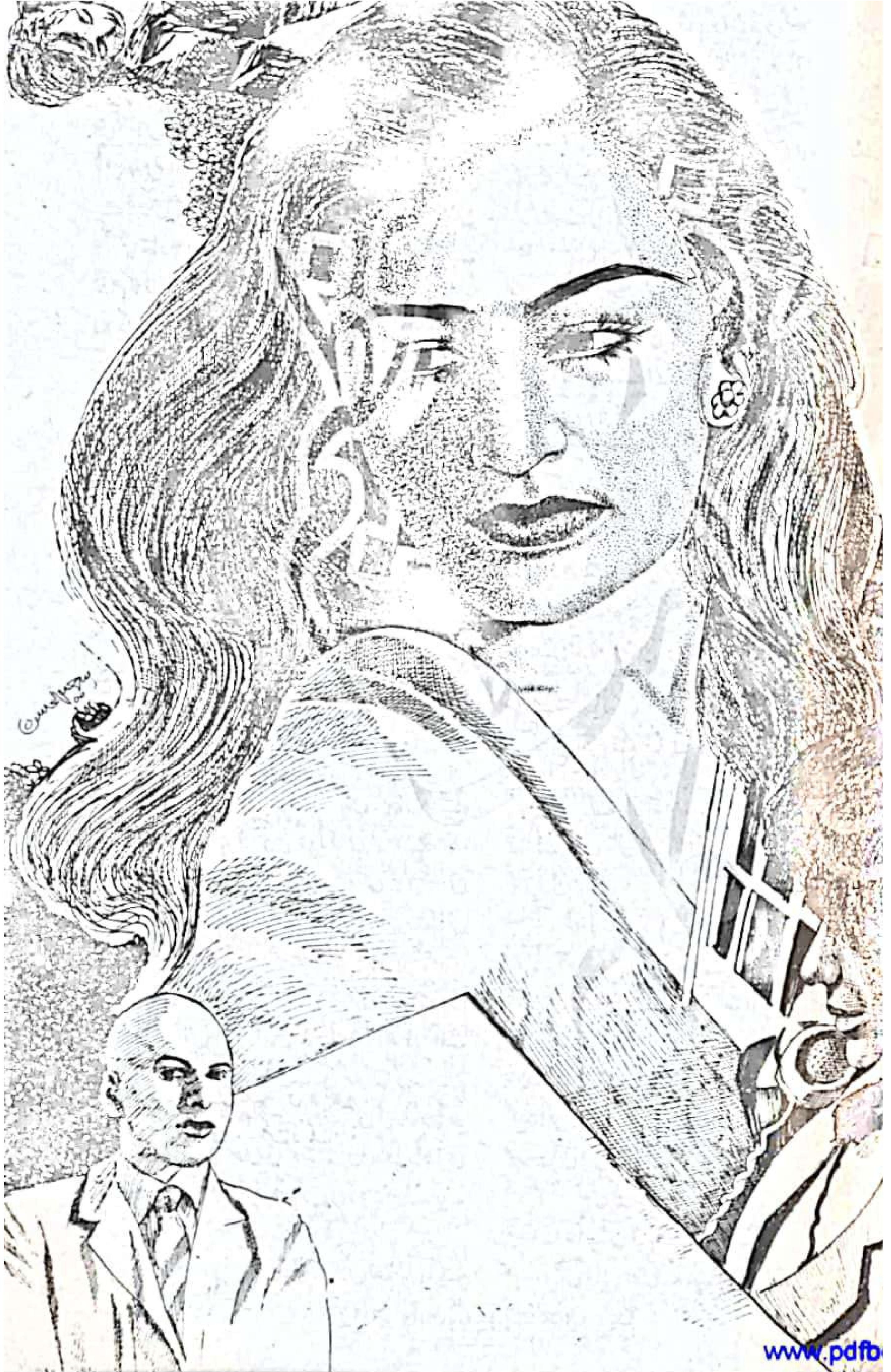
''سنو......!''

شاہد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے! اس نے غیر ارادی طور پر گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا، مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، کچھ بھی نہیں دور دور تک سڑک ویران وسنسان پڑی تھی۔ آس پاس کسی متنفس کو نہ پا کر اس کے جسم میں خوف کی ایک شدید لہر برقی رو کی مانند سرایت کر گئی، اس نے جلدی سے اپنا رخ بدلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا، ابھی وہ چند قدم بڑھا تھا کہ آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی جیسے کوئی اس کے قریب ہی کھڑا سرگوشی کر رہا ہو۔

باریک سریلی آواز اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی، جیسے کوئی دوشیزہ کسی کو پکار رہی ہو، لہجہ یاس وحسرت اور مایوسی کی تہہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر عام حالات میں نقرئی گھنٹیوں کی طرح سریلی آواز شاہد کے کانوں تک پہنچتی تو شاید اس کے سوچنے کے انداز کچھ اور ہوتا......مگر تاریک وسنسان رات میں ویران سڑک پر یہ آواز سن کر اس کا جسم لرزنے لگا، اس کا دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے مگر اس کے قدم تو من من بھر کے ہو رہے تھے، چاہنے کے باوجود اس کے قدموں کی رفتار تیز نہ ہو سکی، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے پاؤں زنجیروں میں جکڑ لئے ہوں...... مایوسی میں ڈوبی ہوئی نسوانی آواز بدستور اس کا پیچھا کر رہی تھی، وہ اس آواز کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ سامنے نالے کا پل پار کر جائے تو اس غیبی آواز سے اس کا پیچھا چھوٹ سکتا ہے، پل ابھی اس سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔

آواز ایک مرتبہ پھر ابھری......اس نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور پوری قوت مجتمع کر کے پل کی طرف دوڑنے لگا، سنسان اور ویران رات میں بھیگی ہوئی سڑک پر اس کے بھاری قدموں کی آواز گونجنے لگی، اس کے ساتھ ہی ایسے محسوس ہوا جیسے وہ غیبی نسوانی آواز مسلسل اسے پکارے جا رہی ہو۔

''سنو......سنو......رک جاؤ! تم آگے نہیں جا سکتے......نہیں جا سکتے۔'' پل دس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا، اور اس کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کر کے آیا ہو، اس کا سانس بری طرح پھول گیا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگے، آواز بدستور اس کا تعاقب کر رہی تھی۔



''رک جاؤ...... میں تمہیں نہیں جانے دوں گی......رک جاؤ......'' پل اب چار قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا، پھر تین قدم...... دو قدم اور پھر اسے ایسے ہی محسوس ہوا۔ جیسے ہزاروں بدروحیں ایک ساتھ چیخ اٹھی ہوں، رونے اور چیخنے کی آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں۔ بین کی آوازیں اس کے کانوں میں گھسی جارہی تھیں۔ پل اس کے سامنے تھا...... ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا...... صرف ایک قدم...... جسے وہ پلک جھپکنے میں طے کرسکتا تھا مگر اس کے قدم الجھ گئے۔ وہ لڑکھڑایا، اس کے منہ سے کربناک چیخ نکلی اور وہ سڑک پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

شاہد کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر اپنے چاروں طرف دیکھا، خوبصورت انداز سے سجا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھا۔

کمرے میں ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی، دیواروں پر خوبصورت قدرتی مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں، قرینے سے سجا ہوا قیمتی فرنیچر مکینوں کی خوشحالی کا مظہر تھا۔

''یہ کونسی جگہ ہے...... میں یہاں کیسے آیا......؟'' وہ اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا، اور پھر گزشتہ واقعات کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے اس خیال کے آتے ہی خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔

اور پھر لیٹے ہی لیٹے اسے احساس ہوا جیسے کوئی دبے قدموں اس کی طرف بڑھ رہا ہو، آواز دو مختلف قدموں کی تھی جو اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اسے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تنفس کی رفتار بڑھ گئی، چند لمحوں بعد قدموں کی آواز ابھری اور لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہٹنے لگی مگر اس مرتبہ قدموں کی آواز صرف ایک ہی فرد کی تھی......

''سنو......'' کمرے کی خاموش فضا میں ایک نسوانی سرگوشی ابھری۔ شاہد کو ایسے ہی محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اس کا سانس رکنے لگا، اس نے چیخنا چاہا مگر خوف کی زیادتی کے باعث اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہونٹ پھڑپھڑائے اور اس کے حلق سے بے معنی سی خرخراہٹ کی آواز خارج ہوکر رہ گئی۔

''جی امی جان......'' کمرے میں ایک مردانہ آواز ابھری جو پہلی آواز سے قدرے فاصلہ پر تھی۔ ''نجانے یہ کون ہے بیچارہ......؟ ابھی تک ہوش نہیں آیا، تمہارے ابو تو شاید سو گئے ہیں، تم ڈاکٹر کو ٹیلی فون کردو۔''

شاہد کو اپنے قریب ہی نسوانی آواز سنائی دی، اسے کچھ اطمینان ہوا، اس کے دل پر چھائی ہوئی خوف وہراس کی دبیز چادر رفتہ رفتہ سرکنے لگی! سانس کی آمدورفت معمول پر آگئی، اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک مرتبہ پھر چاروں طرف تکنے لگا، اگرچہ اسے کسی قدر اطمینان ہوچکا تھا کہ اب وہ محفوظ ہے مگر اس کے باوجود خوف کے سائے اس کے چہرے پر رقصاں تھے، چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ویرانی جھانک رہی تھی۔

''رک جاؤ سلیم...... یہ ہوش میں آگیا ہے، میرے خیال میں اب ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔''

شاہد کے سرہانے کی طرف سے پھر وہی نسوانی آواز ابھری، شاہد نے گردن موڑ کر دیکھا، بائیں طرف کمرے کے قریب کھڑا اٹھارہ انیس سال کی عمر کا ایک صحت مند لڑکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جو بعد میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ کر رک گیا، اس دوران پلنگ کے سرہانے کی طرف ایستادہ عورت بھی اس کے سامنے آگئی۔

''کیسی طبیعت ہے اب......؟'' عورت نے مشفقانہ انداز میں شاہد سے پوچھا۔ ''ج ج...... جی...... مم...... میں کہاں ہوں۔ آپ لوگ......؟'' شاہد ہکلا

کر رہ گیا اور وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''لیٹے رہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے...... تم......'' عورت کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور ممتا بھرے انداز میں اس کو دیکھنے لگی۔

شاہد نے بھی دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہ کی، وہ اپنے جسم میں نقاہت محسوس کررہا تھا۔ اسے حقیقتاً آرام کی ضرورت تھی، لہٰذا اس نے نیک دل خاتون کا مشورہ قبول کرلینا ہی ضروری سمجھا اور وہ ایک مرتبہ پھر تکیے پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد جب وہ پوری طرح حواس میں آچکا تھا تو اسے بتایا گیا کہ اس گھر کے مکین رات کے ایک بجے کے قریب کسی شادی کی تقریب سے واپس آرہے تھے کہ وہ پل کے قریب سڑک کے وسط میں انہیں بے ہوش پڑا ہوا ملا، اور وہ لوگ اسے اپنے بنگلے پر اٹھا لائے۔ ان کے پوچھنے پر شاہد نے بھی انہیں ایک فرضی داستان سنا ڈالی کہ وہ رات اپنی ڈیوٹی سے واپس آرہا تھا کہ چند نامعلوم افراد نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ اور پھر جیسے ہی پل کے قریب پہنچا تو انہوں نے اسے گھیر لیا اور نقدی وغیرہ چھین کر اسے بے ہوش کرکے ڈال گئے۔

اور پھر کتنی ہی دیر تک شاہد ان سے باتیں کرتا رہا، اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی جہاں سے دن کی روشنی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ باتوں کے دوران اسے خیال ہی نہ رہا، کہ وہ رات بھر گھر سے باہر رہا ہے، اور اس کی غیر حاضری سے اس کے گھر والے فکرمند ہو رہے ہوں گے، وہ تیزی سے پلنگ سے اتر آیا۔

''اوہ...... دن چڑھ آیا...... مجھے جانا چاہیے، میرے گھر والے فکرمند ہوں گے۔''

''تم یہاں آرام کرو بیٹا...... ہمیں اپنا پتہ بتا دو! تمہارے گھر میں اطلاع کردی جائے گی۔'' عورت نے اسے روکنا چاہا۔

''نہیں نہیں میں یہاں نہیں رک سکتا، خدا حافظ۔'' شاہد نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اٹھائیس سالہ شاہد صحت مند سڈول جسم اور خوب صورت شکل وشباہت کا مالک تھا، کالج کے زمانے میں وہ باقاعدہ کسرت کیا کرتا تھا، مگر باپ کے مرنے کے بعد جب سے گھر کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا اس کی تمام تر توجہ گھر کی گری ہوئی حالت سنبھالنے کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

وہ ابھی تھرڈ ائیر ہی میں تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ بادل نخواستہ اس نے تعلیم کو خیرباد کہا اور بوڑھی ماں اور جوان بہن کا پیٹ پالنے کے لئے نوکری کی تلاش میں پھرنے لگا، ڈیڑھ دو ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک رحمدل انسان کی سفارش پر اسے بجلی گھر میں ٹیلی فون اٹینڈنٹ کی نوکری مل گئی...... تنخواہ اگرچہ چار ہزار روپے ہی تھی، مگر اسے بھی اس نے غنیمت سمجھا اور باقاعدگی سے ملازمت پر جانے لگا۔

شاہد کا مکان شہر کے وسط میں تھا اور بجلی گھر چھاؤنی میں، اس طرح پہلے تین چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ دو ماہ کی ملازمت کے بعد اسے مستقل طور پر رات کی ڈیوٹی دے دی گئی۔ دفتر آنے جانے کی سہولت کے لئے اس نے ایک سائیکل لے لی، گرمیوں میں تو وہ سائیکل پر ہی آیا کرتا، مگر جیسے ہی موسم میں تغیر پیدا ہوا، ہوا کے نرم، لطیف جھونکوں کے بجائے ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چلنے شروع ہوئے تو اس کے لئے سائیکل چلانا مشکل ہوگیا۔ بالآخر اس نے سائیکل کو خیرباد کہا اور پیدل ہی دفتر آنے جانے لگا۔

ایک رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب دوسرے کلرک کو ڈیوٹی کا چارج دے کر دفتر سے باہر نکلا تو اندھیری رات کا دامن ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ آج دن بھر برفباری ہوتی رہی تھی، دس بجے کے

قریب آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور اس وقت بارہویں رات کے چاند کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جو برف کی سفید بے داغ چادر سے ٹکرا کر آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کر رہی تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سفیدی ہی سفیدی نظر آ رہی تھی، برف نے ہر چیز کو ڈھک لیا تھا۔ درخت مکانوں کی چھتیں سڑکیں میدان غرض ہر شے نے برف کا لباس اوڑھ رکھا تھا۔

دفتر سے باہر نکلتے ہی برفیلی ہوا کا تیز جھونکا نوک خنجر کی طرح اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس کے پورے جسم میں جھرجھری سے پیدا ہوگئی۔ اس نے جلدی سے گردن کے گرد مفلر لپیٹ کر کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے اور اچھی طرح سے بٹن بند کر کے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگا، سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ اطراف میں دیکھا اور شہر کی طرف رخ کر کے چل پڑا۔

خون منجمد کر دینے والی ہوا کے تیز جھونکے اس کے جسم سے ٹکراتے رہے اور وہ دونوں ہاتھ چسٹر کی جیبوں میں ٹھونسے ناک سے نتر نتر کی آواز نکالتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔

"سنو......!"

سرگوشیانہ انداز میں ایک سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، اس کے قدم یک لخت رک گئے۔ اس نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا، مگر وہاں تو کسی تنفس کا وجود نہ تھا، سڑک دور دور تک ویران پڑی تھی، دائیں طرف کچھ ہٹ کر پی ایس پی کوارٹر کی قطاریں تھیں اور بائیں طرف سڑک کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سے چار دیواری کے اندر انگریزوں کا قبرستان تھا۔ قبروں کے تکیوں پر لگی ہوئی صلیبیں چار دیواری کے اوپر سے نظر آ رہی تھیں۔

شاہد کی نگاہیں چکراتی ہوئی اس قبر کے بلند چبوترے پر ٹک گئیں جس کے اوپر مریم کا سنگی مجسمہ تھا، مریم کا سفید مجسمہ چاند کی دودھیا روشنی میں بہت ہی پراسرار لگ رہا تھا، شاہد کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر سڑک پر پہنچ گئیں، دفعتاً ماحول پر تاریکی چھا گئی، اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مہیب بادلوں کے دل کے دل آسمان کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے پھیلتے جا رہے تھے۔

شاہد چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا سوچتا رہا کہ یہ آواز کیسی تھی، کس نے پکارا تھا، مگر جب آس پاس کوئی بھی ذی روح نظر نہ آیا تو وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر آگے چل دیا۔

ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی، انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی عورت اونچی ہیل کا سینڈل پہنے ہوئے محتاط انداز میں چلنے کی کوشش کر رہی ہو، شاہد نے ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا مگر آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اس کے پورے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی یہ اس کا واہمہ نہیں ہو سکتا تھا، اس نے صاف طور پر قدموں کی چاپ سنی تھی۔

"یہ کون تھا...... کوئی عورت...... نہیں کوئی بدروح......" اس کے ذہن نے سوچا اور دل پر چھائے ہوئے خوف میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا...... چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی، اس سفیدی پر حرکت کرتے ہوئے بادلوں کے سائے ویران اور سنسان سڑک......

شدت کی سردی ہونے کے باوجود اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا...... وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

"سنو......!"

آواز ایک مرتبہ پھر ابھری۔

"مجھے اس ویرانے میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو...... نہ جاؤ...... رک جاؤ...... رک جاؤ......" آواز میں حسرت و یاس کا تاثر تھا، اور آخری الفاظ سسکیوں میں ڈوب کر رہ گئے۔

دوڑتا ہوا پل کے دوسری طرف پہنچ گیا......
پل کے دوسری طرف پہنچتے ہی اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے عقب میں قدموں کی آواز رک گئی ہو...... وہ وہیں سڑک کے کنارے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنا پھولا ہوا سانس درست کرنے لگا...... اس کی نگاہیں بدستور خوفناک انداز میں ویران وسنسان سڑک پر لگی ہوئیں تھیں۔ جس طرف سے وہ دوڑ کر آیا تھا۔

اچانک بائیں طرف دو روشنیاں سی چمکتی ہوئی نظر آئیں، وہ شاید کوئی ٹرک تھا جس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور روشنیاں قلعہ اور نالے کے درمیان بنی ہوئی سڑک پر گھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ٹرک جیسے ہی لسٹن روڈ کی طرف مڑا شاہد نے سڑک کے وسط میں کھڑے ہو کر اسے رکنے کا اشارہ کیا، ٹرک رک گیا، ڈرائیور کوئی بھلا مانس ہی تھا جو اسے شہر تک پہنچانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر بھی اس کے دل پر ایک انجانے خوف کا احساس چھایا رہا، وہ جاتے ہی بستر میں دبک گیا تمام رات آنکھوں میں بیت گئی۔ کبھی اسے احساس ہوتا جیسے کوئی نسوانی آواز سرگوشیانہ انداز میں اسے پکار رہی ہے اور کبھی اسے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی......
دن طلوع ہونے کے ساتھ ہی اسے حرارت بھی ہو گئی جب ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بھونچکی رہ گئی۔ رات جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا تو ماں نے اس کی حالت پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے شاہد سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گیا۔

دوسرے دن بھی اس کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ پی۔ ایس۔ پی کوارٹر اور مریم والے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پھر عورت کی سرگوشیاں اور قدموں کی چاپ سنائی دی وہ اپنی حالت پر قابو پائے کسی نہ کسی طرح پل پار کر گیا، پل کے دوسری طرف پہنچتے ہی قدموں کی چاپ اور سرگوشیاں ختم ہو گئیں۔

اور پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ اسے ہر روز ہی اس واقعہ سے دوچار ہونا پڑتا...... وہ دل میں بے حد خوفزدہ تھا۔ مگر اسی راستے سے اسے بہر حال گزرنا پڑتا۔ اگر وہ راستہ بدل کر ایم۔ پی ہیڈ کوارٹر کی بھی سمت شارع بوستان سے ہو کر شہر آتا تو اس طرح اسے کم از کم دو میل کا اضافی فاصلہ طے کرنا پڑتا جو اسے کسی طرح بھی گوارہ نہ تھا۔ خون منجمد کر دینے والی سردی میں چند قدم چلنا ہی محال تھا تو پھر یہ اضافی دو میل تو اس کے سامنے قیامت ہی ثابت ہوتے۔

اور آج یہ ساتواں روز تھا۔ وہ جیسے ہی مریم والے قبرستان کی چاردیواری اور پی۔ ایس۔ پی کوارٹرز کے درمیان سڑک کے اس حصے میں پہنچا تو اسے پھر سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

"سنو...... سنو...... رک جاؤ...... تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے...... نہیں جا سکتے...... میں تمہیں نہیں جانے دوں گی...... رک جاؤ......

شاہد کی قوت برداشت جواب دے گئی......
اس کا دل خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا وہ چلتے چلتے یک دم دوڑنے لگا۔ اور پھر پل کے قریب پہنچ کر وہ گر گیا۔

تین دن کی غیر حاضری کے بعد شاہد جب دفتر پہنچا تو اس کا ساتھی کلرک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شاہد ہے جو تین دن قبل آخری مرتبہ اسے ڈیوٹی کا چارج دے کر گیا تھا۔ اس شاہد اور اس شاہد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے شاہد کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں چہرے پر زردی نظر آ رہی تھی، نقاہت اور کمزوری کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''ارے یہ تین دن میں تمہیں کیا ہوگیا کیا بہت ہی بیمار ہو گئے تھے.....؟'' شاہد کے ساتھی کلرک خالد نے پوچھا۔

''ہاں...... بخار تھا......'' شاہد نے مختصر سا جواب دیا اور میز پر رکھے ہوئے رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا۔

خالد کو شاہد کی بات کا یقین نہ آیا، بھلا تین دن کے بخار سے انسان کی یہ حالت تو نہیں ہو جاتی کہ اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دے۔ اس نے شاہد سے مزید کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ برابر ٹالتا رہا، خالد مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

خالد کے جانے کے بعد شاہد اسٹور کے قریب کرسی پر ٹک گیا، اس کی ذہنی رو پھر اس پراسرار آواز اور قدموں کی چاپ کی طرف بہک گئی۔ جو کئی روز سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اور یہ تعاقب بھی ایک محدود حد تک رہا۔ اور پھر بالآخر سوچ بچار کے بعد شاہد نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اس پراسرار آواز کا راز جاننے کی کوشش کرے گا...... یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے دل ودماغ پر چھایا ہوا تمام خوف جھٹک کر پھینک دیا۔ اور بارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا جب وہ چھٹی کر کے دفتر سے نکلنے لگا۔

ابھی بارہ بجنے میں بیس منٹ تھے کہ بارش شروع ہوگئی...... بارش شروع ہونے کے ساتھ ہی شاہد کے دل کی بے چینی بڑھ گئی، کیونکہ اس طرح لازمی تھا کہ دوسری شفٹ کا کلرک جسے اس نے چارج دینا تھا بارش میں تو آنے سے رہا، اس کی نگاہیں بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ جاتیں جس کی سوئیاں آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں ہر مرتبہ گھڑی کو دیکھنے کے بعد کھڑکی سے باہر بھی دیکھ لیتا، بارش بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی بارہ بجکر پچیس منٹ پر بارش قدرے تھم گئی اور چند منٹ بعد ہی دوسرا کلرک بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں اسے بارش نے آ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک بنگلے کے برآمدے میں ٹھہر کر بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔

شاہد اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر رجسٹر کھول کر اسے سمجھانے لگا۔ اور پھر دستخط کر کے جلدی سے باہر نکل گیا۔ بارش نے پھوار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہوا بند تھی مگر اس کے باوجود سردی بہت تھی، وہ اپنے جسم کو اچھی طرح سے اوور کوٹ میں لپیٹ کر بنکی گھر کے کمپاؤنڈ سے باہر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا لسٹن روڈ پر مریم والے قبرستان کی طرف بڑھنے لگا، جیسے جیسے وہ قبرستان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا، اس کے دل میں ایک انجانا خوف چھاتا جا رہا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور آگے بڑھتا رہا۔

قبرستان کے قریب پہنچ کر اس کی رفتار ہلکی ہوگئی وہ قبرستان کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اور پھر چند قدم آگے نکل گیا۔ کوئی آواز یا قدموں کی چاپ نہیں ابھری شاہد حیران تھا کہ آج ایسا کیوں ہوا۔ کیا گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات اس کا واہمہ ہی تھے مگر پھر اچانک ہی اس کے دل پر خوف کی ایک لہر چھا گئی، اپنے عقب میں اسے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی اس کی تمام دلیری اور بہادری ہوا ہوگئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے مگر اس کے قدم جیسے زمین پر گڑ کر رہ گئے سرگوشی کرتی ہوئی نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی......

''میں جانتی ہوں تم آج یہاں سے آگے نہیں جا سکو گے...... دیکھو...... میری طرف دیکھو...... میں ہر روز تمہارے انتظار میں یہاں کھڑی رہتی ہوں آؤ...... میری طرف آؤ۔''

شاہد نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گھوم کر دیکھا اور پھر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اس سے چند قدم کے فاصلے پر قبرستان کی چار

دیواری کے قریب ملکوتی حسن کی مالک ایک حسین دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سر سے پاؤں تک سفید رنگ کا ایک ہی لباس نظر آرہا تھا۔ سفید ساڑھی نما لباس جو ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی کے پس منظر میں سفید لباس پہنی ہوئی دوشیزہ بہت ہی پراسرار نظر آرہی تھی۔

''رک کیوں گئے...... آگے آؤ...... میں کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔'' دوشیزہ نے دونوں بانہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔

دوشیزہ کی ہر قسم کے جذبات سے عاری آواز شاہد کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ اس کے قدم غیر اختیاری طور پر اس کی طرف اٹھنے لگے۔

''آؤ...... آؤ...... آجاؤ میرے پاس......''

دوشیزہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاہد مسحور کن انداز میں اس کی طرف بڑھتا رہا اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے قدم اپنی مرضی سے نہیں اٹھ رہے بلکہ کوئی مقناطیسی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ دوشیزہ کی بانہیں بدستور اس کی طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہد کی نگاہیں اس کے پرکشش چہرے پر مرکوز تھیں اور قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے درمیان چار قدم کا فاصلہ رہ گیا دوشیزہ کی نگاہوں میں ایک عجیب سی کشش تھی اور اس کی نگاہوں کی یہی کشش شاہد کو کشاں کشاں اس کی طرف لئے جارہی تھی۔

اور پھر یک لخت ایک جھٹکے سے وہ رک گیا۔ حسین دوشیزہ نے اپنا بایاں ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا تھا۔ شاہد کو ایسے ہی محسوس ہوا جیسے برف کی سل اس کی کلائی پر رکھ دی گئی ہو۔ کچھ اس قدر ہی سرد تھا وہ ہاتھ جس میں زندگی کی حرارت برائے نام بھی نہیں تھی۔

اپنی کلائی کو اس کی گرفت میں محسوس کرتے ہی شاہد کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یکدم اپنا ہاتھ چھڑا کر یہاں سے بھاگ جائے مگر اس میں تو اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا سکتا، وہ تو بدستور اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ نجانے دوشیزہ کی آنکھوں میں کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔

دوشیزہ کے یاقوتی لبوں پر پھیلی ہوئی پراسرار مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہوگئی۔ وہ شاہد کی کلائی تھامے ہوئے مڑی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی قبرستان کی چار دیواری کے چھوٹے سے گیٹ کے راستے اندر داخل ہوگئی۔ شاہد کسی سحرزدہ انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

دوشیزہ اس کا ہاتھ پکڑے چلتے چلتے ایک قبر کے پاس رک گئی، اس نے اپنا دوسرا ہاتھ قبر کے سرہانے ایستادہ کراس کے اوپر رکھ دیا۔ عین اسی وقت ایک عجیب سی گونج شاہد کی سماعت سے ٹکرائی! جیسے بہت سی روحیں مل کر گیت گارہی ہوں۔ کوئی انجانا گیت جو شاہد کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''یہاں نہیں...... میرے ساتھ آؤ...... آؤ...... چلے آؤ......ڈرو نہیں۔''

دوشیزہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے قبروں کے درمیان ایک طرف چلنے لگی۔ شاہد اس کی گرفت میں چلتا رہا، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے، اس کی نگاہیں سفید لبادہ پہنے ہوئے ملکوتی حسن کی مالک حسین دوشیزہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہوکر رہ گئی تھیں۔

برفیلی ہوا کے جھونکے تیز ہوچکے تھے اور ان میں خنجر کی سی کاٹ آگئی تھی۔ مگر شاہد کو کچھ احساس نہیں ہورہا تھا۔ اس کے تو بس قدم اٹھ رہے تھے جو اس کے بس میں نہیں تھے۔

دوشیزہ کا رخ قبرستان کے دائیں پہلو میں بڑے برساتی نالے کی سمت تھا، جیسے ہی وہ دونوں

قبرستان کی عقبی چار دیواری کے قریب پہنچے۔ ہوا کے جھونکوں نے جھکڑوں کی صورت اختیار کرلی، ہر طرف بکھری ہوئی برف کی کرچیں اڑاڑ کر سوئیوں کی طرح شاہد کے چہرے سے ٹکرانے لگیں، مگر اسے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔

دفعتاً شاہد چونک گیا، اس پر چھائی ہوئی مدہوشی دور ہوگئی۔ اس کے چاروں طرف بھیانک شور گونجنے لگا جیسے ہزاروں بدروحیں ایک ساتھ مل کر چلا رہی ہوں ہوا کے دوش پر آنے والی یہ آوازیں اتنی کرخت تھیں کہ اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے وہ یکدم ہوش میں آ گیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھ کھڑی دوشیزہ کی طرف دیکھا جس نے اس کی کلائی تھام رکھی تھی دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہیں دوشیزہ کے چہرے سے ہٹ کر چاروں طرف گھوم گئیں اسے اپنے چاروں طرف بھیانک سائے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیئے جو سفید لباس پہنے ہوئے بکھری برف کے پس منظر میں نہایت پراسرار اور حد درجہ بھیانک نظر آرہے تھے، ناچنے کے ساتھ عجیب وغریب آوازوں میں چلا رہے تھے۔ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری کرخت آوازیں جو شاہد کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری جارہی تھیں، اس نے ایک مرتبہ پھر سامنے کھڑی دوشیزہ کی طرف دیکھا۔

''کک...... کون ہو تم......؟'' شاہد ہکلا کر رہ گیا اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس کی گرفت سخت ہوچکی تھی۔

شاہد نے وحشت زدہ نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، اپنے چاروں طرف رقص کرتے ہوئے سایوں کو دیکھ کر اس کے دل پر دہشت چھا گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی کلائی چھڑانے کے لئے بازو کو پورے زور سے جھٹکا دیا، اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کی کلائی دوشیزہ کے ہاتھ سے آزاد ہوگئی اور وہ دیوانہ وار قبروں کو پھلانگتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔

اس کے بھاگتے ہی دوشیزہ کے لبوں سے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ آزاد ہوا، اس کے ساتھ ہی چیخنے چلانے اور بین کرنے کی آوازیں تیز ہوگئیں۔ شاہد دیوانوں کی طرح دوڑتا رہا......

اور پھر اچانک چار دیواری کے قریب پہنچ کر وہ منہ کے بل ایک پختہ قبر پر گرا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا گرنے سے اس کی پیشانی پختہ قبر کے چبوترے سے ٹکرائی اور اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا گرتے ہوئے اسے صاف محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ الجھادی ہو۔

اس نے گردن موڑ کر خوفزدہ انداز میں پیچھے کی طرف دیکھا...... دوشیزہ دونوں بانہیں پھیلائے قہقہے لگاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی آرہی تھی...... اس کے ساتھ ہی چاروں طرف پھیلے ہوئے بھیانک سائے وحشیانہ انداز میں چلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رات کے سناٹے میں بدروحوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں قبرستان کا پر ہیبت ماحول اور اپنے آپ کو مجبور و بے کس دیکھ کر شاہد کا دل ڈوب گیا، وہ ہمت کر کے اٹھا اور پوری قوت سے چار دیواری کی طرف دوڑا مگر دو ہی قدم بعد اس کی ٹانگ پھر الجھ گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر قبروں کے درمیان گر گیا گرتے ہی اس کے منہ سے ایک طویل خوفناک چیخ ابھری جو رفتہ رفتہ قبرستان کی تاریکی اور سناٹے میں ڈوب کر رہ گئی۔

دوبارہ جب شاہد کی آنکھ کھلی تو مارے خوف کے اس کی گھگھی بن گئی۔ وہ ایک وسیع وعریض کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود فرنیچر اور دیگر سامان عجیب بے ترتیبی کی حالت میں بکھرے

پڑے تھے کمرے کے فرش اور تمام چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی ایسا لگتا تھا جیسے طویل عرصہ سے کسی کے استعمال میں نہیں آیا۔ چھت پر 5 فٹ لمبی تار کے ساتھ بلب لٹکا ہوا تھا جس کے اوپر سفید رنگ کا شیڈ بھی موجود تھا، بلب جل رہا تھا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں......
اور باہر تیز ہوا کی سائیں سائیں کی آواز ماحول پر کچھ اور بھی ہیبت طاری کئے دے رہی تھی...... دفعتاً ہوا کا ایک تیز جھونکا، شمالی کھڑکی کی راہ سے اندر آیا اور چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بلب ہلنے لگا...... بلب ہلنے سے کمرے میں بکھری چیزوں کے سائے ادھر ادھر حرکت کرنے لگا۔

شاہد نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا اس کی پیشانی میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار پیشانی پر پہنچ گیا۔ پیشانی کے زخم پر خون جم چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ زخم کو سہلاتا رہا۔ اور دوبارہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا، کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا دروازے کے پٹ بند تھے۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ تو مضبوطی سے بند تھا، اس کے جسم میں سراسیمگی سی پیدا ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی سے نظروں سے ایک مرتبہ پھر کمرے کا جائزہ لینا لگا۔ اور پھر شمالی کھڑکی کی طرف بڑھا، مگر جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا، اس کے پٹ بھیانک انداز میں چرچراہٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے بند ہوگئے، شاہد نے ہاتھ کے دباؤ سے کھڑکی کے پٹ کھولنا چاہے مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کیلیں ٹھونک دی ہوں۔

وہ تیزی سے دوسری کھڑکی کی طرف لپکا، مگر وہاں بھی یہی کچھ ہوا جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا اس کھڑکی کے پٹ بھی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔

شاہد کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اور پورے بدن میں لرزہ سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی حالت کو سنبھالا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے تیسری کھڑکی کی طرف بڑھا جو اس کی امیدوں کا آخری سہارا تھی۔

مگر جیسے ہی وہ کھڑکی کے قریب پہنچا کمرے میں ایک بھیانک نسوانی چیخ ابھری اس کے ساتھ ہی چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بلب بجھ گیا، کمرے میں اندھیرا پھیلتے ہی ہر طرف رونے اور چلانے کی بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ شاہد کا پورا جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا، اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھائے جو اس کے بھڑے ہوئے پٹوں سے ٹکرا کر رہ گئے۔ اس لمحہ چیخنے چلانے اور رونے کی آوازوں میں شدت پیدا ہوگئی۔

شاہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا...... کمرے کی چھت کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے روشندان سے چاند کی مدھم روشنی اندر آنے لگی۔ شاید بادل چھٹ گئے تھے۔

ایک کھنکھنا ہوا نسوانی قہقہہ کمرے کی فضا میں گونجا......

شاہد نے آنکھیں پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھا، عین اس جگہ جہاں روشندان کی راہ سے آنے والی چاند کی روشنی پڑ رہی تھی اسے وہی دوشیزہ کھڑی دکھائی دی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی میں چاندنی کے ایک مختصر سے ہالے میں سفید لباس میں ملبوس دوشیزہ نہایت پراسرار نظر آ رہی تھی...... شاہد کی سمجھ میں نہ آسکا کہ بند کمرے میں یہ دوشیزہ کہاں سے آ گئی۔

اس خیال کے آتے ہی شاہد کے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا۔ "کک...... کون ہو تم...... خدا کے لئے بتاؤ تم کون ہو...... اور کیوں میرے پیچھے پڑی ہو......؟" شاہد کی پھنسی پھنسی سی آواز کمرے میں ابھری۔

''میں......'' دوشیزہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''میں جو کوئی بھی ہوں مگر تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''مم...... مگر...... تم ہو کون......؟'' کچھ تو بتاؤ تم کیا چاہتی ہو......؟'' شاہد ہکلایا......

''انتقام...... میں انتقام چاہتی ہوں...... اپنی محبت کا انتقام......'' دوشیزہ کے لب ہلے شاہد کا دل دہل گیا۔

''انتقام......'' وہ خوفزدہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''مگر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔''

''تم اگر اپنے دل سے خوف نکال پھینکو تو شاید یہ جان سکو کہ میں کون ہوں۔'' دوشیزہ نے جواب دیا۔

عین اسی وقت بلب روشن ہو گیا...... شاہد نے اپنے خوف پر کسی قدر قابو پا کر ایک مرتبہ پوری توجہ سے دوشیزہ کے چہرے کی طرف دیکھا...... اسے اس کے نقوش کچھ جانے پہچانے لگے، یہ شاید اس تاثر کا نتیجہ تھا کہ اس نے کسی حد تک اپنے خوف پر قابو پالیا تھا وہ بغور دوشیزہ کے چہرے کی طرف تکتا رہا مگر وہ یہ نہ جان سکا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔

''نن...... نہیں...... میں تمہیں نہیں جانتا......''

''ایلین ہوں...... ایلین شیپرڈ...... تم آٹھ سال پہلے اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ تو تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔'' دوشیزہ بولی۔

''ایلین شیپرڈ''

شاہد کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خوفزدہ انداز میں ایلین کی طرف دیکھا۔ وہی بالکل وہی اس کے ذہن نے جواب دیا۔

ایلین شیپرڈ...... ایک برطانوی دوشیزہ...... جو آٹھ سال قبل سیاحت کے شوق میں اس ملک میں آئی تھی...... وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ چند افراد اور بھی تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی سیاحوں کی یہ پارٹی چھ روز تک کوئٹہ میں رہی شہر کے بہت سے نوجوان سیاح لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کے لئے ہمہ وقت ان کے گرد منڈلانے لگے، مگر ان سیاحوں نے کسی کو لفٹ نہ دی۔ عامر وہ واحد شخص تھا جوان سے تعارف حاصل کر سکا اور بہت جلد ان سے گھل مل گیا۔ شاہد بھی عامر ہی کے توسط سے ان سے متعارف ہی تھا۔ اور پھر یہ ہوا کہ حسین ایلین خوبرو عامر کے سامنے دل ہار بیٹھی، چھ روز قیام کے بعد جب پارٹی روانگی کی تیاری کرنے لگی تو ایلین نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، اس بات پر ان کی آپس میں بڑی لے دے بھی ہوئی۔

ایلین کے ساتھیوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ عامر کو چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھی، نتیجہ اس کے ساتھی اسے کوئٹہ ہی میں چھوڑ کر چلے گئے کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور شخص عامر اور ایلین کے راستے میں دیوار بن گیا، اس نے ایلین کو حاصل کرنے کی کوشش کی اسے عامر کے خلاف بھڑکانا چاہا مگر ایلین نے اسے بری طرح سے ڈانٹ دیا......

اور پھر ایک دن عامر اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ایلین اس کی موت کی خبر سن کر پاگل سی ہو گئی...... اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس شخص کے متعلق شبہ کا اظہار کیا مگر وہ شخص تو اس طرح غائب ہو گیا تھا، جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو، پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارتی رہی، مگر وہ دستیاب نہ ہو سکا۔

اور پھر ایک دن ایلین بھی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی، اسے بھی گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا، گلے پر انگلیوں کے نشانات سے ثابت ہو چکا تھا کہ ایلین کا قاتل وہی شخص ہے جو عامر کا قاتل تھا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد ایک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایلین کی ہلاکت سے پہلے اس کی آبروریزی کی گئی تھی۔

عامر، شاہد کا دوست تھا۔ اسے عامر اور ایلین ی موت کا دکھ ہوا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ جبکہ یس بھی قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں بے بس چکی تھی۔

قتل کی ان وارداتوں سے پورے شہر میں ہلکہ سا مچ گیا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس واقعہ کو فراموش کر گئے۔

اور اب آٹھ سال بعد ایلین شاہد کے سامنے ڑی تھی "تو کیا ایلین زندہ ہے......؟" شاہد نے زدہ انداز میں سوچا

"نہیں......نہیں وہ تو مر چکی ہے...... یہ...... ایلین نہیں ہو سکتی......تت......تو کیا یہ ایلین کی روح ہے جو انتقام لینے کے لئے دوبارہ اس دنیا میں آ گئی ہے۔"

"ہاں...... میں ایلین کی روح ہوں......" شیزہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی از میں کہا گویا اس نے شاہد کے ذہن کی بات پڑھ ہو۔

"آٹھ سال تک میں انتقام کی آگ میں سلگتی ی ہوں...... میں پیاسی ہوں......"

"انتقام......مم......مگر مجھ سے تم کس بات کا قام لینا چاہتی ہو۔" شاہد دیوار کا سہارا لیتے ہوئے لا۔

"تم سے نہیں...... میں اپنا انتقام تمہارے یعے سے لینا چاہتی ہوں، عامر کا اور میرا قاتل ٹھ سال بعد اس شہر میں واپس آ گیا ہے...... میں تی ہوں کہ وہ کہاں ہے مگر...... میں اس سے انتقام ں لے سکتی...... میں اسے موت کے گھاٹ نہیں ر سکتی......" ایلین کی آواز میں یاسیت ابھر آئی۔

"تو پھر......تم کیا چاہتی ہو......؟" شاہد نے ی طرف دیکھا۔

"تم اسے قتل کر دو۔" ایلین نے سپاٹ لہجے ں جواب دیا۔

قتل...... شاہد کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ "نہیں......نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔" شاہد چلایا۔

"یہ ہوگا......"

ایلین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم قاتل سے میرا انتقام لو گے، اگر تم ایسا نہ کر سکے۔ تو تم بھی میری طرح بھٹکتے رہو گے، تمہیں کہیں بھی چین نہیں ملے گا......تم......تم انتقام لو گے......"

اس وقت کمرہ ایک مرتبہ پھر رونے اور بین کرنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ کھڑکیوں کے پٹ جو آپ ہی آپ کھل گئے تھے، تیز ہوا کی زوردار آواز کے ساتھ دھڑ دھڑانے لگے...... کمرے سے باہر تیز ہوا کی سائیں سائیں کی آواز اس پراسرار ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھی۔

شاہد سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک پسینہ سے تر ہو چکا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یک لخت کھڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہوا میں اچھلتا ہوا کمرے کے وسط میں فرش پر آن گرا......

اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے کسی غیبی قوت نے اٹھا کر پھینک دیا ہو شاہد نے خوفزدہ نگاہوں سے ایلین کی طرف دیکھا اور پھر نظریں کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں، جو اس وقت کھلا ہوا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے جسم کی پوری قوت جمع کی اور دروازے کی طرف دوڑا مگر اس مرتبہ پھر کسی غیبی قوت نے اسے اٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینک دیا...... اور اب شاہد کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ایلین دروازے پر کھڑی تھی۔

"تت...... تم ...... مجھے نہیں...... روک سکتیں......" شاہد نے پھولے ہوئے سانس کے دوران کہا اور دوسری کھڑکی کی طرف دوڑا۔

کھڑکی کے پٹ ایک زور دار آواز کے

ساتھ بند ہو گئے...... کمرے میں رونے کی آوازیں ایک دم بڑھ گئیں ڈر اور خوف کے مارے شاہد کے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا، اس نے ایلین کی طرف دیکھا جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی...... اس کے ہاتھوں کی پھیلی ہوئی مخروطی انگلیاں دیکھ کر شاہد کو نگاہوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی...... ایلین کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے دبوچ لینا چاہتی ہے...... شاہد خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا۔ اور پھر دیوار کے ساتھ ٹک کر ایک طرف سرکنے لگا ایلین بدستور اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ہوا کے زور سے چھت سے لٹکا ہوا بلب زور زور سے ہلنے لگا۔ ہوا کی سائیں سائیں رونے اور چلانے کی آوازوں کے ساتھ مل کر کانوں کے پردے پھاڑنے لگی شاہد کی نگاہوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی اور پھر......

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی گردن کسی آہنی شکنجہ میں جکڑی گئی ہو...... ایلین کے برف کی طرح سرد اور بے جان ہاتھ اس کی گردن کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے شاہد کے منہ سے گھٹی گھٹی سی ایک چیخ نکلی اور وہ دیوار کے ساتھ جھکتا چلا گیا۔

شاہد کو جب دوبارہ ہوش آیا تو بدستور اس کمرہ کے فرش پر دراز تھا۔ جہاں ایلین کی روح نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ خیال آتے ہی اس کا ایک ہاتھ بے اختیار اپنا گلا سہلانے لگا۔ پھر اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ ہر چیز بدستور اپنی جگہ موجود تھی چھت پر لٹکا ہوا بلب بھی جل رہا تھا۔ اس نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا سب کی سب بند تھیں وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکیوں پر زور آزمائی کرنے لگا۔ مگر کھڑکیاں تو اس قدر مضبوطی سے بند تھیں جیسے ان میں میخیں ٹھونک دی گئی ہوں...... پھر بے اختیار اس کی نگاہ چھت کے قریب روشن دان کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں سے ہلکا ہلکا اجالا اندر آرہا تھا۔ اس نے روشندان کے راستے فرار کے متعلق سوچا مگر روشندان اتنا اونچا تھا کہ وہاں تک پہنچنا ہی مشکل نظر آرہا تھا۔ اور اگر وہ کسی نہ کسی طرح روشندان تک پہنچ بھی جاتا تو اس کے راستے باہر نکلنا ناممکن ہی تھا کیونکہ روشندان اتنا تنگ تھا کہ اس کے ذریعے ایک تین سال کا بچہ بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

کمرے کی محدود فضا میں سکوت طاری تھا۔ گہرا سکوت...... جو اس کے دل پر ہیبت طاری کئے دے رہا تھا۔ دفعتاً اس خاموش فضا میں چرچراہٹ کی آواز ابھری شاہد نے تیزی سے گھوم کر گھبرائے انداز میں آواز کی سمت دیکھا کمرہ کا دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ مکمل طور پر کھل گیا۔

شاہد اپنی جگہ پر سکوت وجامد آنکھیں پھیلائے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ کئی منٹ بیت گئے مگر کچھ بھی نہ ہوا دروازہ بدستور کھلا رہا۔ وہ اپنے خوف پر قابو پا کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چوکنے انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ڈرتے ڈرتے ایک پیر دروازے کی دہلیز کے دوسری طرف رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے آگے بڑھتے ہی دروازہ بند ہو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، دروازہ بدستور کھلا رہا، اس نے دوسرا قدم بھی دروازے کے باہر رکھ دیا۔

اب وہ ایک چھوٹی سی گیلری میں کھڑا تھا گیلری میں ملگجا سا اجالا تھا اور یہ اجالا چھت کے قریب بنے ہوئے روشندان سے اندر آرہا تھا۔ گیلری میں دونوں طرف چار کمرے تھے۔ جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے ایک کمرہ بالکل سامنے تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا شاہد نے ڈرتے ڈرتے پہلے کمرے کی طرف بڑھا مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی اس کا دروازہ بند ہو گیا، باقی تین کمروں کے

پہنچ کر بھی اس کے ساتھ یہی ہوا۔
اب وہ پانچویں کمرے کے قریب کھڑا تھا
کا دروازہ بند تھا، وہ دروازے کے قریب ہی
رے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا...... اس کے دل پر
کے سائے گہرے ہونے لگے وہ دیوار کے
ٹیک لگا کر اپنے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش
نے لگا۔
چند لمحوں تک، ماحول پر ہیبت ناک سناٹا چھایا
اور سناٹے کی آواز اس وقت مجروح ہوئی جب
ڑاہٹ کی پراسرار آواز ابھرنے لگی۔ شاہد پر تشنجی
کیفیت طاری ہو گئی اس نے گردن موڑ کر آواز کی
ت دیکھا، پانچویں کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا......
چند لمحوں تک وہیں کھڑا رہا اور پھر ڈرتے ڈرتے
رے کے اندر داخل ہو گیا۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں
وسط میں فرش پر پڑے ہوئے ایک تابوت پر
وز ہو گئیں، تابوت پر نظر پڑتے ہی شاہد کے رونگٹے
ڑے ہو گئے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر باہر نکل
ا چاہا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا، اس کے جسم سے
نہ اس طرح بہنے لگا جیسے وہ پانی میں بھیگا ہوا ہو۔
وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا تابوت کی
ف بڑھنے لگا، تابوت کے قریب پہنچ کر اس نے
زتے ہوئے ہاتھوں سے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا
ھکنا اٹھتے ہی کمرے میں یک لخت چیخوں اور کراہوں
ا بھیانک آوازیں گونجنے لگیں۔ شاہد کے ہاتھ زور
رے کانپنے لگے اس نے ایک جھٹکے سے تابوت کا
ھکنا پیچھے کو الٹ دیا، تابوت کے اندر نظر پڑتے ہی وہ
کھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔
تابوت کے اندر عامر کی لاش پڑی تھی......
س کا دوست عامر...... جسے آٹھ سال قبل گلا گھونٹ
کر ہلاک کیا گیا تھا لاش بالکل درست حالت میں
تا، اس کے چہرے کو بغور دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا
کہ یہ کوئی لاش نہیں زندہ جاوید انسان گہری نیند سو رہا

جواب......!

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ مجھے ایک سوال نے بہت پریشان کیا کہ مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟

میں نے کئی لوگوں سے پوچھا مگر تسلی بخش جواب نہ ملا۔ ایک دن ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ ایک بوڑھا مزدور گنے کا رس نکال رہا تھا میں نے اس سے سوال کیا۔ "مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟"

اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور فرمایا۔

"مسلمان وہ ہے، جو اللہ کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو اللہ کی مانتا ہے۔"

ایک ان پڑھ سے ایسا دانشمندانہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔

(مرتب۔ ایس۔ ایجاز احمد۔ کراچی)

ہے جس میں زندگی کی حرارت موجود ہے۔
شاہد کی ذہنی کیفیت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔
ہر لحہ بعد ایک نیا لرزا دینے والا واقعہ رونما ہو رہا تھا۔
اس نے بڑی مشکل سے اپنی گرتی ہوئی حالت پر قابو
پایا اور ایک مرتبہ پھر تابوت کے قریب آ کر عامر کی
لاش کو دیکھنے لگا، جو آٹھ سال بعد بھی بالکل تازہ ہی
دکھائی دے رہی تھی۔
دفعتاً اس کی نگاہ تابوت سے ہٹ کر کمرے کی
کھڑکی کی طرف اٹھ گئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور دن کا
ملگجا اجالا کھڑکی کی راہ سے اندر آ رہا تھا۔ وہ ہولے
ہولے کھڑکی کی طرف بڑھا، کھڑکی کے قریب پہنچ کر

وہ رک گیا، اس نے پٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے، کھڑکی کے پٹ بند نہیں ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اطمینان کیا کہ اب کھڑکی بند نہیں ہوگی...... وہ پھرتی سے کھڑکی کے اوپر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے سے پہلے اس نے چہرہ گھما کر کمرہ میں پڑے ہوئے تابوت کی طرف دیکھنا چاہا مگر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کمرہ خالی تھا۔ تابوت کا نام ونشان تک نہیں تھا...... اس وقت کمرہ میں ایک کھنکھناتا ہوا قہقہہ گونجا۔

شاہد نے تیزی سے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور بے تحاشہ ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ چاروں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں وہ ان میں الجھنے کی پرواہ کئے بغیر دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا...... وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے...... وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس منحوس مکان سے دور نکل جائے...... اتنی دور کہ وہ اس کے تصور کی پہنچ سے بھی باہر ہوجائے۔

وہ دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا...... اس کا سانس بری طرح پھول گیا۔ مگر وہ رکا نہیں دوڑتا ہی رہا۔ اور جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ لڑکھڑا کر ایک جگہ گر گیا۔

کتنی ہی دیر بعد جب وہ اپنے حواس سنبھال چکا تو اس نے اپنے آپ کو سیشن کورٹ کی عمارت کے سامنے نالے کے کنارے بنے ہوئے پارک میں پایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا...... صبح کا ملگجا اجالا دن کی روشنی میں بدل رہا تھا۔ چاروں طرف برف ہی برف بکھری ہوئی تھی اور برف کے اوپر پھیل کر آنیوالی ہوا اس کے جسم سے ٹکرا کر سنسنی پیدا کررہی تھی۔

شاہد بمشکل وہاں سے اٹھا اور کسی بدمست شرابی کی طرح جھومتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا...... اور پھر تقریباً دو گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد گھر پہنچ گیا۔

چھ روز ہوگئے شاہد گھر سے باہر قدم نہ نکال سکا، وہ تو اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ چارپائی سے اٹھ کر صحن تک بھی جاسکتا...... گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات نے اس کے جسم کا تمام خون نچوڑ کر رکھ دیا تھا، اب تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، ماں اور بہن اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں انہوں نے لاکھ سر کھپایا کہ شاہد انہیں کچھ بتادے مگر اس نے تو جیسے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

شاہد تمام دن اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا سوچتا رہتا، اس کی سوچوں کا محور مس ایلین فیچرڈ کی روح تھی۔

ایلین کے تصور کے ساتھ ہی اس کی نگاہوں کے سامنے اس پراسرار مکان کے کمرے میں پڑا ہوا وہ تابوت گھوم جاتا جس میں عامر کی لاش اس قدر تروتازہ کیوں تھی اور اس کا تابوت اس مکان میں کس طرح پہنچا۔ مزید حیرت کہ وہاں سے تابوت غائب کیسے ہوگیا۔

شاہد نے کئی مرتبہ اس پراسرار مکان کے متعلق بھی سوچا جہاں اس کے ساتھ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، مگر ہزار سوچنے کے باوجود اسے یاد نہ آسکا کہ وہ مکان کون سا تھا۔ اور کس جگہ واقع تھا کیونکہ وہ جب وہاں سے بھاگا تھا تو اسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی بھاگتے وقت اس نے مکان کے محل وقوع پر توجہ نہیں دی تھی، موقع ہی نہیں تھا...... وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ کھڑکی سے کود کر مکان کے پائیں باغ میں آیا تھا۔ جہاں ہر طرف بے ترتیب خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے زیادہ وہ اس مکان کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے کوئی سایہ اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوا۔

''ایلین......'' شاہد پوری شدت سے چلایا، اس وقت کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا

جانے لگا، اس کے ساتھ ہی شاہد کی ماں اور بہن چلا چلا کر اسے دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھیں۔ مگر شاہد کے جسم میں تو اتنی قوت بھی نہ رہی تھی کہ وہ اٹھ کر دروازہ کھول سکتا، اس کا جسم پسینے سے تر تھا اور بدن کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

دروازہ بدستور کھٹکھٹایا جارہا تھا ساتھ ہی چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی ہو۔

شاہد بستر پر دراز بری طرح ہانپ رہا تھا اس کی نظریں خوفناک انداز میں کمرے کا طواف کررہی تھیں، اور پھر دروازے کا ایک پٹ خوفناک آواز کے ساتھ ٹوٹ کر اندر کی طرف آن گرا شاہد کی ماں اور بہن دیوانوں کی طرح دوڑ کر اس کے قریب پہنچیں اور پھر اس کی حالت دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاہد کتنی ہی دیر تک ویران ویران نگاہوں سے ان کے چہروں کو تکتا رہا، اور جب وہ اپنے حواس سنبھال چکا تو ماں کے پوچھنے پر بھی نہ بتا سکا کہ اندر سے دروازے کی کنڈی کس طرح لگائی تھی، کیونکہ اس میں طاقت نہیں تھی کہ وہ خود اٹھ کر کنڈی لگا سکتا۔

اور پھر وہ رات آنکھوں میں بیت گئی، ماں اور بہن تمام رات اس کے قریب بیٹھی رہی، اس کے بعد ہر رات ایلن کی روح شاہد کے کمرے میں گھس آتی۔ اور اسے انتقام لینے پر مجبور کرتی رہتی، شاہد دن بدن اپنے حواس کھوتا جارہا تھا کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے وہ قہقہے لگانے لگتا اور کبھی کسی سے باتوں کے دوران اس کی ذہنی رو بہک جاتی اور وہ دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگتا۔

اور پھر ایک روز جبکہ رات سیاہ چادر اوڑھے دبے قدموں اپنی منزل کی طرف گامزن تھی، سردی بہت شدت اختیار کرچکی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آثار بتارہے تھے کہ کچھ ہی دیر بعد برف باری شروع ہوجائے گی۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوگئی۔ شاہد خاموشی سے بستر سے نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا، سڑک پر پہنچ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ اس کا انداز اور رفتار دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہی شاہد ہے جو کچھ دیر قبل مردوں کی طرح بستر پر پڑا تھا۔

شہر کے دو تین سڑکیں اور گلیاں طے کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں داخل ہوکر ایک مکان کے سامنے رک گیا چند لمحے آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد وہ انتہائی پھرتی سے مکان کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا...... مکان کے اندر پہنچ کر وہ ایک کمرے کی طرف بڑھا۔

''اس طرف......'' اس کے کان کے قریب سرگوشی ابھری، آواز ایلن ہی کی تھی شاہد سحرزدہ انداز میں دوسری طرف گھوم گیا اور کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا دروازہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر آپ ہی آپ کھل گیا۔

شاہد کمرے کے اندر داخل ہوگیا...... اندر داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ اکیلا کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی اندر آیا تھا۔

سامنے پلنگ پر کوئی شخص لحاف اوڑھے سورہا تھا۔ شاہد نے سحرزدہ انداز میں آگے بڑھ کر آہستگی سے لحاف کھینچ لیا۔

بستر پر جمال سورہا تھا...... شاہد اور عامر کا مشترکہ دوست جمال...... جو ایلن کے کہنے کے مطابق عامر اور ایلن کا قاتل تھا۔ لحاف سرکتے ہی جمال کسمسایا......

مگر دوسرے ہی لمحے شاہد کے استخوانی ہاتھ اس کا گلا دبوچ چکے تھے، جمال مچل مچل کر اپنے آپ کو اس اچانک افتاد سے بچانے کی کوشش کررہا تھا مگر نجانے شاہد کے کمزور و نحیف جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ اس کے سامنے سے ہٹنے کا جمال کا

جمال کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئیں، اس نے آخری مرتبہ مزاحمت کی کوشش کی اور پھر اس کی تمام مدافعت ختم ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے......

شاہد کا ہاتھ پوری قوت سے اس کا گلا دبائے رہے اور جب یقین ہوگیا کہ جمال ختم ہو چکا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔

دفعتاً کمرے کی فضا میں ایلن کا کھنکھناتا ہوا قہقہہ گونجا اس کے ساتھ چیخنے اور چلانے کی صدائیں کمرے میں گونجنے لگیں...... جو رفتہ رفتہ ڈوبتی چلی گئیں۔

آوازوں کے ختم ہوتے ہی شاہد کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پلنگ پر پڑی ہوئی لاش اور کمرے کا جائزہ لیا۔

''قتل......'' شاہد کے ذہن میں گونجا۔ پھر اس خیال کے آتے ہی کہ جمال اس کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، اس کا جسم پسینے میں تر ہوگیا۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا، خوف کی ایک شدید لہر اس کے جسم میں سرائیت کرگئی۔ وہ تیزی سے مڑا اور مکان سے نکل کر اندھادھند ایک طرف کو بھاگ نکلا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا رخ کس سمت ہے وہ تو بس دوڑا جا رہا تھا...... اپنی جان بچانے کے لئے ......دوڑتے دوڑتے اچانک اس کا رخ لسٹن روڈ کی طرف ہوگیا لسٹن روڈ پہنچ کر اس کی رفتار میں کچھ اور بھی تیزی آگئی...... اس کا رخ مریم والے قبرستان کی طرف تھا جیسے جیسے وہ قبرستان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا اس کے کانوں میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں جو لحہ بہ لحہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

پل کراس کراتے ہی آوازوں میں شدت آگئی جیسے ہزاروں روحیں ایک ساتھ مل کر چلا رہی ہوں اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے، مگر وہ دوڑ رہا تھا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

دوڑتے دوڑتے وہ قبرستان کی چاردیواری میں داخل ہوگیا، ایک قبر کے قریب پہنچ کر اس کے قدم بری طرح لڑکھڑائے اور وہ قبر کے اوپر گر گیا...... قبر پر گرتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے گرد بہت سے چیختے چلاتے ہوئے سائے رقص کر رہے ہوں، وحشیانہ رقص۔

شاہد نے سر اٹھا کر دیکھا...... اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کئی سائے وحشیانہ رقص کرتے ہوئے ہاتھوں کے پنجے بڑھائے اس کے قریب پہنچ رہے تھے۔ شاہد کو اپنا سینہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا اس کا دل ایک مرتبہ پوری قوت سے اچھلا اور پھر ساکت ہوگیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے...... اس وقت برف باری شروع ہوگئی اور برف کے گالے شاہد کے اوپر گرنے لگے۔

دوسرے روز مریم والے قبرستان سے پولیس نے شاہد کی لاش اٹھالی۔ لاش کی اطلاع پی۔ ایس۔ پی کوارٹروں میں رہنے والے ایک شخص نے دی تھی جو صبح ہی صبح رفع حاجت کے لئے قبرستان سے ملحق نالے کی طرف جا رہا تھا...... پولیس نے لاش اپنے قبضے میں لے لی، پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی موت انتہائی خوف کی حالت میں حرکت قلب بند ہوجانے سے واقع ہوئی ہے۔

تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ جس قبر پر شاہد کو مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ وہ ایک برطانوی سیاح لڑکی کی تھی جو آٹھ سال قبل سیاحت کی غرض سے آئی تھی۔ اور پھر یہیں پر رہ گئی تھی۔ بعد میں اس کے محبوب اور پھر اسے بھی کسی نے ہلاک کرڈالا، اس سیاح لڑکی کو اس قبر میں دفن کیا گیا تھا مگر وہ راز آج تک کوئی بھی نہیں جان سکا کہ شاہد اس قبرستان تک کیونکر پہنچا۔





روح کا فریب

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانک رات کے نیم اندھیرے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی عمر رسیدہ خاتون لرزنے لگی کہ پھر ہیولہ کے ہونٹ ہلے اور آواز سنائی دی۔ "تم گھبرائو نہیں میں تو تمہیں لینے آیا ہوں۔" اور پھر......

خودغرض مطلب پرست اور حرص کے دلدادہ اکثر نشان عبرت بن جاتے ہیں۔ثبوت کہانی میں ہے

''**آپ!** کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ کو غم اور غصے سے محفوظ رکھا جائے۔'' ڈاکٹر مینل نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

مسز ہارٹر کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا اس قسم کی باتوں سے اطمینان کے بجائے اس کے شک وشبے میں اضافہ ہورہا ہے۔

''آپ کا دل بے شک کمزور ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔''

''ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔'' بہرحال آپ اپنے مکان میں لفٹ ضرور لگوائیں...... کیوں؟ آپ کا خیال ہے۔؟

ڈاکٹر مینل غریبوں کے بجائے امیروں کا علاج کرنا پسند کرتا تھا شاید اسی لئے کہ امیر لوگ اس کی ہدایت پر فوراً عمل کرتے۔

''ہاں تو لفٹ ضروری ہے......'' ڈاکٹر نے اپنا سامان لپیٹتے ہوئے کہا۔ اس طرح آپ محنت اور تھکاوٹ سے بچ سکیں گی...... تھوڑی سی ورزش بری نہیں لیکن سیڑھیاں چڑھنے سے اجتناب کریں اور سب سے اہم یہ کہ اپنے دل ودماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں بس یہی طریقہ ہے اپنی صحت کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنے کا۔''

مسز ہارٹر کے بھتیجے کو ڈاکٹر ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ ''گو کہ آپ کی آنٹی کی صحت بہت خراب ہے اور دل کمزور ہو چکا ہے، لیکن پرہیز اور ہدایات پر عمل کر کے خاصے عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں! انہیں پرسکون زندگی گزارنی چاہئے ہروقت مصروف رہنا چاہئے اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں زیادہ سے زیادہ خوش رہیں تاکہ خیالات بٹے رہیں...... آخر میں ایک بات یاد رہے کہ کوئی معمولی سا صدمہ بھی جان لیوا ہوسکتا ہے۔''

چارلس بہت ہی سلجھے ہوئے دماغ کا انسان تھا، خدا نے اسے عقل وہمت کی بے پناہ قوتیں دی تھیں۔ ڈاکٹر کے الفاظ سے اس کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں امڈ آئیں۔

اسی شام چارلس نے گھر میں ریڈیو سیٹ لگوانے کی تجویز پیش کی تاکہ آنٹی کا دل بہلا رہے، مسز ہارٹر نے مخالفت کی۔ وہ پہلے ہی فکرمند تھیں کہ لفٹ پر خاصے اخراجات اٹھیں گے، لیکن چارلس بضد رہا۔

''مجھے نئے زمانے کی چیزیں بالکل پسند نہیں......'' مسز ہارٹر نے کہا۔ ''ممکن ہے برقی لہریں میرے دل ودماغ پر اثر انداز ہوں۔''

''آنٹی! آپ کا خیال غلط ہے ریڈیو دل ودماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لئے تفریح مہیا کرے گی۔'' چارلس نے جواب دیا۔

مسز ہارٹر کو بالآخر رضامند ہونا پڑا اور لفٹ کے ساتھ ہی ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آ گیا۔ چارلس نے آنٹی کو ریڈیو کے تمام رموز اچھی طرح سمجھا دیئے، وہ بے حد خوش تھیں کہ سعادت مند بھتیجا ان کا بے حد خیال رکھتا ہے، چنانچہ وہ بھی چارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، قبل ازیں مسز ہارٹر نے اپنی ایک بھتیجی میری کو اپنے پاس رکھا، وہ اسے وارث بنانا چاہتی تھیں، لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا۔

وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ رکھ سکی...... چچی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ بخل سے کام لیتی اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی بعدازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کرلی جس کو مسز ہارٹر ناپسند کرتی تھیں نتیجہ یہ کہ مسز ہارٹر نے اسے ماں کے پاس بھیج دیا۔ چارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھیں وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا تھا گزرے ہوئے دور کے تذکرے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ ان کو آرام پہنچانے کی فکر میں رہتا...... مسز ہارٹر بھی اس کی سعادت مندی پر خوش ہوتیں۔

جب وہ پوری طرح مطمئن ہوگئیں تو انہوں نے اپنے وکیل کو نیا وصیت نامہ تیار کرنے کو کہا، تھوڑے دنوں میں وصیت نامہ تیار ہوگیا اور مسز ہارٹر نے دستخط کرنے کے بعد اسے وکیل کی تحویل میں دے دیا۔

ریڈیو کی بدولت مسز ہارٹر بے حد خوش رہنے لگیں۔ وہ جب بھی تنہا ہوتیں ریڈیو کے آس پاس آ بیٹھتیں اور دنیا بھر کے اسٹیشن سنتیں، یہ خوشی بھی چارلس کی مرہون منت تھی اس لئے ان کے دل میں اپنے بھتیجے کی محبت گویا گھر کرگئی۔

گھر میں ریڈیو آئے تقریباً 3 ماہ گزر گئے تھے کہ ایک دن بڑا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ چارلس کسی پارٹی میں گیا ہوا تھا۔ مسز ہارٹر کمرے میں اکیلی تھیں اور ریڈیو کے سامنے بیٹھی موسیقی سے لطف اندوز ہورہی تھیں۔

اچانک موسیقی کا پروگرام بند ہوگیا اور کمرے میں موت کی سی خاموشی چھاگئی، پھر کسی مرد کی صاف اور شستہ آواز سنائی دی۔

''میری! کیاتم میری آواز سن رہی ہو میں ہارٹر بول رہاہوں...... میں بہت جلد تمہیں لینے آ رہاہوں......تیار رہنا......تیار رہو گی نا......''

اس کے بعد موسیقی کا پروگرام دوبارہ شروع ہوگیا۔ مسز ہارٹر کرسی پر حیران وششدر بت بنی بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ''یہ آواز کیسی ہے، کہیں میں نے بھیانک خواب تو نہیں دیکھا۔ ریڈیو سے ہارٹر کی آواز کیسے آسکتی ہے؟ اس کو مرے تو عرصہ گزر گیا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔ پھر خیال آیا۔ ''یہ میرے کمزور دل کا نتیجہ ہے یا ممکن ہے بڑھاپے کی اعصابی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔'' تاہم انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کیا اور اسے بھلا دینا چاہا، لیکن یہ واقعہ تھا اس نوعیت کا کہ لاکھ کوشش کے باوجود ذہن سے محو نہ ہوسکا۔ ان کے دل ودماغ میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔

کچھ عرصہ بعد اسی قسم کا دوسرا واقعہ پیش آیا۔ اب کے بھی وہ کمرے میں تنہا تھیں۔ ریڈیو پر آرکسٹرا بج رہا تھا، اچانک خاموشی چھاگئی اور دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہارٹر تم سے مخاطب ہے میں تمہیں لینے کے لئے اب بہت جلد آنے والا ہوں۔''

آرکسٹرا پھر پہلے کی طرح پورے زور شور سے بجنے لگا۔ مسز ہارٹر نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ رات کے 12 بج رہے تھے انہوں نے اپنے بازو پر چٹکی لی، تو یقین ہوا کہ وہ بیدار ہیں، جو کچھ انہوں نے سنا ہے بیداری کے عالم میں سنا ہے اور ان کے مرحوم شوہر نے ان کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ چارلس نے خلائی لہروں کے متعلق جو لیکچر دیا تھا اس کے الفاظ ان کے ذہن میں گونجنے لگے۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے کوئی بھٹکی ہوئی لہر آسمان تک پہنچ گئی اور ہارٹر کی روح نے اس کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کرکے ہونے والے واقعہ کی اطلاع دی ہو، مسز ہارٹر نے گھنٹی بجائی۔ ان کی خادمہ الزبتھ حاضر ہوگئی۔

''الزبتھ...... میری الماری کی بائیں ہاتھ والی دراز میں سب سامان تیار ہے اس کی چابی اپنے پاس رکھو۔'' مسز ہارٹر نے آہستہ سے کہا۔

''کون سا سامان تیار ہے مادام؟'' الزبتھ نے دریافت کیا۔

''میری تجہیز وتکفین کا......'' مسز ہارٹر نے کہا...... ''کیا تمہیں یاد نہیں سامان ٹھیک کرنے میں تم نے میری مدد کی تھی۔''

''مادام! ایسا خیال دل میں نہ لائیں، اب تو آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔'' الزبتھ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔'' مسز ہارٹر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ میری عمر 60 سال سے اوپر ہوچکی ہے تم بے وقوف ہو کہ آنسو بہاتی ہو، بھلا بڑھاپے کے بعد بھی کسی پر جوانی کے دن آئے ہیں؟ زندگی کا تو فقط یہی انجام ہے...... اور وہ ہے موت...... اس منزل تک سب کو جانا ہے؟''

الزبتھ روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی، مسز ہارٹر نے محبت سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ ''بہت خدمت گزار اور مخلص عورت ہے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔'' مسز ہارٹر نے دل میں سوچا ''وصیت میں اس کے لئے میں نے کتنے پونڈ چھوڑے ہیں، اسے تقریباً 10 ہزار پونڈ تک ملنے چاہیں یہ میرے پاس ایک عرصے سے کام کررہی ہے......'' انہوں نے دل میں سوچا۔

دوسرے دن، مسز ہارٹر نے اپنے وکیل کو فون کیا کہ وصیت نامہ بھیج دو میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں اور الزبتھ کے لئے زیادہ رقم درج کرنا چاہتی ہوں۔

اسی دن! دوپہر کھانے کے دوران چارلس نے ایک حیرت انگیز بات کہی۔

''آنٹی!'' چارلس بولا...... ''کونے والے کمرے میں آتشدان پر کسی شخص کی تصویر رکھی ہے بڑی

بڑی مونچھوں والا یہ آدمی بالکل مسخرہ لگتا ہے۔"

"وہ تمہارے انکل ہارٹر کی جوانی کی تصویر ہے۔" مسز ہارٹر نے جواب دیا۔

"آنٹی مجھے معاف کردیجیے میں نے انکل کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے دراصل مجھے اس بات پر حیرت ہے۔" چارلس ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"چارلس تمہیں کس بات پر حیرت ہے؟ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" مسز ہارٹر نے کہا۔

"کوئی بات نہیں آنٹی، میرا خیال ہے مجھے دھوکا ہوا ہے۔" چارلس نے مبہم سا جواب دیا۔

"چارلس میری خواہش ہے جو بات تم کہتے کہتے رک گئے ہو، وہ مجھے بتاؤ....." مادام نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں آپ کو بالکل فکرمند نہیں ہونا چاہئے میرا خیال ہے کہ یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔" چارلس نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔

"چارلس میں حکم دیتی ہوں کہ میری بات کا جواب دو۔" مادام نے قدرے غصے سے کہا۔

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہونے لگیں آنٹی، دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تصویر والے آدمی کو پچھلی رات دیکھا ہے وہ کونے والا کمرہ ہے نا، اس کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، صبح میری نظر تصویر پر پڑی تو میں نے فوراً پہچان لیا، وہ شخص اس آتشدان والی تصویر سے حیران کن مشابہت رکھتا تھا..... ممکن ہے یہ سب نظر کا دھوکا ہو، لیکن آنٹی پہلے تو مجھے ایسا دھوکا کبھی نہیں ہوا۔"

"تم نے انہیں کونے والے کمرے میں دیکھا تھا؟" مسز ہارٹر نے دوبارہ دریافت کیا۔

وہ بے حد حیران تھیں کیونکہ کونے والا کمرہ ان کے شوہر کا ڈریسنگ روم تھا۔ انہوں نے سوچا شاید ان کے شوہر کی روح ابھی تک ڈریسنگ روم میں موجود ہے۔

شام کے وقت چارلس گھر میں نہ تھا مسز ہارٹر بے چینی کے عالم میں ریڈیو کے پاس بیٹھی پراسرار آواز کا انتظار کررہی تھیں۔ ان کا خیال تھا تیسری بار بھی وہی آواز آئی تو اس بات میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ اب وہ دنیا میں چندروز کی مہمان ہیں ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور جب ریڈیو کا پروگرام بند ہوگیا، تو انہیں ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آرش لہجے میں بہت دور سے آتی ہوئی مخصوص آواز سنائی دی۔

"میری، میرا خیال ہے تم بالکل تیار ہو..... میں جمعہ کو آؤں گا..... رات کے 12 بجے..... ڈرنا مت.....تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی بس تیار رہنا؟"

پھر فوراً ریڈیو پروگرام شروع ہوگیا..... مسز ہارٹر کرسی پر بے حس وحرکت بیٹھی رہیں..... ان کا رنگ سفید پڑگیا..... بڑی مشکل سے وہ اٹھیں اور لکھنے کی میز پر جابیٹھیں..... انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا۔

"آج رات پھر میں نے صاف طور پر اپنے مرحوم شوہر کی آواز سنی ہے انہوں نے کہا ہے کہ وہ جمعہ کی رات مجھے لینے آئیں گے۔ اگر اس روز میں مرجاؤں۔ تو میری خواہش ہے کہ تمام لوگوں کو یہ بتایا جائے اور یہ ثابت ہوجائے کہ روحوں کی دنیا سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔"

انہوں نے ایک بار پھر تحریر کو غور سے پڑھا۔ اسے لفافے میں رکھ کر اسے بند کیا اور گھنٹی بجائی، تھوڑی دیر بعد الزبتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ مسز ہارٹر کرسی سے اٹھیں اور لفافہ الزبتھ کے ہاتھ میں دے کر بولیں۔

"الزبتھ! اگر جمعہ کی رات کو میں مرجاؤں تو یہ لفافہ ڈاکٹر مینل کو دے دینا..... اس سلسلے میں مجھ سے کسی بحث کی ضرورت نہیں، میں اپنے معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں..... ہاں! میں نے اپنی وصیت کے مطابق تمہارے لئے 10 ہزار پونڈ چھوڑے ہیں۔ اگر میں مرنے سے پہلے بینک نہ جاسکی تو چارلس میرے مرنے کے بعد انتظام کردے گا۔"

دوسرے دن مسز ہارٹر نے چارلس سے کہا

۔ ’’اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو الزبتھ کو 10 ہزار پونڈ دے دیئے جائیں۔‘‘

’’آنٹی آپ کو وہم ہوگیا ہے......‘‘ چارلس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بالکل صحت مند ہیں میری دعا ہے کہ ہم آپ کی 100ویں سالگرہ منائیں۔‘‘

مسز ہارٹر نے چارلس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف مسکراتی رہیں...... تھوڑی دیر بعد بولیں۔ ’’چارلس، جمعہ کی شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے۔‘‘

’’میرے ایک دوست نے برج کھیلنے کی دعوت دی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں گھر پر رہوں تو میں نہیں جاؤں گا۔‘‘ چارلس بولا۔

مسز ہارٹر بولیں...... ’’نہیں نہیں میری یہ خواہش نہیں مگر میں اس رات بالکل تنہا رہنا چاہتی ہوں۔‘‘

جمعہ کی شام! گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، مسز ہارٹر معمول کے مطابق کرسی آتشدان کے قریب کر کے بیٹھی تھیں وہ اپنے کوچ کی تیاری مکمل کر چکی تھیں، صبح بینک بھی گئیں اور 10 ہزار پونڈ نکلوا کر الزبتھ کو دے دیئے۔ انہوں نے اپنی تمام چیزیں ٹھیک کر کے رکھ دی تھیں...... انہوں نے ایک بڑا سا لفافہ کھولا اور اندر سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا، یہ وصیت نامہ تھا جو ان کے وکیل نے ہدایت کے مطابق بھیجا تھا۔

ایک بار پڑھ لینے کے بعد اس پر دوبارہ نظر ڈالی یہ ایک مختصر سی تحریر تھی، انہوں نے 10 ہزار پونڈ کا ذکر الزبتھ کے نام کیا تھا اور 5 ہزار پونڈ کے 2 ترکے دو بہنوں کے نام چھوڑے تھے اور باقی سب کچھ اپنے پیارے بھتیجے چارلس کے نام لکھ دیا تھا، انہوں نے وصیت پڑھ کر اپنا سر کئی بار ہلایا...... وہ سوچ رہی تھیں ان کی دفات کے بعد چارلس بہت امیر آدمی بن جائے گا۔

انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا...... 12 بجنے میں 3 منٹ باقی تھے وہ بالکل تیار تھیں، ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخر 12 بج گئے انہوں نے بے چینی سے ریڈیو کا بٹن دبا دیا، وہ آج پھر اسی خصوصی آواز کی منتظر تھیں لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ایک سرد لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھوڑی دیر بعد پھر وہی آواز آئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر آنے والا چلتے چلتے رک گیا اور دروازہ آہستہ سے کھلا خوف سے مسز ہارٹر کا جسم کانپنے لگا...... ان کی آنکھیں ادھر کھلے دروازے پر جم گئیں...... دفعتاً ان کا ہاتھ لڑکھڑایا اور وصیت نامہ سامنے جلتے ہوئے آتشدان میں جا گرا...... ان کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں ایک جانی پہچانی صورت کھڑی تھی۔

’’آخر ہارٹر، ان کو لینے کے لئے آ ہی گیا۔‘‘ ان کا دل ڈوبنے لگا اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑیں۔

ڈاکٹر مینل کو بلایا گیا...... چارلس کو بھی برج پارٹی پر اطلاع دی گئی لیکن دوا اور دعا کرنے سے پہلے مسز ہارٹر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، آنٹی کی موت چارلس کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔

دوسرے دن الزبتھ نے مسز ہارٹر کا خط ڈاکٹر مینل کو دیا...... ڈاکٹر نے بڑی دلچسپی سے اسے پڑھا اور کہا۔ ’’ایسا معلوم ہوتا ہے تمہاری مالکہ اپنے شوہر کو تصور میں دیکھا کرتی تھیں اور ان سے باتیں کیا کرتی تھیں، اسی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی۔‘‘

اگلی رات جب گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ بے خبر سو رہے تھے، چارلس آہستہ سے اٹھا اور چوری چھپے اپنی آنٹی کے کمرے میں گیا اور ایک تار جو ریڈیو کے بکس سے اس کے کمرے تک چلا گیا تھا، الگ کر دیا۔

شام سخت سردی تھی، چارلس نے اپنے کمرے میں آگ روشن کی اور اپنی مصنوعی داڑھی اور مونچھیں اس میں پھینک دیں اور اپنے انکل کے کچھ پرانے کپڑے ایک صندوق میں چھپا دیئے، ریڈیو کی اسکیم چارلس کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھی۔

جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ کوئی معمولی واقعہ

بھی مسز ہارٹر کی جان لے سکتا ہے..... بہرحال اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ مسز ہارٹر کی تجہیز وتکفین بخیر وخوبی ہوگئی اور چارلس پر کسی کو شک بھی نہ ہوا۔

چند روز بعد الزبتھ نے چارلس کو اطلاع دی کہ مسز ہارٹر کا وکیل آیا ہے۔ چارلس تو اس وقت کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں پہنچا..... اس نے وکیل کو خوش آمدید کہا، وکیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''مسٹر چارلس، آپ نے جو خط میرے نام لکھا میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا، آپ کو شاید یہ خیال ہے کہ مسز ہارٹر کا وصیت نامہ میرے پاس ہے۔''

''ہاں، میرا تو یہی خیال ہے۔'' چارلس نے کہا۔ ''آنٹی نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

''انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا ان کا وصیت نامہ پہلے میرے پاس ہی تھا۔'' وکیل نے جواب دیا۔

چارلس نے بے چینی سے کہا۔ ''کیا مطلب؟ پہلے پاس تھا اور اب نہیں؟''

''جی ہاں.....!'' وکیل نے جواب دیا۔ ''مسز ہارٹر نے مجھے لکھا تھا کہ وصیت نامہ ان کو واپس بھیج دیا جائے۔'' یہ سن کر چارلس بے چین ہوگیا۔

وکیل نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ان کی ذاتی چیزوں میں وصیت نامہ تلاش کیا ہے؟''

چارلس نے جواب دیا! ''جی ہاں! الزبتھ نے ان کی ذاتی چیزوں میں کافی تلاش کیا مگر نہیں ملا۔''

وکیل نے الزبتھ کو بلایا..... الزبتھ نے بتایا کہ ''مسز ہارٹر کی وفات کے بعد اس نے آتشدان میں جلے ہوئے کاغذات اور لفافے کی راکھ دیکھی تھی۔''

چارلس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

وکیل کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے، آخری دنوں میں مادام آپ سے ناراض ہوگئی ہوں گی، چنانچہ انہوں نے وصیت نامہ نذر آتش کرنے کے لئے واپس منگوالیا۔''

''جی نہیں، وہ آخر تک مجھ سے بے حد خوش تھیں۔'' چارلس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

دفعتاً چارلس کی آنکھوں میں آنٹی ہارٹر کی موت کا منظر گھوم گیا..... مسز ہارٹر ایک ہاتھ سے اپنا دل پکڑے بیٹھی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے کچھ کاغذ پھسل کر دہکتی ہوئی آگ میں جاگرے۔ چارلس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا..... اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں وکیل سے پوچھا۔ ''اگر وصیت نامہ نہ ملا تو کیا ہوگا؟''

وکیل نے جواب دیا۔ ''ان کے پرانے وصیت نامے پر عمل درآمد کیا جائے گا جس کی رو سے ان کی تمام جائیداد کی وارث ان کی بھتیجی میری ہے۔''

وکیل کے جانے کے بعد چارلس بے حد پریشان نظر آتا تھا وہ سوچ رہا تھا، اس کی تمام ہوشیاری اور چالاکی میری کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ وہ خیالات میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈاکٹر مینل کا فون تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ ''مسز ہارٹر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ ان کا دل بے حد کمزور ہو چکا تھا اور وہ اس ناکارہ دل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ صرف 2 ماہ تک زندہ رہ سکتی تھیں۔''

چارلس نے سر پیٹ لیا..... کاش! اس نے دو ماہ انتظار کرلیا ہوتا اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا۔ ''اپنی آنٹی کو ریڈیو کے ذریعے قتل کرکے میں نے بھیانک گناہ کیا ہے۔''

اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی..... ذہن پر ہر وقت خیالات کا دباؤ رہنے لگا، رفتہ رفتہ وہ اعصابی بیماری کا شکار ہوگیا۔

ایک روز ایسی ہی پریشانی کے عالم میں اس نے ایک تحریر تیار کی جس میں اس نے ایک کاغذ پر لکھا ''میری آنٹی اپنی موت نہیں مری تھیں بلکہ میں نے انہیں قتل کیا تھا۔'' پھر پوٹاشیم سائنائڈ ''مہلک زہر'' کا ایک چمچ حلق میں انڈیل لیا۔



روح کی بے چینی

ایس امتیاز احمد-کراچی

ایک روح کی دل شکستہ روداد جو کہ پچیس سال تک سسکتی اور بلکتی رہی، اشارے اشارے سے لوگوں کو حقیقت سے روشناس کراتی رہی مگر کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی اور پھر آخر کار اس نے اپنا انتقام پورا کرلیا۔

دل ودماغ اورذہن پر اپنا سکتہ بٹھاتی اور رونگٹے کھڑے کرتی عجیب وغریب پرتحیر خوفناک کہانی

''**جہاں** تک ارواح کے وجود کا تعلق ہے میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔'' کامران شامی نے نووارد ملاقاتی کا بیان سننے کے بعد کہا۔ ''لیکن ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرح ارواح کی ماورائی قوتوں اور ناقابل فہم شعبدہ بازیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔''

اس کے ملاقاتی کا نام ریاض حسین تھا، وہ اپنی خوب صورت بیوی ثروت کے ہمراہ اس کے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا تھا جو بہت حد تک ارواح کی روایتی کہانیوں سے ملتا جلتا تھا۔

کامران شامی ایک تجربہ کار وکیل ماہر سراغ رساں اور نفسیاتی وسفلی علوم کا مستند عالم تھا۔ لوگ اس کے پاس قانونی، ازدواجی، نفسیاتی اور پراسرار جرائم کے مسائل حل کرانے کے لئے آتے تھے۔

''ریاض صاحب اس دنیا میں کوئی بات انہونی نہیں۔'' شامی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو بھی میرا خیال ہے کہ آج کے سائنسی دور میں شاید ہی کوئی ایسی شے ہو جو انسان کے قبضہ تصرف سے باہر رہ گئی ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر جن بھوت وغیرہ قسم کی کوئی مخلوق اس کرۂ ارض پر موجود بھی ہو تو بلاشبہ وہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت تسخیر سے خائف ہو کر کسی دوسرے سیارے کی طرف چلی گئی ہوگی۔ یقین کیجئے انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔''

''آج سے کچھ عرصہ قبل میں بھی ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔'' ریاض حسین نے کہا۔ ''لیکن جناب حال ہی میں ہمارے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے سبب سے میں اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ میری بیوی ان واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔ نظریاتی بحث سے قطع نظر امر واقع یہ ہے کہ صورتحال ہماری برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اختصار سے ان واقعات کو آپ کے سامنے بیان کردوں۔''

''ضرور، ضرور۔'' شامی نے کہا۔ ''آپ بلا جھجک اپنا مسئلہ پیش کرسکتے ہیں۔''

''ہم وادی کاغان کے ایک چھوٹے سے گاؤں خاصکوٹ میں رہتے ہیں۔'' ریاض حسین نے قدرے تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔

''یہ علاقہ ایبٹ آباد سے تقریباً ساٹھ میل شمال میں واقع ہے۔ خاصا پرفضا اور صحت افزا مقام ہے۔ چاروں طرف سے سرسبز وشاداب پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ آبادی بمشکل ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دو



سال قبل ہم نے ایک پرانی وضع کا پختہ مکان خریدا ہے جو زریں منزل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مکان گاؤں سے تقریباً سوگز باہر سرسبز درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں تین کمرے، ایک باورچی خانہ اور دو طرفہ برآمدہ ہے۔ مکان چونکہ سستا مل رہا تھا اس لئے ہم نے فوراً خرید لیا۔ مکان سے ملحقہ دو کنال کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں چھوٹا سا باغیچہ بنا ہوا ہے۔ مجموعی اعتبار سے مکان اور اس کا ماحول نہایت حسین اور دلفریب ہے۔

پہلے سال گرمیوں کا موسم بہت اچھا گزر گیا۔ لیکن موسم سرما کا آغاز ہوتے ہی ہم نے عجیب قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنی شروع کردی، ابتدا میں ہم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن بتدریج اس بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بے خوابی کی شکایت ہونے لگی۔ اکثر رات کو ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ ہستی ہم سے نفرت کا اظہار کررہی ہے، دھمکیاں دے رہی ہے، غصہ اور دشمنی کا اظہار کررہی ہے اور ''انتقام انتقام'' پکار رہی ہے۔

سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس پراسرار ہستی کے بغض وعناد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ جب موسم کی پہلی برف باری ہوئی تو یقین کیجئے اس کیفیت میں ناقابل بیان شدت پیدا ہوگئی۔ گھبراہٹ، خوف اور ذہنی کھنچاؤ نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔

ہم کئی راتوں تک اچھی طرح نہیں ہوسکے، بالآخر ہم نے مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا لیکن کچھ دنوں کے بعد موسم قدرے گرم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گھبراہٹ بھی جاتی رہی اور ہم نے آرام کی نیند سونا شروع کردیا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ہماری ساری پریشانی کا سبب سردی اور بے خوابی تھی۔ یعنی سردی کے باعث بے خوابی کی شکایت ہوئی اور بے خوابی کی وجہ سے ہم گھبراہٹ اور توہم پرستی کا شکار ہوگئے، موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی گھبراہٹ اور خوف کی کیفیت بالکل ختم ہوگئی بلکہ بھولی بسری بات ہوگئی۔

اب موسم سرما میں ایک بار پھر ہمارے دلوں پر وہی بے چینی، بے خوابی، اور گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بھی بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اس کیفیت کے پس پشت ضرور کوئی پراسرار ہستی کارفرما ہے جسے عام طور پر جن یا روح وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے پھر آج سے چند روز پیشتر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمارے یقین کو حق الیقین میں تبدیل کردیا۔

یہ گزشتہ جمعرات کی بات ہے اس روز بڑے زوروں کی برف باری ہورہی تھی۔ میں اور ثروت سرشام کھانے سے فارغ ہوکر بستر پر لیٹ گئے۔ تاہم نیند کا نام ونشان نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد برف باری کے ساتھ ساتھ تیز جھکڑ بھی چلنا شروع ہوگیا۔

دفعتاً ہمارے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ وہ آواز گو مبہم اور واضح نہ تھی تاہم غایت درجہ اثر انگیز اور پرسوز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ سسک سسک کر رو رہا ہے۔

شروع میں ہم نے اس آواز کو تیز ہوا کی آواز قیاس کرکے نظر انداز کردیا۔ مگر دھیرے دھیرے وہ نمایاں ہوتی چلی گئی۔ پھر دفعتاً کمرے کا درجہ حرارت گرنا شروع ہوگیا۔ حالانکہ انگیٹھی میں آگ برابر سلگ رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں دروازے بدستور بند تھے۔ پر سردی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ وہ رات گزشتہ تمام راتوں سے زیادہ اذیت ناک تھی۔ انگیٹھی میں جلنے والی آگ کی مدھم روشنی کمرے کی فضا میں لرز رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ شے چاروں طرف سے ہم پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ ہمارے خوف اور ذہنی کھنچاؤ میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

سسکیوں کی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ دردناک آواز پوری فضا پر محیط معلوم ہوتی تھی۔

برف باری اور جھکڑ کی آواز کسی ماتمی ساز کی

مانند اس آواز کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ ناگہاں میں نے خواب گاہ سے ملحقہ کمرے کے وسط میں ایک دھندلا سا روشن غبار نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے جنبش کرتا ہوا فرش زمین سے بلند ہورہا تھا۔ ہم ساکت و جامد آنکھیں پھاڑے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھنے لگے۔ وہ روشن غبار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شکل اختیار کرنے لگا۔ ایک انسانی شکل!

چند ساعتوں کے بعد وہ غبار ایک مکمل انسانی جسم کا خاکہ اختیار کرچکا تھا۔ جس انداز میں وہ گردش کرتا اور بل کھاتا دکھائی دیتا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی غصے اور طیش کے عالم میں ہے۔ اب یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ تمام بغض و عناد اور نفرت و حقارت کا منبع یہی پراسرار ہستی تھی۔

دفعتاً اس کا سر ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا چہرے پر کربناک تاثرات نظر آنے لگے جن میں شدید غیض و غضب احتجاج اور نفرت پائی جاتی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے منہ کھولا اور ایک دردناک چیخ بلند کی جس کی آواز زمین سے آسمان تک گونجتی چلی گئی۔ اس کے فوراً بعد وہ دھندلا غبار تاریکی میں تحلیل ہوگیا۔''

یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔

''واقعی حیرت انگیز تجربات ہے۔'' شامی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ''بیگم ثروت کیا آپ اس معاملے میں کچھ کمی بیشی کرنا چاہیں گی؟''

''ریاض صاحب نے مکمل واقعہ بیان کردیا ہے۔'' ثروت نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ''وہ دھندلا غبار جسم میں خاصا بڑا تھا۔ کم از کم آٹھ فٹ اونچا ہوگا اور جیسا کہ ریاض صاحب نے بیان کیا چہرے پر نظر آنے والے تاثرات انتہائی خوفناک تھے۔ تاہم ذاتی طور پر میرا احساس یہ ہے کہ وہ کسی دس سالہ بچے کا چہرہ تھا۔ اور وہ چیخ......! اوہ میں تازندگی اس پرسوز چیخ کو نہیں بھلاسکوں گی......''

''کیا یہ شے اس سے پہلے بھی کبھی دیکھنے میں آئی تھی۔ آپ نے برف باری اور جھکڑ کا ذکر کیا تھا۔'' شامی نے کہا۔

''غالباً یہ جھکڑ پہلی مرتبہ چلا تھا۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس پراسرار منظر کا جھکڑ سے کوئی تعلق ہے۔'' شامی نے کہا۔

''محض ایک قیاس ہے۔ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' ریاض نے کہا۔ ''یہ علاقہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

تقریباً ایک سو تیس میل...... جس میں ساٹھ میل کا پہاڑی راستہ بھی شامل ہے۔''

''بظاہر یہ معاملہ میرے دائرہ کار سے باہر ہے۔'' شامی نے کہا۔

''شامی صاحب اگر آپ نے انکار کیا تو ہمیں بہت مایوسی ہوگی۔'' ثروت نے کہا۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ اس کیس میں کچھ باتیں ایک ہیں جو براہ راست میرے نظریات سے ٹکراتی ہیں۔ اگر معاملہ ویسا ہی ثابت ہوا جیسا آپ نے بیان کیا ہے تو مجھے یقیناً اپنے نظریات میں کچھ تبدیلی کرنی پڑے گی۔''

''گویا آپ نے یہ کیس منظور کرلیا ہے۔'' ثروت نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی فیس؟''

شامی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''فیس کے بارے میں کوئی تردد نہ کیجئے۔ اس میں حسب ضرورت کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔'' پھر اس نے ایک کاغذ اور قلم ریاض حسین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پر زریں منزل کے سابقہ مالک کا نام اور پتہ تحریر کردیں۔''

''سابقہ مالک کا نام عباس گل ہے۔'' ریاض نے کاغذ پر پتہ لکھتے ہوئے کہا۔ ''آج کل وہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے۔''

''ممکن ہے دو تین روز تک میں خاصکوٹ میں آکر آپ سے ملاقات کروں۔''

''میں آپ کو ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا تھا۔'' ریاض نے کہا۔

''میں پہلے عباس گل سے ملوں گا۔ پھر خاص کوٹ آؤں گا۔''

ایبٹ آباد کی گلیاں اور بازار نسبتاً سنسان پڑے تھے۔ قرب و جوار کی پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شمال کی طرف سے ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں چل رہی تھیں۔ عباس گل کا مکان شہر کے گنجان علاقے میں واقع تھا۔ کامران شامی نے اپنی گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی کردی اور ایک ایک مکان دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے دارالحکومت سے فوکس ویگن کے ذریعے وہاں پہنچا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مطلوبہ مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر دروازے پر دستک دینے کے بعد وہ انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھولنے والا عباس ہی تھا۔ اس کا قد چھوٹا، جسم مضبوط اور آنکھیں سیاہ تھیں، جن میں خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی خود کار طریقے پر گھنی مونچھوں کا زاویہ درست کرنے میں مصروف تھی۔ مجموعی طور پر وہ خاصا تند خو نظر آتا تھا۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ شامی کو بیٹھک میں لے آیا۔ پھر گرم گرم قہوہ پیش کرنے کے بعد کہا۔

''آپ زریں منزل کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

''دراصل ہمارے ملک میں توہم پرستی بہت پائی جاتی ہے۔'' شامی نے قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''زریں منزل کا موجودہ مالک میرے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا ہے جس میں بظاہر بھوتوں کا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں ایک دوسرے انداز سے اس مسئلہ پر غور کررہا ہوں۔''

''حیرت انگیز بات ہے۔'' عباس گل نے کہا۔ ''یہ مکان میرے پاس تقریباً تین سال تک رہا ہے مگر میری کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''آپ نے یہ مکان کس سے خریدا تھا؟''

''دراصل یہ مکان ٹاؤن کمیٹی کی ملکیت تھا اور عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا۔'' عباس گل نے کہا۔ ''میں نے تفریح اور شکار وغیرہ کے لئے اسے خرید لیا تھا اور اپنے دوستوں کے ہمراہ اکثر وہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ تاہم میں نے کبھی اسے رہائش کے لئے استعمال نہیں کیا۔''

''کیا آپ سردیوں میں بھی وہاں ٹھہرا کرتے تھے؟''

''صرف ایک مرتبہ سردیوں میں وہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔''

''اس دوران آپ کو بے خوابی یا ذہنی کھنچاؤ تو محسوس نہیں ہوا؟''

''میرے ساتھ تین اور دوست بھی تھے۔ ہم نے صرف دو راتیں وہاں گزاری تھیں۔ جہاں تک بے خوابی کا تعلق ہے اس کی شکایت ضرور ہوتی تھی کیونکہ ہم چاروں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے اس لئے جگہ کی تنگی کے باعث اچھی طرح نہیں سو سکے تھے۔''

''مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟''

''نہیں...... کیوں؟''

''یونہی پوچھ لیا۔'' شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے قہوے کا بہت بہت شکریہ۔''

زریں منزل پر خاموشی چھائی تھی۔

کامران شامی نے اپنی فوکس ویگن صدر دروازے کے سامنے کھڑی کردی اور کھڑکی سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ ہر طرف سفید سفید برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کا دیرینہ دوست جوزف براؤن بھی تھا۔ قدرے توقف کے بعد دونوں گاڑی سے باہر آگئے۔ جوزف نے بھاری اور پرانی وضع کے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ریاض حسین نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ثروت بھی کھڑی تھی۔ شامی کو دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تھوڑی دیر تک رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ ثروت نے کافی بنا کر انہیں پیش کی پھر

اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے شامی نے پوچھا۔

''سنائیے رات کیسی گزری؟''

''حسب معمول بے خوابی کی شکایت رہی۔'' ریاض نے جواب دیا۔ ''لیکن نسبتاً آرام رہا۔ کیونکہ گزشتہ رات برف باری نہیں ہوئی۔''

''عمارت کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟'' شامی نے پوچھا۔

''تہہ خانہ تو کوئی نہیں۔'' ثروت نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی تک ہمارے بیان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔''

''ایسی بات نہیں۔ بلکہ میں اس معاملے کی کوئی قابل قبول توجیہہ تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

''یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ بذات خود مکان کا جائزہ لے لیں۔'' ریاض نے کہا۔

''میں یہ بات کہنے ہی والا تھا۔'' شامی نے کہا۔

پھر وہ دونوں ریاض کی رہنمائی میں مکان کے مختلف حصوں کو دیکھنے لگے۔ ''مکان تو بالکل سیدھا سادا ہے۔'' جوزف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی خفیہ گوشہ یا کمرہ نہیں۔ اگر کسی بھوت یا روح سے ملاقات نہ ہوئی تو سخت مایوسی ہوگی۔''

''ریاض صاحب کیا یہ ممکن ہے؟'' شامی نے کہا۔ ''کہ آج کی رات آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں قیام کرنے کا انتظام کرلیں۔ ہم تنہا یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ میں اور جوزف۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' ریاض نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں یہ بات بالکل نامناسب ہے۔'' جوزف نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ بھوت بھی ان کے ساتھ ہی چلا جائے۔''

تب..... شامی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس گتھی کو سلجھانا مزید آسان ہوجائے گا۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' ریاض نے حیرت سے کہا۔

''یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ پراسرار روح کا تعلق مکان سے نہیں آپ کی ذات سے ہے۔''

ریاض اور ثروت چونک کر شامی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر خوف کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ تاہم انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت وہ خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں کھڑے تھے۔

''یہ وہ کمرہ ہے جس میں دھندلا غبار نظر آیا تھا۔'' ریاض نے کہا۔

''کیا آپ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کا تعین کرسکتے ہیں جہاں سے وہ غبار اٹھنا شروع ہوا تھا۔''

''تقریباً اس جگہ سے.....'' ریاض نے ایک جگہ پہ پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

شامی نے فرش پر بچھا ہوا قالین اس جگہ سے ہٹا دیا اور اکڑوں بیٹھ کر فرش کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس نے چونک کر کہا۔

''جوزف اس فرش کو ذرا غور سے دیکھو۔ کیا اس میں تمہیں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے؟''

جوزف آنکھیں جھپکتے ہوئے فرش کو گھورنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ ایک عام سا فرش ہے۔''

''واپسی پر تمہاری آنکھیں ٹیسٹ کروانی پڑیں گی۔'' شامی نے کہا۔ ''کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ فرش کا یہ حصہ باقی فرش سے مختلف ہے۔ واضح طور پر اسے دوبارہ توڑ کر بنایا گیا ہے۔'' ریاض اور ثروت بھی اس حصے کو آنکھیں پھاڑ کر گھورنے لگے۔

''آپ کے پاس ہتھوڑی یا اس قسم کی کوئی چیز ہوگی؟'' شامی نے ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ فرش توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' ثروت نے کہا۔

''فی الحال نہیں۔'' شامی نے جواب دیا۔ ''تاہم ہوسکتا ہے کہ اس کی ضرورت بھی پڑ جائے۔''

تھوڑی دیر بعد ریاض نے ایک ہتھوڑی لاکر شامی کے ہاتھ میں تھمادی۔

شامی نے ہتھوڑی سے فرش کے مختلف حصوں کو بجا کر دیکھنا شروع کر دیا پھر وہ سیدھا کھڑا ہو کر ریاض کو گھورنے لگا۔

''آپ نے کہا تھا کہ اس عمارت میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ نے نقشہ دیکھا تھا یا محض قیاس سے یہ بات کہی تھی؟''

''نقشہ تو نہیں دیکھا تھا۔'' ریاض نے جواب دیا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ نقشہ محفوظ بھی نہیں رہا ہوگا۔''

تھوڑی دیر کے بعد چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر آتش دان کے سامنے بیٹھ گئے، کئی لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ہر شخص کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔'' شامی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے ہیں۔''

ثروت اور ریاض کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں شامی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔ شامی نے مزید کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اپنے کسی دوست کے ہاں جانے کی تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ اگر طوفان شروع ہوگیا تو جانا مشکل ہو جائے گا۔''

نصف گھنٹے کے بعد ریاض اور ثروت اپنے ایک عزیز کے گھر چلے گئے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شامی اور جوزف آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی اور ہوا بتدریج طوفان کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد جوزف نے کہا۔

''دوست سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مجھے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا ہے۔''

''کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔ شاید کمرے میں آکسیجن کی کمی واقع ہو رہی ہے۔'' شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی گھبراہٹ شامل تھی۔

''ممکن ہے کھڑکی کھولنے سے کچھ فرق پڑ جائے۔'' پھر وہ کھڑکی کے قریب جا کر چند لمحوں تک باہر گرتی ہوئی برف کو دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کھڑکی کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی یخ بستہ اور تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی اندر داخل ہونا شروع ہوگئی۔ ایک لمحے کے بعد اس نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔

''شاید میرا خیال غلط ہے۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھٹن کا سبب کچھ اور ہے۔''

معاً ایک مدھم آواز، جو کسی پرسوز آہ سے ملتی جلتی تھی، ہوا کے دوش پر آتی محسوس ہوئی۔

''شامی!'' جوزف نے تیزی سے کہا۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''ٹھہرو ٹھہرو۔'' شامی نے آواز کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔

ایک ثانیے کے بعد دوبارہ آواز سنائی دی۔ جوزف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس نے اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''میرے دوست یہ کوئی سازش ہے، سازش۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''پستول واپس رکھ لو'' شامی نے قدرے سختی کے ساتھ کہا۔ ''سازش کرنے والے آہیں نہیں بھرا کرتے۔''

جوزف نے پستول واپس رکھ دیا اور نڈھال ہو کر کرسی پر گر گیا۔ باہر شدید برف باری ہو رہی تھی اور تیز ہواؤں نے جھکڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

''شامی۔ اس خاموشی سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔'' جوزف نے کہا۔ ''خدا کے لئے کچھ بات کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''جوزف، ذرا سوچو کہ اگر اس وقت ہم نے اس ذہنی کھنچاؤ کا تجزیہ نہ کیا تو کبھی حقیقت نہیں جان سکیں گے۔ اس لئے اپنے حواس کو کنٹرول میں رکھو اور اس کیفیت کی کوئی قابل فہم توجیہہ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔''

سسکی کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ آواز زیادہ

واضح تھی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ آواز مسلسل سنائی دینی شروع ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پوری کائنات سسکیاں لے رہی ہے۔ اچانک شامی نے جوزف کا بازو پکڑلیا۔

''جوزف ادھر دیکھو۔'' اس نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں پر زرد رنگ کا دھندلا سا غبار کمرے کی تاریکی میں پھیلتا نظر آرہا تھا۔ وہ فرش سے موم بتی کے مدھم شعلے کی مانند لرزتا ہوا ہولے ہولے بلند ہورہا تھا۔ اوپر اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حجم میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ مخصوص انداز میں جنبش کرتا اور بل کھاتا نظر آرہا تھا۔ کم وبیش آٹھ فٹ تک بلند ہونے کے بعد اس کا بڑھنا اور پھیلنا رک گیا۔ اب وہ ایک انسانی جسم کا خاکہ اختیار کرچکا تھا۔

شامی اور جوزف زمان ومکان کی حدود وقیود سے بے خبر کسی سحر زدہ انسان کی مانند اسے گھور رہے تھے۔ اس مافوق الفطرت وجود کے بل کھاتے ہوئے جسم سے نفرت وحقارت اور انتقام وعناد کی چنگاریاں نکل کر دونوں کے دل وجود پر حاوی ہوتی جارہی تھیں۔ معاً اس کے چہرے پر کسی جیتے جاگتے انسان کے نقوش نمایاں ہوگئے۔ اس کے چہرے پر انتہائی کرب واذیت کے تاثرات پائے جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنا منہ آسمان کی جانب بلند کرکے ایک دردناک چیخ بلند کی۔ اس کی آواز ساری فضا میں گونجتی سنائی دی۔ پھر وہ غبار تیزی کے ساتھ تاریکی میں تحلیل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

شامی اور جوزف نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ نڈھال سے ہوکر اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دونوں ہی اس پراسرار غبار کے بارے میں سوچ رہے تھے......

☆......☆......☆

معمر ٹاؤن کلرک نے چشمہ درست کرتے ہوئے شامی اور جوزف کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے شامی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جناب اس مکان کی تفصیل بتانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق تقریباً تیس سال قبل اس کے اندر ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا، بعد میں اسکول بند کردیا گیا اور مکان طویل مدت تک غیر مستعمل پڑا رہا۔ پھر کچھ سال پہلے اسے فروخت کردیا گیا۔''

''اسے فروخت کیوں کیا گیا تھا؟'' شامی نے پوچھا۔

''بیکار پڑا تھا۔ فروخت کردیا۔''

''کیا مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں ہے۔'' ٹاؤن کلرک نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ہم دارالحکومت سے ایک معاملے کی تحقیقات کے لئے یہاں آئے ہیں۔'' جوزف نے کہا۔

دارالحکومت کا نام سن کر ٹاؤن کلرک کچھ سنبھل گیا۔ بلکہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ دارالحکومت اور تحقیقات دو ایسے الفاظ ہیں جو کسی بھی ملازم کو نروس کردینے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

''آپ حضرات تشریف رکھیں۔'' اس نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو اس مکان کی فائل دکھاتا ہوں۔ اس میں آپ کو ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک سال خوردہ اور گرد آلود فائل جھاڑتا ہوا لے آیا۔ شامی اور جوزف اطمینان سے بیٹھ کر فائل دیکھنے لگے۔

مکان کی تعمیر تقریباً ساٹھ سال قبل ہوئی تھی۔ نقشے کے اندر تہہ خانہ بھی دکھایا گیا تھا۔ جسے بعد میں بند کردینے کا ذکر تھا۔

''اس نقشے کے مطابق مکان میں تہہ خانہ بھی بنایا گیا تھا۔'' شامی نے ٹاؤن کلرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آگے چل کر لکھا ہے کہ اس تہہ خانے کو بعض تعمیری خامیوں کے باعث بند کردیا گیا تھا۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ تہہ خانہ بند کرنے سے کیا مراد ہے؟ تہہ خانہ کو مٹی سے پر کردیا تھا یا صرف داخلی راستہ بند کردیا تھا؟''

''یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ خاصی چھان بین کرنی پڑے گی۔''

''کیا آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں بتاسکتے ہیں جو اس زمانے میں اس عمارت یا اسکول سے وابستہ رہا ہو؟''

''ایک صاحب ہیں۔'' ٹاؤن کلرک نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔''شاید وہ کچھ مدد کرسکیں۔ ان کا نام سلیمان ہے اور وہ کسی زمانہ میں اس اسکول میں استاد تھے۔''

''ان کا پتہ کیا ہے؟''

''اتفاق سے وہ قریب ہی رہتے ہیں۔'' ٹاؤن کلرک نے کہا۔''یہاں سے داہنے ہاتھ کی تیسری گلی میں چوتھا مکان ان کا ہے۔ گلی کے کونے پر پرچون کی دکان ہے۔ وہاں سے معلوم کرلیجئے۔''

سلیمان کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ جسم درمیانہ اور صحت خاصی کمزور تھی۔ شامی اور جوزف کو دیکھ کر اس نے رسمی آداب کا تکلیف کئے بغیر بولا۔

''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

''آپ کسی زمانے میں ٹاؤن کمیٹی کے پرائمری اسکول میں پڑھاتے رہے ہیں۔'' شامی نے براہ راست مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔''آپ کو یاد ہوگا کہ پرائمری اسکول اس زمانے میں زریں منزل میں ہوا کرتا تھا۔ میں اس عمارت کے بارے میں کچھ باتیں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

سلیمان کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہوگیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔''آپ کہاں سے آئے ہیں اور کس ضمن میں یہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''ہم دارالحکومت سے آئے ہیں۔'' جوزف نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔''ہم ایک پرائیویٹ......''

سلیمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''نہیں۔'' جوزف نے کہا۔

''محترم آپ نے یہ سوال کیوں کیا۔''

''میرا خیال ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' سلیمان نے جواب دیا۔''آپ کے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟''

''میں نے عرض کیا نا کہ ہم زریں منزل کے بارے میں کچھ باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔'' شامی نے دوبارہ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''اس عمارت میں کچھ عرصہ پہلے پرائمری اسکول تھا اور آپ وہاں مدرس رہ چکے ہیں۔''

سلیمان کے چہرے پر الجھن اور گھبراہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

''شاید آپ یہ عمارت خریدنا چاہتے ہیں۔'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔''جناب میں معذرت چاہتا ہوں، اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

''آپ کا اندازہ درست نہیں ہے۔'' شامی نے زور دیتے ہوئے کہا۔''ہمیں عمارت خریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دراصل ہم عمارت کے اندر رونما ہونے والے بعض عجیب وغریب واقعات کی تحقیقات کے لئے آئے ہیں اور یہ تحقیقات عمارت کے موجودہ مالک کی درخواست پر کررہے ہیں۔ ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتے، چند ایک سوالات ہیں۔'' شامی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔''مثلاً یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا زریں منزل کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی تھا۔''

''اگر تھا تو......''

''میں کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی مدد نہیں کرسکتا۔'' سلیمان نے غصے سے کہا۔''آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔''

''کمال ہے صاحب آپ تو......''

''آپ فوراً میرا مکان خالی کردیں۔'' اس نے چیخ کر کہا۔''میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

"مطلب وطلب کچھ نہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ۔" فرطِ جوش سے سلیمان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اچھی بات ہے۔" شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو ہمارا آنا اتنا ہی برا لگا ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔ ناراض نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر دونوں دروازے کی طرف جانے لگے۔ سلیمان ایسے شخص کی طرح سر جھٹک رہا تھا جو کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔

"ٹھہریئے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ دونوں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "بیٹھ جائیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے امید ہے آپ مجھے معاف کردیں گے۔"

چند لمحوں تک وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دفعتاً کسی قریب المرگ شخص کی مانند ہوگیا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ نہ معلوم کون سا دن میری زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ اس لئے میں اب یہ بوجھ یہ اذیت اور ضمیر کی ملامت مزید برداشت نہیں کرسکتا۔"

کسی اچانک خیال کے تحت اس کا جسم بری طرح لرز گیا۔ شامی اور جوزف خاموشی سے بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے۔" اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ آپ نے کہا، میں زریں منزل میں واقع پرائمری اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے شاگردوں میں ایک لڑکا انتہائی شریر اور ضدی تھا اس کا نام سیفی تھا۔ گو وہ ذہین اور ہوشیار تھا پر اس کی ساری ذہانت نت نئی شرارتوں میں صرف ہوتی تھی۔ اس کے دماغ میں نجانے کیا چیز داخل ہوگئی تھی، وہ کبھی شرارتوں سے نہیں تھکتا تھا۔ چھوٹے سے اسکول میں اس کی وجہ سے ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ بچے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اسے ہر وقت شرارتوں پر اکساتے رہتے تھے۔"

"معاف کیجئے۔" شامی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس لڑکے کا عمارت سے کوئی تعلق ہے؟"

"آپ سنتے جائیں۔ ابھی معلوم ہوجائے گا۔"

سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سیفی کو شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے نرمی اور محبت کے تمام طریقے آزما ڈالے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ میری قوت برداشت کے لئے ایک آزمائش بن گیا تو تنگ آکر میں نے اسے جسمانی سزا دینی شروع کردی۔ بچوں کے سامنے شرمندہ کیا۔ بعض اوقات چھڑی سے اسے بری طرح پیٹا کہ اس کے بدن پر نشان پڑ جاتے۔ اس کے والدین غریب آدمی تھے۔ انہوں نے بھی ہر طرح کے طریقے آزما ڈالے۔ لیکن سیفی پر ان تمام سزاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سزا سے وہ اور بھی ڈھیٹ اور خود سر ہوگیا۔ پھر میں نے چشم پوشی اور درگزر کے ذریعے اس کی اصلاح کی، پر یہ بھی بے اثر ثابت ہوئی۔"

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"سردیوں کی ایک صبح اس کا رویہ قطعی ناقابل برداشت ہوگیا۔ اس روز وہ دن بھر شرارتیں کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے سارا دن کلاس میں ہنگامہ، شور، قہقہے اور طوفان برپا رہا۔ کوئی بچہ پڑھنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس روز موسم بہت خراب تھا اور طوفان کی آمد کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں حتی الامکان اس کی شرارتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

چھٹی ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی اور سیفی کی وجہ سے ایک منٹ کے لئے بھی پڑھائی نہیں ہوسکی تھی تب میں نے ایک مضبوط چھڑی کے ساتھ اسے بری طرح پیٹا۔ یہ دیکھ کر کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ تمام لڑکے خوفزدہ نظر آنے لگے۔ تاہم سیفی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اتنی مار کھانے کے بعد نہ تو اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکلی۔ وہ خاموشی سے پٹتا رہا اور عجیب نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ مار کھانے

کے بعد گو وہ خاموش ہوگیا مگر پڑھنے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انتہائی نفرت اور حقارت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کا یوں نفرت سے گھورنا میرے لئے اور بھی تکلیف کا باعث تھا۔ میں اندر ہی اندر ذہنی کرب اور کھنچاؤ سا محسوس کرنے لگا۔ یہ بات اس کی شرارتوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی، چھٹی کے بعد میں نے اسے روک لیا۔

اس وقت برف باری شروع ہوچکی تھی اور ہوا کا زور بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ نامعلوم اس وقت میرے اندر کون سی شیطانی روح سماگئی تھی کہ مجھے کچھ ہوش نہ آیا کہ میں کیا کررہا ہوں۔

اب یہ بات نہایت احمقانہ نظر آتی ہے۔

لیکن اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ میرے اور سیفی کے مابین قوت ارادی کا مقابلہ ٹھن گیا ہے اور مجھے بہرصورت یہ مقابلہ جیتنا ہے۔ بصورت دیگر میری معلمانہ حیثیت ختم ہوجائے گی اور بچوں پر سے رعب جاتا رہے گا۔

دوسری طرف سیفی یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک اور شدید قسم کی مار پڑنے والی ہے، وہ پوری طرح مار کھانے کے لئے تیار کھڑا تھا اور انتہائی سرد اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف یا گھبراہٹ کے بجائے نفرت ظاہر ہورہی تھی۔ لیکن میں اسے ایک اور اذیت ناک سزا دینے کا ارادہ کرچکا تھا۔

اسکول کے عملے میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ عمارت کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی ہے۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی فرشی دروازہ تھا جو میری میز کے نیچے بچھے ہوئے قالین کے نیچے پوشیدہ تھا۔ اس فرشی دروازے پر اتفاقاً میری نظر پڑگئی تھی۔

ایک روز چھٹی کے بعد صفائی کے خیال سے میں نے قالین ہٹایا تو وہاں پر تقریباً ڈیڑھ مربع فٹ سائز کا ایک فرشی دروازہ نظر آیا۔ بوجہ تجسس اسے کھول کر دیکھا تو اندر کی جانب ایک انتہائی سالخوردہ چوبی زینہ نظر آیا، نیچے تاریکی اور سردی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ابتدا میں عمارت کے نیچے تہہ خانہ تعمیر کیا گیا تھا جس کے داخلی دروازے کو بعض وجوہات کی بنا پر اینٹیں چن کر بند کردیا گیا تھا اور غالباً اس فرشی دروازے پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے بھی اس دروازے کے بارے میں کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا...... کاش مجھ پر اس دروازے کا انکشاف نہ ہوتا۔ بعد میں اس دروازے کو بھی سیمنٹ سے بند کردیا گیا تھا۔

اس روز میں نے تہہ خانہ کو استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جب اسکول خالی ہوگیا اور تمام بچے اسکول کی حدود سے نکل گئے تو میں نے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور سیفی کو تہہ خانہ دکھاتے ہوئے کہا کہ ”یا تو، تو اپنی شرارتوں سے توبہ کرلے یا پھر تہہ خانے کے اندر داخل ہوجا۔“ چند لمحوں تک وہ سرد نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا...... ”دیکھو توبہ کرلو۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تمہارا ہی بھلا ہے لیکن اگر تم توبہ نہیں کرنا چاہتے تو تہہ خانے میں اتر جاؤ اور یاد رکھو جب تک تم پچھلی حرکتوں کی معافی نہیں مانگو گے اور آئندہ کے لئے شرارتوں سے باز رہنے کا وعدہ نہیں کرو گے میں تمہیں باہر نہیں نکالوں گا۔“

وہ احتجاج کئے بغیر خاموشی سے تہہ خانے میں اتر گیا۔

میں نے شدید غصے کے ساتھ ڈھکنا بند کرکے اوپر قالین پھیلا دیا اور کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چند منٹوں کے بعد وہ اپنی شکست تسلیم کرلے گا اور چیخ چیخ کر معافی مانگتے ہوئے باہر نکلنے کی درخواست کرے گا۔

تہہ خانہ تاریک اور کولڈ اسٹوریج کی مانند سرد تھا۔ جہاں چند منٹ گزارنے انتہائی مشکل تھے......

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے نصف گھنٹہ گزر گیا پر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ گویا میری قوت ارادی شکست

کھاتی جارہی تھی۔

پھر ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن سیفی نے باہر نکلنے کے لئے کوئی درخواست نہیں کی۔

اس اثنا میں برف باری اور جھکڑ خاصی شدت اختیار کرگیا تھا، تیز ہوائیں کسی ماتمی ساز کی مانند چیختی ہوئی گزر رہی تھیں ....

اس وقت شاید میں براہ راست شیطان کے تصرف میں تھا۔ میں نے سیفی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔"

شامی اور جوزف کے چہرے پر خوف اور بے یقینی کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر اس نے کہا۔

"بظاہر یہ ایک ظالمانہ فیصلہ نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ جب سردی ناقابل برداشت ہوجائے گی تو سیفی فرشی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے گا اور کمرہ خالی پاکر سیدھا اپنے گھر بھاگ جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے بوڑھے سلیمان کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"خدا میرے گناہ معاف کرے، جو سانحہ اس بچے پر گزرا، میں نے ہرگز دیا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں گھر جاتے ہوئے راستے میں اس قدر غصے کی حالت میں تھا کہ برف باری اور طوفان کی شدت پر مطلق غور نہ کرسکا۔ مجھے رہ رہ کر سیفی کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آرہا تھا۔ اس رات کئی سال کے بعد شدید برف باری ہوئی تھی جس کی وجہ سے کچھ دیر کے بعد تمام راستے مسدود ہوگئے۔

اگلی صبح مجھے اپنی حرکت پر سخت ندامت ہوئی۔ تمام شرارتوں اور حماقتوں کے باوجود سیفی، بہرحال ایک کمزور بچہ تھا۔ اور بزرگانہ شفقت کا مستحق تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ تہہ خانے سے نکل کر ضرور گھر پہنچ گیا ہوگا۔

اگلے روز اسکول کی چھٹی تھی۔

دوپہر کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیفی اپنے گھر نہیں پہنچا۔ ان کا ایک پڑوسی مجھ سے سیفی کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا، گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ طوفان کی وجہ سے راستہ بھٹک گیا ہوگا۔

دوسرے بچوں کے ذریعے یہ بات عام ہوچکی تھی کہ میں نے سیفی کو چھٹی کے بعد روک لیا تھا، صورت حال بہت نازک تھی، پس میں نے جھوٹ بولنے میں ہی عافیت سمجھی اور کہا کہ "چند منٹوں کے بعد میں نے سیفی کو رخصت کردیا تھا، بلکہ وہ کچھ دور تک میرے ساتھ ہی گیا تھا۔"

میرا یہ جھوٹ گاؤں والوں نے آسانی کے ساتھ تسلیم کرلیا، اکثر لوگوں کا خیال تھا، سیفی نے دانستہ جنگل کا راستہ اختیار کیا ہوگا اور یا تو برف باری کے طوفان میں ہلاک ہوگیا ہوگا یا کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

تاہم چند لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرے بیان پر شک تھا۔ پر ان کی تعداد بہت کم تھی۔

ذاتی طور پر میرا خیال یہ تھا کہ "دیر تک تہہ خانے میں انتظار کرنے کے بعد وہ باہر نکل کر گھر کے لئے روانہ ہوا ہوگا اور راستے میں برف کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا ہوگا۔" یہ خیال آتے ہی مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ فرشی دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا۔ اور اگر کسی نے تہہ خانہ کا کھلا ہوا دروازہ دیکھ لیا تو میرے لئے مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے میں چپکے سے اسکول پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی، فرشی دروازہ حسب معمول قالین سے ڈھکا ہوا تھا، میری کرسی بھی اسی حالت میں پڑی تھی۔

یہ دیکھ کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی میں نے جلدی سے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور تہہ خانے میں جھانکنے لگا۔ دروازے کی راہ سے داخل ہونے والی روشنی میں، میں نے اندر ایک ہولناک منظر دیکھا۔ سالخوردہ چوبی زینہ ٹوٹا ہوا تہہ خانے کے فرش پر پڑا تھا۔

قریب ہی سیفی اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔

اس امید پر کہ شاید اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو، میں نے جلدی سے اپنی پگڑی کا ایک سرا ڈیسک کے ساتھ باندھا اور اس کے سہارے تہہ

خانے میں اتر گیا۔ اندر یخ کر دینے والی سردی تھی۔
سیفی سردی سے ٹھٹھر کر مر چکا تھا۔
آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ اندر کی ناقابل برداشت سردی کی وجہ سے اس نے تھوڑی ہی دیر بعد باہر نکلنے اور معافی مانگنے کا ارادہ کرلیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا ہوگا۔ چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ساخوردہ چوبی زینہ ٹوٹ گیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی فرش پر گر گیا اور اس کی ایک ٹانگ زخمی ہوگئی۔ اس کے باوجود وہ باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی تھیں اور ناخن مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔
زینہ ٹوٹنے کے بعد اس نے زور زور سے مجھے آوازیں دی ہوں گی لیکن شاید برف باری اور پرشور ہواؤں کے باعث میں اس کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ پھر وہ انتہائی مایوسانہ انداز میں دیواروں کو کھرچتا ہوا باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہا تھا۔ اس کا اندازہ دیواروں پر پائے جانے والے ناخنوں کے نشانات اور اس کی زخمی انگلیوں سے ہوتا تھا۔ بالآخر نہایت اذیت کے ساتھ سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہوگا۔
کمرے سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر ناقابل بیان اذیت اور غصے کے تاثرات نظر آتے تھے۔
اوہ آج بھی اس وحشت ناک منظر کو یاد کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں نے تہہ خانے کے ایک کونے میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس کی لاش کو وہاں دفن کردیا۔ پھر باہر نکل کر قالین کو فرشی دروازے پر پھیلادیا اور خاموشی سے گھر واپس آگیا۔ پھر بعد میں تہہ خانے کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔
کچھ عرصے بعد سیفی کی گمشدگی ایک بھولی بسری داستان ہوگئی۔ چونکہ وہ غریب والدین کا بیٹا تھا اس لئے کسی نے اس معاملے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بعد میں جب میں کرسی پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتا تو بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ نیچے سے سیفی کی آواز آرہی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ پر لعنت کررہا ہے۔ نفرت اور حقارت کا اظہار کررہا ہے اور انتقام انتقام پکار رہا ہے، بسا اوقات وہ آواز اتنی نمایاں سنائی دیتی کہ میں کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کی طرف دیکھنے لگتا اور خیال کرتا کہ شاید وہ بھی یہ آواز سن رہے ہیں۔
دھیرے دھیرے وہ آواز کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند میرے دل ودماغ پر مسلط ہونی شروع ہوگئی۔ مجھے یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ سیفی کی روح بدستور تہہ خانے کے اندر موجود ہے اور انتقام کا منصوبہ بنارہی ہے۔ میرا خوف اس حد تک بڑھا کہ میں تنہا اسکول میں جاتے ہوئے گھبرانے لگا۔
اگلے موسم سرما میں، میں نے زبردست خوف، دہشت اور ذہنی کھنچاؤ محسوس کرنا شروع کردیا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔ برف باری اور طوفان کے وقت میری حالت پاگلوں کی سی ہوجاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ سیفی میرے سامنے کھڑا ہے اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ ایسے مواقع پر میری قوت برداشت جواب دے جاتی اور جی چاہتا کہ تمام واقعہ بے کم وکاست بچوں کو سناؤں تاکہ کچھ تو ذہنی بوجھ ہلکا ہو۔ پھر کسی نادیدہ خوف کے تحت ایسا کرنے سے باز رہتا۔
پچیس سال سے میری زندگی اس دائمی عذاب میں مبتلا ہے۔ شاید تادم حیات یہ سزا موقوف نہیں ہوگی۔ میں فی الوقت اس سزا کا مستحق ہوں، اس اذیت کے مقابلے میں اب موت بھی بے حقیقت چیز معلوم ہوتی ہے۔"
قدرے توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ "اب مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ بستی کے لوگ حقیقت کے انکشاف پر کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں لیکن اعتراف

جرم کے بعد میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے اور میری آخری خواہش یہ ہے کہ سیفی کی لاش کو۔ یا جو بھی ہڈیاں اس کی بچی ہوئی ہوں انہیں پورے احترام کے ساتھ دفن کردوں شاید اس سے اس کی بھٹکی ہوئی روح کو کچھ قرار آجائے۔''

زریں منزل کے قرب و جوار میں تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہورہی تھی۔ شامی اور جوزف بوڑھے سلیمان کے ہمراہ اس کمرے میں کھڑے تھے جس کے نیچے مبینہ طور پر تہہ خانہ واقع تھا.... ایک طرف ریاض اور اس کی خوبرو بیوی ثروت کے علاوہ بستی کے دو معزز اور ذمہ دار افراد بھی وہاں موجود تھے۔

سلیمان نے ایک مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''کسی زمانے میں اس جگہ فرشی دروازہ تھا۔''

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دھندلا غبار اٹھتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

باہمی مشورے کے بعد وہاں سے فرش توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر ایک مزدور کا انتظام کیا گیا جس نے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تہہ خانے میں داخل ہونے کا راستہ بنادیا۔ پھر ایک سیڑھی نیچے اتاری گئی۔

سلیمان کا اصرار تھا کہ سب سے پہلے وہ تہہ خانے میں داخل ہوگا۔

بہرحال کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور ویسے بھی دہشت کی وجہ سے کوئی بھی اندر داخل ہونے پر تیار نہیں تھا۔ پس وہ سیڑھی کے ذریعے نیچے اترنا شروع ہوگیا۔ خوف کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ ابھی اس نے تیسرے یا چوتھے ڈنڈے پر ہی قدم رکھا تھا کہ سیڑھی پھسل گئی اور سلیمان کو لئے ہوئے ایک دھماکے سے فرش پر گرگئی۔

عین اس وقت ایک مافوق الفہم واقعہ پیش آیا جس نے جملہ حاضرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

سیڑھی گرنے کے ساتھ ہی سلیمان نے ایک دردناک چیخ بلند کی جس کے فوراً بعد اندر سے بھیانک قہقہہ کی آواز سنائی دی، چند لمحوں تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہوکر رہ گیا۔ پھر سب سے پہلے شامی کا جسم حرکت میں آیا۔

''جوزف.....'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''جلدی سے کسی رسی کا انتظام کرو۔'' جوزف رسی ڈھونڈنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف بھاگا اور شامی جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اندر سے زرد رنگ کا دھندلا سا غبار باہر نکل رہا تھا۔ نصف منٹ کے بعد وہ غبار کمرے کی فضا میں تحلیل ہوگیا۔ تہہ خانے میں مکمل سناٹا تھا۔

شامی نے سوراخ کے قریب منہ کرکے بلند آواز سے ''سلیمان۔ سلیمان'' پکارا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اس اثنا میں ریاض ایک بڑی سی ٹارچ لے کر آگیا اور نیچے روشنی ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہاں ایک ناقابل یقین منظر سب کا منتظر تھا۔

سلیمان اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے اوپر ایک انسانی ڈھانچہ جس کی لمبائی بمشکل چار فٹ ہوگی پھیلا پڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے دونوں ہاتھ سلیمان کی گردن میں پیوست تھے اور سلیمان مرچکا تھا۔

''شامی صاحب، یہ قہقہے کی آواز کیسی تھی؟'' ریاض نے پوچھا۔

شامی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی بھیانک قہقہے کی آواز خواب گاہ سے آتی سنائی دی۔ تمام لوگ چونک کر اس طرف دیکھنے لگے، ایک ثانیے کے بعد وہ آواز صحن سے سنائی دی۔ پھر وہ آواز فضا میں قہقہے بکھیرتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔

شامی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ریاض صاحب اب آپ کو بے خوابی اور بے چینی کی شکایت نہیں ہوگی۔ بے چین کرنے والی روح اپنی اصل منزل کی طرف چلی گئی ہے۔''



زندہ لاشیں

ایس امتیاز احمد-کراچی

رات کا اندھیرا جب پورے گائوں پر مسلط ہوجاتا تو زندہ لاشیں گلی کوچوں میں دندناتے نظر آتیں اور یہی نہیں انہیں جب کوئی قسمت کا مارا نظر آتا تو اسے وہ اٹھا کر لے جاتیں اور پھر......

جسم وجاں کو تھرا دینے والی اور ذہن پر خوف کا غلبہ طاری کرتی خونی وخوفناک کہانی

اس پراسرار دنیا میں بعض لوگوں کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن کی تفصیل سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

میں لوگوں کی انگشت نمائی کے خیال سے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن بقول چراغ "جب میرے سفید بال اس پراسرار واقعہ کی یادگار ہیں تو پھر کیوں نہ ان کو قارئین کے سامنے دہرا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔"

میرا نام مشتاق احمد اور گاؤں مالوف مظفر گڑھ ہے۔ میرے والد حکیم تھے۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ میری بہن کا نام ذکیہ تھا۔ وہ مجھ سے چھ سال بڑی تھی مگر بے حد شریر۔ اسے جانور پالنے کا بے حد شوق تھا چنانچہ اس نے کئی خرگوش اور گلہری کے بچے پال رکھے تھے، ہم دونوں بہن بھائی کی آپس میں بہت محبت تھی۔ جب میں ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنی شرارتوں میں مجھے بھی شامل کرلیا۔ وقت گزرتا گیا اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بڑے ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ میں نو سال کا ہوگیا اور ذکیہ پندرہ کی۔ ہمارا مکان بازار میں تھا جس کی نچلی منزلوں میں ابا کا مطب تھا۔ اور اوپر بالا خانہ پر ہماری رہائش تھی۔ بالا خانے کی کھڑکیوں کے قریب باہر کی طرف ابا کے مطب کا سائن بورڈ لگا تھا۔

ایک دفعہ کسی شامت کی ماری چمگادڑ نے اس سائن بورڈ کے پیچھے بچے دیئے اور اتفاق سے ذکیہ کی نظر ان پر جا پڑی۔ بس پھر کیا تھا وہ اس کا بچہ چھیننے پر آمادہ ہوگئی۔ اس نے اس کام میں مجھے بھی شریک کرنا چاہا مگر میں نے آج سے پیشتر یہ جانور کبھی نہ دیکھا تھا اس لئے ڈر کر انکار کردیا۔

میرے انکار پر وہ بہت خفا ہوئی اور مجھ سے روٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تاہم اس کی چنچل طبیعت میں سکون کہاں تھا تھوڑی دیر بعد ابا کی چھڑی ہاتھ میں لئے پھر آ موجود ہوئی۔ میں اس خیال سے کہ شاید مجھے پیٹنے آئی ہے بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔

گرمیوں کا موسم اور دوپہر کا آتشیں وقت تھا۔ آفتاب کرہ قہر بنا ہوا تھا۔ در و دیوار تپش سے تپ رہے تھے۔ ذکیہ کا چہرہ کچھ گرمی اور غصہ سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بڑبڑاتی اور مجھے بھی ملامت آمیز نگاہوں سے گھورتی ہوئی کھڑکی میں ایک ٹانگ باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اور جھک جھک کر اس مضبوط چھڑی سے چمگادڑ اور اس کے بچوں کو کچوکے دینے لگی۔ میں وہیں کھڑا تھا لیکن جانوروں کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی حتیٰ کہ چمگادڑ تنگ


KHURRAM

آ کر بچوں کو وہیں چھوڑ کر پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی اڑ گئی بچے بے چارے بغیر ماں کے ایک دم سسکنے لگے۔ ذکیہ فوراً انہیں دست پناہ میں لے آئی اور ایک بچے کو اٹھا کر ایک چھوٹے سے پنجرے میں ڈال دیا۔

دن بھر تو چمگادڑ غائب رہی مگر شام ہوتے ہی اپنے گھونسلے میں واپس آ گئی اور بچے کو وہاں نہ پایا تو کھڑکی کے ذریعے کمرے میں گھس کر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ طاقچے میں پنجرا پڑا تھا وہ بار بار پنجرے پر جھپٹتی اور ناکام واپس ہو جاتی۔ ذکیہ نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح باہر نکل جائے لیکن وہ نہ ٹلی۔ ایک بار جب وہ پنجرے پر جھپٹی تو ذکیہ نے اس پر اس زور سے چھڑی کا وار کیا کہ چمگادڑ بے دم ہو کر گر پڑی اور ذکیہ نے چھڑی کی مزید ضربوں سے اسے ہلاک کر دیا۔

خدا کی قدرت اسی رات ذکیہ تپ محرکہ میں مبتلا ہو گئی اور گیارہویں دن گوشہ قبر میں جا سوئی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔

اس واقعہ کو اٹھارہ سال گزر گئے۔ میرے والدین سفر آخرت کر چکے تھے۔ اب میں خود حکیم تھا مجھے اپنے کام میں خاص دلچسپی تھی اور میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کا بڑا شائق تھا ہمارا پرانا ملازم چراغ اس کام میں میرا معاون تھا۔ چراغ مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ ابا نے اسے یتیم خانے سے لے کر پرورش کیا تھا اور اسے اپنی اولاد کی طرف چاہتے تھے یہ شخص بڑا وفادار تھا اور مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا اس وقت میری عمر ستائیس سال کے لگ بھگ تھی اور چراغ کی تقریباً پینتیس سال تھی۔

میں اور چراغ اکثر بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور بنوں میں مارے مارے پھرا کرتے۔ میں نے کئی نئی بوٹیاں دریافت کیں جن کی عجیب و غریب خاصیت نے میری حکمت کو چار چاند لگا دیئے۔

اسی غرض سے ایک دفعہ میں نے جموں کا سفر کیا اور تین چار ماہ تک اس علاقہ میں نئی بوٹیاں دریافت کرتا ہوا بنوٹ تک جا پہنچا، چراغ اس سفر میں بھی میرے ہمراہ تھا اور میرے آرام کا بہت خیال رکھتا تھا میرے پاس تین گھوڑے تھے جن میں سے ایک پر میں خود سوار ہوتا اور باقی دونوں پر اسمان باربرداری لادا جاتا۔ چراغ ایک پہاڑی ملازم لچھو کے ہمراہ ہمیشہ پیدل چلا کرتا۔

لچھو قصبہ روہنی کا باشندہ تھا جو رام بن سے دو سو میل جانب غرب ان دشوار پر خطر پہاڑوں کے پیچھے تھا جن کی برفانی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دوران سفر میں ایک دن جب کہ جڑی بوٹیوں کا ذکر ہو رہا تھا لچھو نے مجھے بتایا۔ ”روہنی کے قریب جنگلوں میں ایک پودا ملتا ہے جس کی جڑ کی خوشبو سے شیر مست ہو جاتا ہے پہاڑی لوگ شیر سے بچاؤ کی خاطر اکثر اس جڑ کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔“

اور اس نے یہ بھی بتایا ”کہ موضع روہنی سے بیس میل پرے ایک قصبہ باتھری آباد ہے یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس گاؤں کے گردونواح میں روشنی دینے والے درخت پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کو پہاڑی زون کا درخت کہتے ہیں۔ اس کی روشنی سفید اور شفاف ہوتی ہے۔ لوگ اس کی ٹہنیاں کاٹ کر گھروں میں بطور چراغ کے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس علاقہ کے غاروں میں ایک خاص قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس کو بھگویا جائے تو اس سے دھواں نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور گردوپیش کئی کئی گز تک دھندسی چھا جاتی ہے لیکن باہر کوئی باتھری ادھر جانا پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس گاؤں کے قریب ہی بھوتوں کا ایک قصبہ آباد ہے۔ گو ان لوگوں نے بھوتوں کی روک تھام کے لئے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے پھر بھی ان کو بھوت تنگ کرتے رہتے ہیں۔“

لچھو کی زبان سے اس انوکھے گاؤں اور اس کے عجیب و غریب پودوں کا حال سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں تمام دن اسی گاؤں کے متعلق سوچتا رہا۔ اس رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں اور چراغ ایک خوب صورت پہاڑی پر کھڑے تھے جس کے مقابل کی ایک دلفریب پہاڑی پر ایک گاؤں آباد تھا اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کھڈ میں ایک شورانگیز ندی کف اڑاتی شور مچاتی گزر رہی تھی۔

اس کھڈ کے اوپر دو پل بنے ہوئے تھے۔ ایک پل گاؤں کی طرف جاتا تھا اور دوسرا ایک عالی شان مکان کے دروازے پر جا کر ختم ہو جاتا تھا جو دوسری طرف عین کھڈ کے اوپر بنا تھا۔ اس مکان کا آدھا حصہ جو دمدمہ نما تھا جو دو پتھریلی چٹانوں کی چوٹیوں پر ایستادہ کیا گیا تھا۔ یہ چٹانیں جو اس دمدمے کے نیچے ستونوں کا کام دیتی تھیں جہاں پانی گہرا مست ہاتھی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا جا رہا تھا۔ اس پل پر دمدمے کے قریب میری بہن ذکیہ نہایت مغموم کھڑی تھی اس کی گود میں ایک بچہ تھا، مجھے دیکھ کر وہ نہایت عاجزی سے کہنے لگی۔

”مشتاق مجھے بچاؤ۔“

میں نے غم آلود لہجہ میں کہا۔

”ذکیہ یہ کون سی جگہ ہے اور تم یہاں کیسے آ گئیں؟“

اس نے کہا۔

”میں ذکیہ نہیں میرا نام شمشاد ہے۔ اس گاؤں کو باتھری کہتے ہیں اور میں یہاں کی مظلوم رانی ہوں۔“

میں اس کی مدد کو بڑھا۔ یک دم سخت آندھی چلی۔ وہ پل ٹوٹ گیا اور ذکیہ کھڈ میں گر گئی لیکن میں نے اس کے بچے کو پکڑ لیا۔

اس دہشت ناک خواب کی گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی، میں بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ حتیٰ کہ مرغان سحر اذانوں پر اذانیں دینے لگے۔ صبح صادق کی دوشیزہ ہوائیں خیمے کے دروازے پر معصومانہ انداز سے کھیلنے لگیں اور اجالے کی دیوی کی آمد پر تاریکی کے بھوت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔

میں نے چراغ کو بلا کر اپنا خواب سنایا اور اسے فوراً باتھری کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہو گئے۔

ہمارا راستہ تنگ اور پیچ در پیچ تھا۔ جو ایک پرخطر کھڈ کے کنارے ہوتا ہوا پہاڑ کی ناہموار اور ناقابل عبور چڑھائی پر جا پہنچا تھا اور بعض گھاٹیاں اتنی دشوار تھیں کہ گھوڑے اپنے پاؤں زمین پر گاڑ گاڑ کر چلتے تھے۔ ان پہاڑیوں میں آمد و رفت بہت محدود تھی، دوران سفر میں صرف دو دفعہ ہمیں پہاڑیوں کے دو قافلے ملے جو من مہیش کی طرف تیرتھ یاتیرا کرنے جا رہے تھے۔

آخر تیرہ دنوں کی شب و روز صعوبتوں کے بعد یہ راستہ طے کر کے روہنی کے دلکش گاؤں جا پہنچے اس مسلسل اور کٹھن سفر کی تکان سے ہمارے بدن چور ہو رہے تھے اس لئے کچھ دن ہم روہنی میں ٹھہرے پھر ایک ہفتہ کے قیام کے بعد ہم لوگ باتھری کی طرف روانہ ہوئے۔ لچھو ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا، مگر زیادہ تقاضہ کرنے پر وہ ہماری یہ درخواست رد نہ کر سکا۔

یہ راستہ پہلے سے بھی زیادہ ناقابل گذر اور شکستہ تھا۔ بڑی دقتوں سے اسے طے کر کے دوسرے دن کہیں دوپہر کے وقت ہم لوگ ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ سامنے ایک خوب صورت ٹیلہ تھا۔ اس دیدہ زیب میدان کو دیودار کے شاندار درخت گود میں لئے کھڑے تھے آفتاب عالم تاب کی تابانیوں سے میدان کا ذرہ ذرہ کوہ نور کا ہمسر تھا دھوپ اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے متوالے جھونکے اس میدان کے حسن و خاشاک کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس پرکیف منظر سے متاثر ہو کر ہم نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور کھانا جو پہلی منزل سے پکا کر ساتھ لائے تھے کھا کر آرام کرنے لگے۔

سہ پہر کو میں اور چراغ سیر کرتے ہوئے ٹیلے پر جا پہنچے۔ دور سے ہمیں ایک عورت دکھائی دی جو پیڑ کے سائے میں بیٹھی تھی۔ یہ ایک لمبے قد کی گرانڈیل اور مضبوط مگر بوڑھی عورت تھی۔ اس کے بال بہت دراز اور بالکل سفید تھے۔ جن کو کھولے ہوئے وہ کنگھی کر رہی تھی چراغ جھجک کر کہنے لگا۔

”بچپن کی کہانیوں میں بڑی بوڑھیوں سے سنا کرتے تھے کہ ویران جنگلوں اور پہاڑوں میں چڑیلیں رہا کرتی ہیں جن کے بال پاؤں کی ایڑیوں تک لمبے ہوتے ہیں۔“

میں اس کی ضعیف الاعتقادی پر ہنستا ہوا آگے بڑھ

گیا پاؤں کی آہٹ پاکر اس نے اپنے سفید بال چہرے سے ہٹائے اور میری طرف دیکھا۔ پھر پہاڑی زبان میں کہنے لگی۔

"تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے آنا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "میں حکیم ہوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں لیکن کیا تم اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو؟" اس عورت نے گہرا سانس لیا اور کہنے لگی۔

"نہیں میں موضع باتھری کی رہنے والی ہوں جو یہاں سے تین کوس آگے ہے۔ میرا نام فرزانہ ہے۔ میں بے اولاد ہوں اس لئے گاؤں کی کئی بے رحم عورتیں مجھے منحوس خیال کرتی ہیں اور میرے شوہر کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ میرا شوہر نبی خان بہت سخت گیر آدمی ہے ذرا سی بات پر مجھے بری طرح زدوکوب کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کی سختیوں سے تنگ آکر میں اس جنگل میں آجاتی ہوں۔ اور کچھ دن بعد اس کا غصہ سرد پڑ جاتا ہے تو واپس چلی جاتی ہوں۔"

اس نے مجھے اپنے بازو اور شانے دکھائے جن پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے یہ اس کے شوہر کے وحشی پن کا ثبوت تھا مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد پاکر کہنے لگی۔

"پہلے تو میں اس ظلم وستم سے بہت گھبراتی تھی مگر جب سے مجھے ایک بزرگ نے بشارت دی کہ "تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا تب سے مطمئن ہوں۔ گو یا میں جانتی ہوں میری عمر بچہ پیدا کرنے کی نہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ بزرگ کی پیشن گوئی ضرور پوری ہوگی۔"

فرزانہ بہت نیک دل اور باادب عورت تھی۔ میں نے اس سے باتھری کے حالات اور بھوتوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے مجھے بتایا۔

"بیشک یہ قصبہ بھوتوں کے ظلم وستم کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اس کی وجہ موجودہ سردار کا انتہائی ظلم ہے جو اس نے گاؤں کے اصلی وارث اور اس کے حامیوں پر کیا ہے۔"

پھر کہنے لگی۔ "آج سے نصف صدی پیشتر موضع باتھری ان کالے کالے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں آباد تھا اس گاؤں کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

اس وقت موجودہ سردار کا چچا نعمان خان گاؤں کا حاکم تھا۔ اس سردار کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ جب وہ شکار کو جارہا تھا اس کا گھوڑا ایک دشوار گھاٹی سے بھڑکا اور پھر سوار سمیت کھڈ مین گر کر ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد نعمان خان کا چھوٹا بھائی (یعنی موجودہ سردار کا باپ) رمضان خان کو یہاں کا عارضی حاکم بنایا گیا کیوں کہ متوفی سردار کا لڑکا ہمدان خان صرف ایک سال کا بچہ تھا۔ پھر تیرہ سال بعد جب رمضان خان کا انتقال ہوا تو اس کا لڑکا سلطان خان سے پانچ سال بڑا تھا ہمدان خان کو زہر دے کر ہلاک کردیا اور خود حاکم بن بیٹھا اس پر ہمدان خان کے حامیوں نے شور مچایا۔ سلطان خان نے ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بس اس دن سے موضع باتھری پر تباہی آگئی یعنی تمام بے گناہ مقتولوں کی روحیں بھوت بن کر گاؤں والوں کو ستانے لگیں اور انہیں بھوتوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر وہ ایک درے کے راستے اپنی رعایا کے ساتھ بھاگ آیا اور پہاڑ کے اس طرف ایک جگہ موجود نیا باتھری آباد کیا۔ پھر اس پہاڑی درے کو ایک پتھریلی دیوار بنا کر جو کئی گز اونچی تھی بند کردیا اب یہ بھوت گاؤں میں تو نہیں آتے لیکن جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کی لاش کو قبر سے نکال کر کھا جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "فرزانہ! باتھری کے لوگ مسافروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟"

"بھوتوں کے ڈر سے اس طرف کوئی مسافر آتا نہیں البتہ کبھی کبھی کشمیری سوداگر آکر حسین لڑکیاں سردار کے پاس فروخت کرجاتے ہیں۔ ان کے لئے سردار نے ایک مہمان خانہ بنوا رکھا ہے تم حکیم ہو اگر عمدہ عمدہ دوائیں سردار کو تحفہ دو گے تو تمہاری بہت قدر کرے گا۔"

شام کے قریب ہم لوگ فرزانہ کی معیت میں باتھری کی طرف روانہ ہو کر ایسی جگہ پہنچے جہاں خواب کا سارا

نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ہم لوگ اس وقت ایک ایسی پہاڑی پر کھڑے تھے جس کے مقابل دوسری پہاڑی پر گاؤں آباد تھا۔ وہی ندی، وہی کھڈ، وہی دو پہل ،وہی دمدمہ نما مکان جس کا آدھا حصہ کھڈ کے درمیان سنگی چٹانوں پر قائم تھا۔ میں حیران سا ہو کر خواب والی حسین لڑکی کو تصور میں اس پل کی طرف دیکھنے لگا جو اس عمارت کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا مگر وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔

فرزانہ میری بدحواسی پر بہت متعجب ہوئی۔ میں دیر تک پاگلوں کی طرح کھڑا ادھر ادھر کے مناظر دیکھتا رہا۔

شام کافی تاریک ہوجانے پر ہم باتھری میں داخل ہوئے۔ کچھوا اور گھوڑوں کو فرزانہ نے اپنے مویشی خانہ میں جگہ دی۔ میں اور چراغ رات کو مسجد میں سوئے۔

صبح کے وقت مسجد کے مولوی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے اپنا پیشہ اور یہاں آنے کی وجہ بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا اور جمعہ کے دن مجھے سردار سے ملانے کا وعدہ کیا۔ اس مولوی کا نام عبدالصمد تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔ اس کا رتبہ سردار سے دوسرے درجے پر سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور بہت تواضع سے پیش آیا۔

تین دن تک ہم مولوی عبدالصمد کے مہمان رہے۔ چوتھے دن جمعہ کی نماز کے بعد اس نے سردار سے میرا تعارف کرایا۔ سردار جس کی عمر دراصل پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان تھی، چالیس سال کا ایک مضبوط اور طاقتور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید اور نقش ونگار بھدے تھے۔ چہرے بشرے سے رعونت ٹپکتی تھی۔ میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ میرے باتھری آنے کے متعلق دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ میں نے دواؤں کا ایک بکس اس کو بطور نذر پیش کیا۔ اس تحفہ سے وہ اتنا خوش ہوا کہ مجھے شاہی مہمان قرار دے کر شاہی مہمان خانے میں رہنے کا حکم دیا۔

شاہی مہمان خانہ وہی دمدمہ نما عمارت تھی جو کھڈ کے اوپر بنی ہوئی تھی۔ خوب صورت پل اسی مہمان خانے کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بڑے دروازے کے اندر ایک کھلا صحن تھا جس کے دونوں پہلوؤں پر لمبے لمبے برآمدے تھے اور ان کے پیچھے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔

یہ کوٹھریاں تعداد میں کل چوبیس تھیں۔ یعنی بارہ ایک پہلو پر اور بارہ دوسرے پہلو پر اور دونوں پہلوؤں پر چھ چھ کوٹھریوں کے درمیان ایک ایک بڑا کمرہ تھا۔ یہ دونوں کمرے مقفل تھے۔ مہمان خانے کے اختتام پر پھر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت وسیع احاطہ جس کے چاروں طرف بڑی بڑی کوٹھریاں تھیں یہ شاہی اصطبل تھا اس احاطہ میں زون کے درخت لگے ہوئے تھے جو فی الحقیقت رات کو روشنی دیتے تھے۔ اس مہمان خانے کی ایک کوٹھری میں ہم رہنے لگے۔

میں اکثر مولوی عبدالصمد سے ملنے جایا کرتا تھا ایک دن دوران گفتگو عبدالصمد سے میں نے بھوتوں کی روایت کے متعلق دریافت کیا وہ کہنے لگا۔

''بھوتوں کے متعلق سب روایات سچی ہیں۔ انہیں بھوتوں کی وجہ سے سردار اصلی گاؤں چھوڑ کر یہاں آباد ہے لیکن یہاں بھی قبرستان میں رات کے وقت بھوت پھرتے رہتے ہیں چنانچہ اس نے خود ایک دفعہ ایک بھوت کو دیکھا تھا۔ یہ ہمدان خان کے حامیوں سے ایک کا بھوت تھا۔''

اس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار پر ان مقتولوں کی ایسی لعنت پڑی ہے کہ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ اس کی عورتیں چونکہ دوسرے گاؤں کی ہوتی ہیں جن کو بردہ فروش سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں اس لئے وہ کچھ عرصے کے بعد محل سرا سے بھاگ جاتی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''کیا سردار اس بدعت کی روک تھام کے لئے کوئی انتظام نہیں کرسکتا؟''

وہ کہنے لگا۔ ''وہ بھی ہرجائی ہے۔ اس کے بردہ فروش نئی نئی لڑکیاں لاتے رہتے ہیں۔''

یہ باتیں سن کر میں بہت حیران ہوا کیوں کہ اس گاؤں کی ہر ایک بات انوکھی تھی۔

شام کو پژمردہ وقت تھا۔ افسردہ ہوائیں موسم خزاں کی آمد کو پتہ دے رہی تھی۔ پت جھڑ سے درخت بے رونق

ہو رہے تھے۔ پہاڑوں کی اودی اودی چوٹیاں سر پر غرور کو بصد شان و شوکت اٹھائے تماشائے لیل و نہار میں مصروف تھیں۔ سرمئی آسمان پر دور دراز تک سفید بگلوں کی قطاریں، گھونسلوں میں پرندوں کی سوکھی ہوئی پھڑ پھڑاہٹ، جنگلی گدھوں کی منحوس آواز ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ خونخوار ندی کا پانی سیاہ ناگن کی طرح اپنی زبان خاراشگاف سے پتھروں کو چھید تا تیزی سے رواں تھا۔ ارد گرد کی فضا نہایت اداس تھی۔

میں عبدالصمد سے ملاقات کر کے واپس گھر کو آتے ہوئے موسم کے انقلاب سے بہت متاثر ہوا اور بددلی سے قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے کی طرف واپس جا رہا تھا ارادہ تھا کہ سردار سے رخصت حاصل کر کے واپس چلا جاؤں کیوں کہ جاڑا بہت قریب آ گیا تھا۔

جونہی میں نے پل پر قدم رکھا۔ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو پل کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ میں جلدی جلدی پل عبور کر کے اس کے قریب پہنچا تو میرا دل دھڑ کنے لگا کیوں کہ یہ لڑکی ذکیہ کی ہم شکل تھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یکا یک بڑے دروازے سے دو آدمی نکلے۔ ایک آدمی جو بہ نسبت اپنے ساتھی کے اچھی پوشش میں تھا، کہنے لگا۔

"شمشاد تم یہاں کھڑی ہو اور ہم تمہیں مہمان خانے میں تلاش کر رہے ہیں۔ چلو سردی ہو رہی ہے۔ یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں۔"

شمشاد کے نام پر میں چونکا اور اپنے خواب کو الہام تصور کرتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی اور میں دیر تک دریائے حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا۔ جب اندر گیا تو مہمان خانے میں خوب چہل پہل تھی۔ چراغ نے مجھے بتایا کہ کشمیری سوداگر سردار کے پاس لڑکیاں فروخت کرنے آیا ہوا ہے۔ میں تمام رات سوچتا رہا کہ کس طریقے سے اس لڑکی کی مدد کی جائے۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

دوسرے دن فرزانہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لڑکیوں میں سے جو سوداگر لایا تھا صرف تین لڑکیاں سردار نے اپنے لئے منتخب کی ہیں۔ جن میں ایک شمشاد بھی ہے۔ باقی ماندہ لڑکیاں گاؤں کے لوگوں نے خرید لی ہیں۔ تیسرے دن صبح کو سوداگر چلا گیا اور تمام کوٹھریاں خالی ہو گئیں۔

گو میں بہت اداس تھا مگر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا کیوں کہ اسی الہامی خواب کے زیر اثر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ایک نہ ایک دن شمشاد کو میری مدد کی ضرورت ہو گی۔

کچھ دن بعد سخت سردی پڑنے لگ گئی۔ برف باری بھی شروع ہو گئی ہر طرف برف کے انبار دکھائی دینے لگے۔ ندی کا پانی یخ بستہ ہو کر رہ گیا۔ میں اور چراغ جو اتنی سردی کے عادی نہ تھے رات دن اندر پڑے رہتے۔

خدا خدا کر کے موسم بہار کا آغاز ہوا۔ ہوا میں طراوت اور خوش گواری پیدا ہونے لگی۔ بلند پہاڑ جو آج سے چند دن پہلے بگلا بنے ہوئے تھے سفید نقاب اتار کر سیاہ دیوؤں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ ندی نالوں کی گنگناہٹ اور پرندوں کے شیریں گیت کائنات میں نئی زندگی کا پتہ دینے لگے۔

ایک دن جب صبح کو چراغ نے دروازہ کھولا۔ فرزانہ سہمی ہوئی اندر آئی۔ وہ کانپ رہی تھی میں نے اس کے خوف و ہراس کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگی۔

"آج میں نے ایک گہری سازش کا پتہ چلایا ہے جو آپ لوگوں کے خلاف ہو رہی ہے۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "میرے خلاف سازش"

وہ کہنے لگی۔ "ہاں سنئے! آج رات کو جب کہ میں اپنی کوٹھری میں بے خبر سو رہی تھی۔ آہٹ پا کر بیدار ہوئی میں نے دیکھا کہ میرا شوہر باہر جا رہا ہے چونکہ ہمارے گاؤں میں کوئی آدمی رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلتا اس لئے یہ بات غیر معمولی تھی۔ میں نہ رہ سکی اور دل کڑا کر کے دبے پاؤں اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

وہ سیدھا سردار کے محل کی طرف گیا اور پچھواڑے کی طرف چھوٹے سے دروازے پر اس نے ایک خاص قسم کی دستک دی دروازہ فوراً کھل گیا اور وہ اندر چلا گیا اندر زون کی روشنی ہو رہی تھی میں نے سوراخوں سے دیکھنا

شروع کیا۔ دروازہ کھولنے والا شخص سردار سلطان خان تھا۔ وہ نہایت مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ سردار کہہ رہا تھا ۔دونوں کا خاتمہ ہونا چاہئے نبی خان مصر تھا کہ ایک ہی دن دونوں کو ہی ٹھکانہ لگانا لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کردے گا۔ ان دونوں میں کم از کم مہینے کا وقفہ ضرور ہونا چاہئے۔ اس پر سردار نے کہا۔

''اچھا دو تین دن کے اندر ایک کو تو ٹھکانے لگا دو۔''

نبی خان کہنے لگا۔'' یہ بھی اتنی جلدی نہیں ہوسکتا کیوں کہ ندی میں ابھی پانی بہت تھوڑا ہے تقریباً دس پندرہ دن تک روز پکڑے گا۔''

سردار مضطرب ہوکر کہنے لگا۔

''دن تو بہت ہیں لیکن خیر مجبوری ہے۔''

نبی خان نے کہا اور سلام کرکے رخصت ہوا میں اس سے پہلے آ کر جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگی۔

فرزانہ کی باتوں سے صداقت کی بو آتی تھی لیکن بار بار مجھے یہ خیال آتا کہ ہمیں ٹھکانے لگانے سے سردار کا کیا فائدہ ہے۔ اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ گزرا تھا جمعہ کی نماز کے بعد سردار نے مجھے حکم دیا کہ ''مہمان خانے کی مرمت ہونے والی ہے اس لئے اپنی کوٹھری خالی کرکے پل کی دوسری طرف اس خوب صورت جھونپڑے میں چلے جاؤ جو کہ تمہارے لئے بنوایا گیا ہے۔'' اس حکم سے ہمارے شبہات اور بھی مضبوط ہوگئے مگر ہمیں مجبوراً مہمان خانہ خالی کرکے اس جھونپڑے میں جانا پڑا۔

اب ہم لوگ فرزانہ کی رائے کے مطابق دن بھر تو اسی جگہ رہتے لیکن رات کو ایک محفوظ جگہ چلے جاتے۔ یہ ایک جھونپڑی تھی جو گاؤں سے دور ویران جنگل میں خوف ناک درے کے قریب واقع تھی یہ جھونپڑی اسی بزرگ کی تھی جس نے فرزانہ کو بشارت دی تھی کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا۔

بزرگ کی موت کو کئی سال گزر چکے تھے تاہم جھونپڑی اچھی حالت میں تھی فرزانہ کا معمول تھا کہ وہ ہر روز صبح کے وقت جاکر جھونپڑی کو صاف کرتی۔ اور جہاں بزرگ بیٹھا کرتے تھے اس جگہ کو پھولوں سے سجاتی۔ پھر دروازہ مقفل کرکے واپس آجاتی۔

اسی طرح ہمیں چھ دن گزر گئے۔ ایک دن میں نے صبح کے وقت یہ خبر سنی کہ ان لڑکیوں میں سے جو بردہ فروش لائے تھے ایک لڑکی تاج نامی سردار کے محل سے بھاگ گئی ہے سردار نے اس کی تلاش میں مختلف راستوں پر سوار دوڑائے پھر بھی اس لڑکی کا کہیں پتہ نہ چلا آخر دوسرے دن باتھری سے دو کوس دور ندی کے بہاؤ پر پانی میں سے کسی شخص کو ایک حاملہ عورت کی لاش ملی جس کی کھال پتھروں کی رگڑ سے ادھڑ چکی تھی شناخت ہونے پر معلوم ہوا کہ لاش تاج ہی کی ہے۔

اس لڑکی کی دردناک موت پر دفعتاً میرے دماغ میں روشنی پیدا ہوئی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ سازش جو سردار اور نبی خان کررہے تھے ناحق ہم نے اپنے سے منسوب کی۔ وہ اس مظلوم عورتوں کے خلاف تھی کیونکہ نبی خان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ انہیں کسی ندی میں پھینک کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے فرزانہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

وہ کہنے لگی۔'' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سردار کی تمام عمر میں یہی دو عورتیں تو حاملہ ہوئی تھیں۔ یعنی ایک تاج اور دوسری شمشاد۔ سردار کی تمام امیدیں انہی سے وابستہ تھیں۔ ایسی صورت میں وہ تاج کو کیسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔'' فرزانہ کے منہ سے شمشاد کے حاملہ ہونے کا سن کر میں چونک اٹھا اور چلا کر کہا۔

''ضرور اب دوسری موت شمشاد کی ہوگی۔''

فرزانہ کہنے لگی۔''وجہ؟''

میں نے کہا۔''وجہ یہی ہے کہ وہ حاملہ ہے۔ وہ ظالم ہمیشہ اپنی مظلوم عورتوں کو ہلاک کرکے مشہور کردیتا ہے کہ وہ بھاگ گئیں حالانکہ ان راستوں سے ایک عورت کا اکیلے فرار ہونا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟''

فرزانہ نے کہا۔'' آگے جو عورتیں غائب ہوتی رہیں وہ حاملہ نہ تھیں۔''

''میں نے کہا۔''تمہیں کیا معلوم؟ وہ ان کو ابتدائی ایام ہی میں ہلاک کروادیتا ہوگا۔ اب چونکہ حالات موسم سرما

میں رونما ہوئے ہیں جس وقت کہ ندی کا پانی منجمد تھا اس لئے کام کو جلدی انجام نہ دے سکا اور حمل ظاہر ہو گیا۔

میرے سمجھانے سے فرزانہ بھی قائل ہو گئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور شمشاد کو بچانے کی تدبیر کرے گی۔ وہ آج کل اپنے شوہر سے روٹھ کر آئی ہوئی تھی اور ہمارے پاس ہی رہتی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ باہر نکل گئی اور تمام دن غائب رہی۔ رات کو جب ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے واپس آئی اس کے چہرے پر فاتحانہ تبسم تھا۔

میں نے کہا۔ ”کہو فرزانہ سارا دن کہاں رہی؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا اپنے لمبے کرتے کی آستین سے کسی پودے کے بیج نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔

میں نے کہا۔ ”یہ کیا چیز ہے؟“

وہ کہنے لگی۔ ”یہ ایک قسم کا زہر ہے۔ جس کے کھانے سے آدمی تین دن تک مردہ رہتا ہے۔ یہ میں شمشاد کے لئے لائی ہوں۔ اس کے ذریعے اس کو مردہ بنایا جائے گا اور بعد میں اس کو بھوتوں کے آنے سے پیشتر آپ قبر سے نکال کر راتوں رات فرار ہو سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تجویز تو بہت اچھی ہے مگر اس پر یا اس کے جسم پر کہیں کوئی مضر اثر نہ پڑے۔“

فرزانہ کہنے لگی۔ ”یہ بالکل بے ضرر چیز ہے۔ اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا تو میں اس کی ذمہ دار ہوں۔“

دوسرے دن ان بیجوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا اور ایک پڑیا میں باندھ کر فرزانہ نے اپنے پاس رکھ لیا اور کہنے لگی۔

”محل سرا میں میری ایک رشتہ لڑکی ملازم ہے۔ آج میں اس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی۔“ وہ محل سرا کی طرف چلی گئی۔ شام کے بعد جب واپس آئی تو کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

”دوا میں نے شمشاد کو پلوا دی ہے اور یہ کام تو ہمارے حسب منشا ہو جائے گا مگر اس کام میں عجلت کر کے بڑی غلطی کی کیونکہ ہمیں اس سے قبل اس کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لینی چاہئے تھی۔ جہاں اس کو بھوتوں کے آنے سے پیشتر قبر سے نکال کر لے جاتے۔“

میں نے کہا۔ ”اب بھی کافی وقت ہے۔ ابھی جا کر انتظام کر لیں گے۔“

فرزانہ کہنے لگی۔ ”کیا اس وقت قبرستان جانے کا ارادہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں اس وقت کیا ڈر رہی ہو؟“

فرزانہ کہنے لگی۔ ”وہاں پہنچنے میں ہمیں بہت دیر ہو جائے گی اور بھوتوں سے بچ کر ہم واپس نہیں آسکیں گے۔ آج گاؤں میں ایک عورت مرگئی تھی۔ اس کی لاش پر بے شمار بھوت جمع ہو رہے ہوں گے۔“

میں چونکہ بھوت پلید کا معتقد نہ تھا اور ان لوگوں کی روایات کی کوئی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”میں دیکھوں گا ان بھوتوں کی کیا اصلیت ہے۔ درحقیقت یہ کوئی بندر کی قسم کا جانور ہو گا جو میری بندوق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔“

میں نے بندوق کندھے پر رکھی اور زون کی لکڑی جیب میں ڈال کر اکیلا ہی چل پڑا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر چراغ بھی چپ چاپ میرے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم گاؤں والے پل پر پہنچے تو فرزانہ بھی ہانپتی کانپتی ہم سے آملی۔ ہم لوگ خاموشی سے گاؤں کے باہر مولوی عبدالصمد کے مکان کی طرف جا کر ایک گھاٹی پر سے گزرتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے۔

چاند کی چھٹی تاریخ تھی۔ وہاں درخت اس کثرت سے اگے تھے کہ ان کے سائے سے قبرستان بے حد تاریک ہو رہا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ چاند کبھی کبھی بادلوں سے نمودار ہوتا اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے اس کی دھیمی روشنی قبروں پر پڑ کر نہایت بھیانک سماں پیش کرتی۔

قبرستان کے ایک کونے میں جہاں درخت قدرے کم گھنے تھے ایک احاطہ بنا ہوا تھا جس میں ایک پہلو پر دو کوٹھریاں تھیں۔ فرزانہ نے مجھے بتایا کہ وہ شاہی قبرستان ہے ہم لوگ اس احاطے میں داخل ہوئے کوٹھریاں کھول

کر دیکھیں۔ ایک کوٹھری میں قبر کھودنے کے اوزار اور لکڑی کے خالی تابوت رکھے تھے۔ دوسری کوٹھری میں ایک ایسی چارپائی رکھی تھی۔ جس پر میت رکھی جاتی ہے۔

یہ چارپائی والی کوٹھری ہمارے کام کے لئے بہت موزوں تھی۔ اسے فرزانہ نے صاف کیا اور فیصلہ ہوا کہ کل شمشاد کو رات بھر یہیں رکھا جائے گا۔ صبح کے قریب بزرگ کی جھونپڑی میں لے جائیں گے۔ اس تجویز کو مکمل کر کے ہم لوگ احاطے سے نکلے۔ جب ہم اس نئی قبر کے قریب پہنچے، جس میں ایک نئی میت آج ہی دفن کی گئی تھی، تو فرزانہ میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے کہا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

وہ سرگوشی سے کہنے لگی۔ "دیکھو اس نئی قبر کے پاس کیا چیز ہے۔"

یک لخت بادل پھٹ گیا اور چاند کی پھیکی بے رونق روشنی شاخوں سے چھن کر جب قبر پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ چار پانچ عجیب ساخت کے آدمی قبر کو پنجوں سے کھود رہے ہیں۔ شاید ان لوگوں نے میری آواز سن لی یا چاند کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ میں بندوق سنبھالی۔ اور دوسرے ہاتھ میں زون کی لکڑی پکڑ کر اسے دیکھا۔ میرے سامنے پانچ گز کے فاصلے پر ایک لاش جس کی آنکھیں بے نور اور ڈراؤنی تھیں جس کے بال کھڑے تھے جس کے دانت ہڈیوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا اپنے استخوانی پنجے پھیلائے ہماری طرف آ رہا تھا۔

میں فطرتاً دلیر واقع ہوا ہوں مگر یہ ہولناک منظر دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ زون کی لکڑی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ عین اس وقت فرزانہ کا ہاتھ اونچا ہوا۔ اس نے کوئی چیز اس لاش کی طرف زور سے پھینکی۔ فوراً ہی ہمارے اور اس کے درمیان سیاہ دھند چھا گئی۔

فرزانہ ہم دونوں کو گھسیٹتے ہوئے احاطے کی طرف لے گئی مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم لوگ اس کے اشارے پر اندھا دھند دوڑتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے اور چارپائی والی کوٹھری میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چراغ نیم بے ہوش سا ہو رہا تھا۔ میری حالت بھی بری تھی مگر فرزانہ کی طبیعت بالکل ہشاش بشاش تھی۔

تمام رات ہم نے دم سادھ کر اس کوٹھری میں گزاری اور صبح کی روشنی نمودار ہونے پر لرزتے ہوئے وہاں سے نکلے اور سہمے ہوئے اس نئی قبر کو دیکھنے کے لئے بڑھے۔ قبر درمیان سے شق تھی ارد گرد گیلی مٹی کے تودے کھڑے تھے اور لاش غائب تھی۔ اس خوف و ہراس سے پہلے ہی ہماری زبانیں گنگ ہو رہی تھیں اور اب قبر کی حالت دیکھ کر ہمارے رہے سہے حواس بھی گم ہو گئے۔

قبر اژدھے کی طرح منہ کھولے ہوئے تھی اور بھوتوں کے پاؤں کے نشان نمناک زمین پر صاف نظر آ رہے تھے۔ ہم لڑکھڑاتے ہوئے قبرستان کی یاس آمیز بھیانک فضا سے نکل کر گھاٹی پر چڑھے اور بہت بری حالت میں گھر لوٹ آئے۔ راستے میں ہم نے ایک آدمی سے سنا کہ "سردار کی رانی شمشاد آج رات فوت ہو گئی ہے۔"

جھونپڑی میں آتے ہی میں اور چراغ بیدم ہو کر گر پڑے فرزانہ بھی گو سہمی ہوئی تھی لیکن ہماری طرح دہشت زدہ نہ تھی۔ وہ قہوہ تیار کر کے لائی اور مجھے تسلی دینے لگی۔ میں نے فرزانہ سے پوچھا۔

"ہم لوگ رات اس بھوت سے کیسے بچے؟"

وہ کہنے لگی۔ "ہمارے گاؤں میں ایک قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس کے بھگونے سے دھند چھا جاتی ہے ہمارے گاؤں کے لوگ اس گھاس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ جب میں رات کو آپ کے ساتھ گئی تو گھاس میرے پاس موجود تھی پھر میں نے آپ کی دواؤں کے بکس سے ایک بوتل لی اور اس میں پانی بھر کر ساتھ رکھ لیا۔"

رات بھر میں خوف کی وجہ سے سو نہ سکا تھا۔ صبح کے قریب نیند آ گئی اور دوپہر ڈھلے آنکھ کھلی۔ اب میری طبیعت درست تھی چراغ بھی سو چکا تھا اور مطمئن معلوم

ہوتا تھا۔
فرزانہ نہ مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں اور گھی لاکر ہمارے آگے رکھا۔ ہم نے خوب سیر ہوکر کھایا اور رات کی مہم کے لئے تیار ہوگئے۔ فرزانہ نے پتہ لگالیا تھا کہ شمشاد کو دفنادیا گیا ہے۔
شام قریب تھی۔ آفتاب کا چراغ ہستی عنقریب گل ہونے والا تھا۔ درختوں کے سائے غیر معمولی لمبے ہوکر سورج کی زرد اور مرجھائی ہوئی کرنوں میں متحرک تھے۔ پہاڑ غول بیابانی کی طرح کھڑے تھے۔ رات کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے حوصلے بھی پست ہوتے جارہے تھے مگر کوئی پراسرار طاقت ہمیں قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔
جب ہم لوگ شاہی قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئے تو سورج کی آخری ٹمٹماتی ہوئی کرن بھی غائب ہوگئی اور افق پر تاریک بادل چھاگئے۔ فرزانہ کہنے لگی۔
"یہ بادل ہمارے لئے مفید ہیں ہمیں ابھی سے اپنا کام شروع کردینا چاہئے تاکہ شام تاریک ہونے سے پہلے ہی شمشاد کو نکال لیا جائے۔" ہم تینوں کدالیں لے کر قبر کھودنے میں مصروف ہوگئے۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے شمشاد کو تابوت میں سے نکال لیا۔
فرزانہ کہنے لگی۔ "خلاف امید یہ کام بہت جلد ہوگیا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ شمشاد کو اسی وقت بزرگ کی جھونپڑی میں پہنچادیا جائے۔ یہ کوٹھری زیادہ محفوظ نہیں مبادا بھوت نیا گل کھلائیں۔"
فرزانہ کا مشورہ معقول تھا چنانچہ میں نے شمشاد کو کندھے پر اٹھالیا اور گھاٹی عبور کرکے جنگل کی طرف بڑھے۔ ایک گھنٹہ میں ہم اس جھونپڑی تک پہنچ گئے۔ ابھی ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ بارش ہونے لگی۔ ہم نے دروازہ ایک آہنی کھٹکے سے اندر سے بند کرلیا اور شمشاد کو گھاس کے بستر پر لٹادیا گیا۔ میں اپنے کپڑے ساتھ لایا تھا۔ فرزانہ نے کفن اتار کر اسے میرے کپڑے پہنادیئے۔ ہم لوگ اپنی کامیابی پر مسرور تمام رات جاگتے رہے صبح کو فرزانہ کہنے لگی۔
"تم اپنی جائے اقامت پر واپس چلے جاؤ میں شمشاد کے پاس رہوں گی تم رات کو میرے لئے کھانا لے کر آجانا۔"
بادل کھل کر آسمان صاف ہوچکا تھا۔ ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے فرزانہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ آئی۔ ہم جھونپڑی سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر آئے ہوں گے کہ وہ فوراً رک گئی اور حیرت سے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔
اس جگہ مٹی بہت چکنی اور نرم تھی۔ اس پر بہت سے بے ڈھنگے پاؤں کے نشان تھے ہم خوف زدہ ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
فرزانہ کہنے لگی۔ "ضرور کفن کی بو پر بھوت ادھر آئے ہیں مگر بارش کی وجہ سے جھونپڑی کو نہ دیکھ سکے۔" میں نے مضطرب ہوکر کہا۔
"اب کیا کیا جائے۔"
وہ سوچ میں پڑگئی اور کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ "ان اونچے پہاڑوں میں مجھے ایک غار معلوم ہے۔ یہ غار بہت بڑا اور محفوظ ہے اس میں داخل ہوکر اگر اس کے چھوٹے سے دہانے پر پتھر چن دیئے جائیں تو باہر سے کوئی ان کو نہیں ہٹاسکتا۔ اس لئے آج شمشاد کو سرشام ہی وہاں پہنچادیا جائے تو بہتر ہوگا۔"
میں نے دریافت کیا۔ "وہ غار یہاں سے کتنی دور ہے۔"
وہ کہنے لگی۔ "یہاں سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر ہوگا۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی چل کر دیکھ سکتے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "ضرور۔"
وہ دوڑتی ہوئی گئی اور جھونپڑی کا دروازہ مقفل کرکے ہمارے آگے آگے چل دی۔ جنگل کے کناروں پر گھومتے ہوئے ہم لوگ پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ یہ زمین سنگلاخ اور راستہ ناہموار تھا مگر طوعاً وکرہاً اس غار تک جاہی پہنچے۔
واقعی یہ غار محفوظ اندر سے وسیع اور صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی سلیں تھیں جو غار کا منہ بند کرنے کے بہت موزوں تھیں غار اندر سے اس قدر لمبا تھا کہ اس کا دوسرا

سرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں اور چراغ زون کی لکڑی ہاتھ میں پکڑے غار کا معائنہ کرنے لگے۔

تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد راستہ اتنا نیچا ہوگیا کہ ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ ہمارے سامنے کسی زمین دوز آبشار کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہماری پنڈلیوں تک پانی آ پہنچا تھا۔ آگے پانی کے گہرا ہونے کا خطرہ تھا تاہم ہمیں اطمینان ہوگیا کہ اس طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہیں اور ہم واپس آ گئے۔ فرزانہ تو شمشاد کے پاس چلی گئی اور ہم دونوں اپنی جھونپڑی میں آ گئے۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے سردار کے پاس جھوٹی تعزیت کو گیا۔ دوپہر کے قریب وہاں سے واپس آیا اور کھانا کھا کر سوگیا۔ چار بجے کے قریب بیدار ہوا۔ ساتھ لے جانے کا ضروری سامان فراہم کر کے میں اور چراغ وقت کا انتظار کرنے لگے۔ خدا خدا کر کے دن ختم ہوا۔ سورج گوشہ مغرب میں روپوش ہونے والا تھا کہ ہم لوگ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔

شام کے پہلے ستارے نے جب آسمان کی کھڑکی سے جھانکا تو ہم جھونپڑی تک پہنچ چکے تھے۔

فرزانہ نے سامان خورد و نوش سنبھالا۔ میں اور چراغ باری باری شمشاد کو کندھے پر اٹھائے غار کی طرف روانہ ہوئے نہایت پھرتی سے راستہ طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچے۔

غار اب بہت تاریک ہو رہا تھا جس کو زون کی بہت سی ٹہنیوں سے روشن کرنا پڑا۔ پھر دہانے نے کو سلوں سے بند کر کے ہم نے با اطمینان خاطر کھانا کھایا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ تینوں رات کو باری باری جاگ کر شمشاد کی حفاظت کریں۔ پہلے تین گھنٹے چونکہ چراغ کی باری تھی۔ میں اور فرزانہ بے فکر سو گئے۔

ہمیں سوئے کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ یکلخت ایک جگر خراش چیخ سنائی دی۔ میں اور فرزانہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے دیکھا تو چراغ بے ہوش پڑا تھا۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ فرزانہ بھی الو کی طرح چیخنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لب خشک ہو رہے تھے اور لرزہ براندام غار کے اندرونی حصے کی طرف اشارہ کر کے بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر جلدی سے اس کی طرف دیکھا۔

آہ! ایسا جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ میرے پیش نظر تھا کہ خوف سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ انتہائی دہشت سے میرے ہاتھ اور پاؤں مفلوج ہو کر رہ گئے اور گلا خشک ہو کر بند ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ چار پانچ انسانی لاشیں جن کی شکلیں مسخ شدہ اور بے حد ڈراؤنی سی تھیں غار کے اندرونی حصے سے نکل کر ہماری طرف آ رہی ہیں۔

فرزانہ کی چیخیں اب بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں اس بدحواسی میں اٹھا۔ مرتعش ہاتھوں سے بندوق اٹھائی اور ایک لاش کی پیشانی کا نشانہ باندھ کر گولی چلا دی۔

گولی ٹھیک نشانہ پر بیٹھی اس لاش کا آدھا سر اڑ گیا مگر وہ بدستور بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ لاشیں بالکل قریب آ گئیں۔

بڑھی ہوئی مایوسی اور بے بسی سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سخت چیز میرے بدن سے مس ہوئی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اور چراغ ایک بڑے وسیع ہال میں پہلو بہ پہلو ایک چٹائی پر پڑے تھے۔ چراغ کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک غشی کی حالت میں تھا۔

کمرے میں زون کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک طرف بڑے سے گول دائرہ کی صورت میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی اس دائرے کے درمیان ایک پلنگ بچھا تھا جس پر ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی یہ لاش بالکل تازہ معلوم ہوتی تھی۔ لاش کے قریب ایک سفید ریش

بوڑھا آدمی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔ اس لاش کو دیکھ کر مجھے وہ غار والا منظر یاد آ گیا۔ میرے جسم میں جھرجھری سی ہوئی اور ایک کپکپاتی ہوئی چیخ نما آہ میرے منہ سے نکل گئی۔

میری آواز پر وہ بوڑھا پلٹا اور آگ کا دائرہ پھلانگ کر میرے قریب آ کھڑا ہوا میں نے سوچے سمجھے بغیر چیخ کر کہا۔

''اے شاہ جنات ہم پر رحم کرو۔''

بوڑھا نرمی سے کہنے لگا۔

''خوف نہ کرو۔ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ تم بالکل محفوظ جگہ پر ہو۔''

اس کے بعد اس آدمی نے دوسرے کمرے سے ایک پیالا دودھ کا مجھے لا کر دیا جس کے پینے سے میرے بدن میں کچھ توانائی آ گئی اور میں اٹھ کر ستون کے سہارے بیٹھ گیا۔ وہ بوڑھا میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔

''میاں مشتاق!''

میں اس کی زبانی اپنا نام سن کر سناٹے میں آ گیا مگر وہ کہنے لگا۔

''حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ فرزانہ کی زبانی تمہارا نام اور وہ سب قصہ جس کی وجہ سے تم مصیبتوں میں مبتلا ہوئے میں سن چکا ہوں۔''

پھر سرد آہ بھر کر کہنے لگا۔

''میں سردار سلطان کا بدقسمت چچا ہوں۔ میرا نام نعمان خان ہے اور یہ جگہ باتھری کا قدیم گاؤں ہے جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں یہ باتھری کا قلعہ ہے۔ آج سے پچاس سال پیشتر میں یہاں کا حاکم تھا۔ مجھے شکار کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ شکار کے موقع پر جب میں گھوڑے پر سوار تھا ایک کھڈ کے کنارے پر سے گزر رہا تھا تو ایک ملازم نے مجھے دھکا دے کر کھڈ میں پھینک دیا۔ کئی دن بعد جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو ایک سادھو کی کٹیا میں پایا۔ کچھ عرصہ تک میں اسی کٹیا میں صاحب فراش رہا۔ سادھو نے میری بہت خدمت کی اور اس کی کوششوں سے میری جان بچ گئی۔

جب میں بالکل تندرست ہو گیا تو اس سادھو کے ذریعہ معلوم ہوا کہ میری جگہ اب میرا چھوٹا بھائی رمضان خان میرے بیٹے ہمدان خان کے زمانہ نابالغی تک یہاں حاکم قرار پایا ہے اور میری بابت گاؤں میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ نعمان خان کی روح بھوت بن گئی ہے کیوں کہ میری لاش نہ ملنے سے میرے بھائی کو میری طرف سے اندیشہ تھا۔ مجھے بھائی کی شقاوت قلبی سے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی لیکن اس کا یہ سلوک دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں حکومت کا خیال ترک کر کے اس سادھو کے پاس رہنے لگا۔

''سادھو ایک زبردست عامل تھا اور اس کے علاوہ اسے علم طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کی ہم نشینی میں مجھے بھی اس کے علوم وفنون کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کی شاگردی میں رہ کر چند سال کے عرصہ تک میں بھی زبردست عامل بن گیا۔ میری ظاہری موت سے تیرہ سال بعد میرے بھائی رمضان خان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میرے بیٹے ہمدان خان کی عمر چودہ سال تھی اور رمضان خان بیس سال کا تھا۔ یہ لڑکا اپنے باپ سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوا۔ اس نے ہمدان خان کو زہر دے دیا اور اس کے حامیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خبر سے دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ میں چاہتا تو سلطان خان سے سخت انتقام لیتا مگر میں نے اسے نقصان پہنچانا پسند نہ کیا۔

ان دنوں میں اور سادھو لاشوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں ان پر عمل کیا کرتے تھے۔ اس لئے میں اپنے بیٹے کی لاش کو بھی قبر سے نکال لایا۔ چنانچہ یہ لاش جو سامنے پلنگ پر پڑی ہے اسی لڑکے ہمدان خان کی ہے اور یہ چالیس سال کی پرانی لاش اب تک تازہ معلوم ہوتی ہے۔

آخر کئی سال کی تگ ودو کے بعد صرف اتنی قدرت حاصل ہوئی کہ ہم لوگ مردہ لاشوں سے اپنی دماغی قوت کے ماتحت خدمت لینے لگے۔ یعنی جس کام کا ہم خیال کرتے لاشیں فوراً ہمارے عمل کے زور سے وہ کام انجام دینے لگتیں لیکن ہم چاہتے تھے کہ لاشوں میں اصلی روحیں

ڈال کر انہیں زندہ کیا جائے اس لئے ہم نے اپنا عمل باقاعدہ جاری رکھا۔ اور جب بھی کوئی گاؤں میں مرجاتا تو ہم اپنے تخیل کے ذریعے ان خدمت گار لاشوں کو حکم دیتے اور وہ مردے کو قبر سے نکال کر ہمارے پاس لے آتیں۔ ابتداء میں جن لاشوں کو ہم نے معمول بنایا۔ ان میں زیادہ تر ہمدان خان کے حامیوں کی لاشیں تھیں۔

جب ان لاشوں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کی رہائش اور اپنے عمل کے لئے ہمیں کسی وسیع عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے غور وخوض کے بعد ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ ان لاشوں کو ایک گھنٹہ کے لئے باتھری کے گلی کوچوں میں کھلم کھلا پھرنے کا حکم دیا جائے تاکہ لوگ ڈر کر گاؤں خالی کردیں۔ چنانچہ ان لاشوں کو ہم نے اپنی قوت متخیلہ کے ماتحت وہاں جانے کا حکم دیا تو وہ بلا دھڑک گاؤں میں داخل ہوگئیں۔

جب گاؤں کے لوگوں نے ان لاشوں کو دیکھا ان کے اوسان خطا ہوگئے کئی لوگ خوف سے مرگئے اور کئی اپنے مکانوں میں چھپ گئے۔ سلطان خان اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی رعایا سمیت گاؤں خالی کرکے بھاگ گیا اور ایک درے کو جو یہاں سے قریب ہے عبور کرکے دوسری طرف نیا باتھری آباد کیا اور درے کو ایک نہایت بلند سنگی دیوار بنا کر بند کردیا۔ اس طرح میں نے یہ قلعہ اور یہ گاؤں اس سے جیت لیا۔ جب یہ لوگ یہاں سے ہجرت کرگئے تو ہمیں اپنے عمل کے لئے نئی لاشوں کے حاصل کرنے میں بہت دقت ہونے لگی۔ لیکن بہت جلد ہم نے ایک ایسا راستہ تلاش کیا جو پایاب ندی کے زمیں دوز منبع کے قرب سے ہوتا ہوا ایک وسیع غار میں کھلتا تھا اور نئی باتھری کا قبرستان بھی اس جگہ سے صرف میل بھر کے فاصلے پر تھا اب ہمیں اپنے کام میں بہت سہولت ہوگئی ہم لوگ خفیہ راہ سے ان لاشوں کو قبرستان میں بھیج دیتے جو نئی قبر سے مردہ نکال کر لے آتیں۔

اب وہ سادھو مرچکا ہے۔ دنیا میں میری صرف یہی آرزو ہے کہ انسان کی فرار شدہ روحیں دوبارہ تن خاکی میں داخل کرنے میں کامیابی حاصل کروں تاکہ اپنی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک بار اپنے بیٹے کو زندہ دیکھ سکوں۔

گو مجھے اس لگاتار کوشش کے باوجود ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی مگر امید واثق ہے کہ ایک دن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ پرسوں یہ لاشیں ایک تابوت کھود کر لائی گئیں ہیں۔ تابوت میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی رکھے جاتے ہیں اس لئے تابوت کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا لیکن جب تابوت کا ڈھکنا اٹھایا تو تابوت کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ تابوت خالی تھا۔

میں سوچنے لگا لاش کہاں جاسکتی ہے۔ مجھے یہ معمہ حل کرنے کی جستجو ہوئی، اس لئے میں نے لاشوں کو حکم دیا کہ تابوت کی آرام گاہ میں سونے والا جہاں کہیں ہو لے آؤ اگر اس کام میں کوئی بھی مزاحمت کرے تو اس کو بھی پکڑ لاؤ۔ چنانچہ جب تم لوگ غار میں پناہ گزیں تھے تو یہ لاشیں شمشاد کی تلاش میں باتھری جانے کے لئے اس غار سے گزریں اور شمشاد کے علاوہ تم لوگوں کو بھی جو بے ہوش تھے اٹھا لائیں۔ لیکن شمشاد نے ان لاشوں کو نہیں دیکھا اور نہ ان لاشوں کا اس کو کچھ علم ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ تم لوگ اسے یہاں لائے ہو۔ میں نے اس کو ایسے آرام دہ کمرے میں رکھا ہے جہاں ان لاشوں کا گزر نہیں۔ وہ اس وقت ہوش میں ہے اور بہت کمزور ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھی کہ چا[illegible] کے کراہنے کی آواز سنائی دی ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ ہوش میں آچکا تھا مگر بے چینی سے سر کو ادھر ادھر پٹخ رہا تھا مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے پھوٹ کر باہر آنے لگیں میں حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

یکایک اس نے میرے سر کی طرف اشارہ کیا۔ نعمان خان کہنے لگا۔

"وہ تمہارے بالوں سے جو رات کو غار والا خوف ناک سین دیکھنے سے بالکل سفید ہوچکے ہیں ڈر رہا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی کہ ہم لوگ محفوظ ہیں اور بتایا کہ خود اس کے بال بھی میری طرح سفید ہیں جس کی وجہ

رات والا انتہائی صدمہ ہے۔ اس کے بعد نعمان خان سے اس کا تعارف کرایا اور نعمان خان والا قصہ بیان کرکے اسے بھوتوں کی اصلیت سے آگاہ کیا۔

نعمان خان نے ہمیں اپنے قلعے کے ایک گوشہ میں نہایت ہی آرام دہ کمرہ رہنے کو دیا۔ اس کمرے کے دروازے ہم نے اندر سے بند کرلئے اور اطمینان سے سوگئے۔ سہ پہر کو دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو نعمان خان کھڑا تھا۔ وہ ہمیں شمشاد کے پاس لے گیا فرزانہ نے اس کو ہماری خدمت گزاری سے آگاہ کررکھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔

دوسرے دن نعمان خان نے مجھے کہا۔

"تم لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ سلطان خان اپنی حاملہ بیویوں کو نبی خان کے ہاتھوں ہلاک کروادیتا تھا۔ میں بہت حیران ہوں۔ نبی خان کو میری خدمت گار لاشیں گرفتار کرکے لئے آئی ہیں اور میں اس کا بیان لینے والا ہوں اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

"کیا وہ لاشیں بھی وہیں ہوں گی۔"

نعمان کہنے لگا۔ "ہاں وہ تو ہروقت وہیں رہتی ہیں۔ اس دن صرف تمہاری خاطر ان کو ہٹایا گیا تھا۔"

ہم دونوں ان خوف ناک لاشوں کے تصور سے گھبرا گئے۔ نعمان خان ہمیں خوف زدہ دیکھ کر کہنے لگا۔

"اگر تم لاشوں سے خوف کھاتے ہو تو تمہیں ایسی جگہ بیٹھا سکتا ہوں جہاں سے تم سب کچھ دیکھ سکو اور ان کی باتیں سن سکو۔"

چنانچہ وہ ہمیں قلعہ کے اوپر ایک برج میں لے گیا جس میں نیچے اترنے کے لئے تنگ زینہ تھا اس زینہ کے ذریعے ہم ایک گیلری میں اتر گئے۔ یہ چھت کے ساتھ ملی ہوئی جالی اور گیلری اس بڑے ستون کے اردگرد بنائی گئی تھی۔ جو ہال کمرے کے درمیان ایستادہ تھا۔

نعمان خان چلا گیا اور ہم دونوں ایک لکڑی کی ایک نشست پر بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ہال نما کمرہ اس وقت ہمارے قدموں کے نیچے تھا۔

نبی خان اس ستون کے قریب ایک چٹائی پر بے ہوش پڑا تھا اور لاشوں کی جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ پشت لگائے کھڑی تھی آگ کا دائرہ برابر جل رہا تھا اتنے میں نعمان خان ہال میں داخل ہوا۔ نبی خان کو ابھی تک بے ہوش پاکر اس نے کوئی دوا اس کے منہ میں ٹپکائی جس کے اثر سے فوراً وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور لاشوں کی جماعت دیکھ کر چیخیں مارنے لگا۔ نعمان خان نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"اس چیخ وپکار کا کوئی فائدہ نہیں اگر جان کی امان چاہتے ہو تو جو میں دریافت کروں سچ سچ بتادو۔"

نبی خان ہکلا کر کہنے لگا۔ "آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

نعمان خان نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ سلطان خان اپنی عورتوں کو جو حاملہ ہوتی ہیں تمہارے ہاتھ ہلاک کروادیتا ہے کیا یہ سچ ہے؟"

نبی خان نے کانپ کر کہا۔ "ہاں بالکل صحیح ہے۔"

نعمان خان بولا۔ "وہ ایسا ظالمانہ فعل کیوں انجام دیتا ہے؟"

نبی خان نے جواب دیا۔ "اس کو کسی نجومی نے کہا تھا کہ تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کی پیدائش کے بعد تم جلدی مرجاؤ گے۔"

اس غرض سے سردار نے کھنڈ کے اوپر ایک مہمان خانہ بنوار کھا ہے جس میں آمنے سامنے دو ہال نما کمرے ہیں۔ ان دو کمروں کے درمیان ایک زمین دوز خفیہ کمرہ کھنڈ کی خوف ناک گہرائی پر بنایا گیا ہے اس خفیہ کمرے میں ایک عجیب وغریب کل لگی ہوئی ہے۔ ان کمروں سے ایک تو قتل گاہ ہے اور دوسرے میں اس کل والے کمرے میں جانے کا خفیہ راستہ ہے جو انگیٹھی میں ایک کمانی دبانے سے کھلتا ہے جو کمرہ قتل گاہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں ایک مسہری ہے یہ مسہری جو پتھر کی معلوم ہوتی ہے دراصل لکڑی کے دو تختے ملا کر بنائی گئی ہے اس پر شیر کی کھال اس صفائی سے منڈھی ہوئی ہے کہ بالکل دو حصوں کا نشان دکھائی نہیں دیتا۔ ان دو تختوں کے نیچے زنجیریں لٹک رہی ہیں کل

کا ہینڈل دبانے سے تختے جدا ہوجاتے ہیں اور اس پر سونے والا تحت الثریٰ میں گر کر ہلاک ہوجاتا ہے۔

سردار جب اپنی کسی عورت کی جان لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے آدھی رات کو پل کی سیر کے بہانے لے کر محل سرا کے پچھلے دروازے کے ذریعے مہمان خانے میں آتا ہے یہاں وہ اس لڑکی کو ایک خاص قسم کی شراب پلاتا ہے۔ جس سے وہ گہری نیند سو جاتی ہے اس کے بعد سردار اس کو مسہری پر لٹا کر الو کی طرح آواز نکالتا ہے۔

میں جو پہلے ہی اس کی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہوتا ہوں جھٹ مشین کا ہینڈل دبا کر اس لڑکی کو کھڈ میں گرا دیتا ہوں۔ اس طرح وہ فوراً ہلاک ہوکر پانی میں بہہ جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔"

یہ باتیں سن کر غیظ و غضب سے نعمان خان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کہنے لگا۔

"خدا کی قسم میں سلطان خان کو قید کر کے اس ظلم کا خاتمہ کروں گا وہ ہرگز حکومت کے قابل نہیں۔"

ایک دن نعمان خان میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں نے سلطان خان کی گرفتاری کے لئے لاش کو بھیجا ہے مگر وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا کیوں کہ نبی خان کی گمشدگی سے خوف کھا کر گاؤں کے لوگوں نے جگہ جگہ الاؤ لگا رکھے ہیں۔ ایسی حالت میں ان لاشوں کے جل جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ابھی کچھ دن انتظار کروں گا۔"

ہمیں اس غیر آباد قلعے میں آئے ڈیڑھ مہینہ ہوگیا۔ ایک دن صبح کو فرزانہ نے ہمیں شمشاد کے فرزند پیدا ہونے کی خوش خبری دی۔ ہم فوراً بچے کو دیکھنے گئے۔ نعمان خان پہلے ہی وہاں موجود تھا اور بچہ کو دیکھ کر نہال ہورہا تھا۔

پرشکوہ پہاڑوں سے رونما ہونے والا آفتاب اپنی رنگین کرنوں سے اس کے چہرے کو شادمانی کی جلا دے رہا تھا۔ ویران گاؤں کے کھنڈروں میں رونق جھلک رہی تھی۔ کائنات کی ہر ایک چیز ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ہم سب کے دل مسرت سے بھرپور تھے۔

تھوڑی دیر بعد نعمان خان چلا گیا مگر ہم دونوں تمام دن وہیں رہے شمشاد بخار میں مبتلا تھی۔ میں اس کا علاج کررہا تھا شام کے وقت میں فرزانہ کو ضروری ہدایات دے کر چراغ کے ہمراہ اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوا۔

جب ہم صدر دروازے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لاشوں کی ایک پوری جماعت دروازے میں داخل ہورہی ہے ان میں سے دو لاشوں کے کندھوں پر ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ ہم دونوں گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئے اور وہ جماعت سیدھی ہال میں چلی گئی۔

میں نے چراغ سے کہا۔ "چلو گیلری سے جا کر دیکھیں۔ اس بنڈل میں کیا چیز ہے؟"

چنانچہ ہم گیلری پر چڑھ گئے۔ آتش دائرہ بدستور جل رہا تھا نعمان خان اپنے بیٹے کی لاش پر عمل کرنے میں مصروف تھا۔ ستون کے قریب ان لاشوں نے اپنا بوجھ اتارا۔ اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی چیز کو کھول دیا، یہ سردار سلطان خان تھا جس کو ان لاشوں نے چارپائی پر ڈال دیا اور خود ساری جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئیں۔

ہم اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں چچا کے بھتیجے سے ملاقات کس طرح ہوتی ہے اور اس ملاقات کا ان دونوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

لیکن نعمان خان اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے اس کارروائی کا کچھ علم نہ ہوا۔ سلطان خان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔ وہ ابھی تک غشی کی حالت میں تھا لیکن کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو انگڑائی لے کر ستون کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے چچا پر پڑی جو اپنے بیٹے کی لاش کے پاس کھڑا اس پر عمل کررہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا پھر کسی فوری جوش سے گھونسا تان کر حملے کی نیت سے اٹھا مگر جب اس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لاشوں پر پڑی تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور رنگ جو پہلے ہی زرد تھا نیلا ہوکر مرجھا گیا۔ اس کی گناہ گار روح جسم سے علیحدہ ہوچکی تھی۔

نعمان خان اب تک ان واقعات سے بے خبر

آپنے عمل میں مصروف تھا۔

دفعتاً لڑکے کی لاش میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور وہ یکا یک آنکھیں کھول کراسے خشمناک نگاہوں سے گھورنے لگا پھر وہ یک دم اٹھا اور بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا اوراپنی انگلیاں بوڑھے نعمان خان کے گلے میں پیوست کردیں۔

یہ حالت دیکھ کرفوراً ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گیا۔میں نے اوپر سے چلا کر کہا۔

”آہ یہ فتح ایک مکمل شکست ہے تمہارے بیٹے کے جسم میں سلطان خان کی روح داخل ہوگئی۔“ اس نے میری آواز سن لی اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یکا یک سلطان خان کی لاش دیکھ کر سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

اب وہ گلا چھڑانے کی ناکام جدوجہد چھوڑ کر لاشوں کی جماعت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ نظریں بے معنی نہ تھیں وہ ان کو دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے رہا تھا۔ یک لخت لاشیں آگ کا دائرہ پھلانگ کر اس پر ٹوٹ پڑیں اور لڑکے کی لاش کی تکا بوٹی کردی لیکن اس کی انگلیاں بدستور نعمان خان کے گلے میں جکڑی رہیں اور وہ مردہ ہوکر فرش پر گر گیا۔

نعمان خان کے مرنے سے لاشوں کی قوت زائل ہوگئی اور وہ بھی سوکھے تنے کی طرح اوندھی گرگئیں ہم اس ناگہانی واقعہ سے سہم گئے اچانک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔اب ہمیں خطرے کا احساس ہوا جب لاشوں نے آگ کا دائرہ پھلانگا تو ان کے کفن میں آگ لگ گئی جن کے جلنے سے آگ ہال کی چٹائیوں اور دوسری چیزوں تک پہنچ گئی۔تمام کمرہ دھواں دار ہوگیا۔

ہم بمشکل وہاں سے جان بچا کر بھاگے۔شمشاد کے کمرے کی طرف آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ہم فوراً اس طرف دوڑے اور ان کو وہاں سے نکال لیا۔آناً فاناً میں آگ ہر طرف پھیل گئی شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

ہم شمشاد اور اس کے بچے کو یہاں سے اٹھا کر بھاگے اور رزون کی ٹہنی کی مدد سے اس کھوہ میں داخل ہوئے جس میں سے ندی نکل رہی تھی جب ہم زمین دوز منبع کے قریب گئے تو ایک طرف ہمیں ایک نیچا اور لمبا سرنگ نما راستہ دکھائی دیا۔اس میں کمر کمر تک پانی تھا جس میں ہم کافی دیر تک چلتے رہے اور بوقت تمام اس راستے کو ختم کر کے اس غار میں پہنچے جہاں سے ہمیں لاشیں پکڑ کر لے گئی تھیں۔

ہم لوگ پانی میں شرابور تھے۔شمشاد بھی جسے پانی سے بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی تھی بھیگ گئی تھی۔وہ پہلے ہی بخار کی حالت میں تھی بھیگ جانے سے اس پر نمونیئے کا زبردست حملہ ہوا، اس وقت نہ کوئی دوا میرے پاس تھی نہ علاج کا کوئی دوسرا ذریعہ تھا اس کی حالت بگڑنے لگی اور رات کے آخری حصے میں وہ جاں بحق ہوگئی۔

ہمیں اس کی دردناک موت سے بے حد قلق ہوا اور صبح کے وقت میں بصد حزن وملال مولوی عبدالصمد کے پاس گیا وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے میں نے وہ تمام واقعات جو دیکھے اور سنے تھے ان کے گوش گزار کردیئے۔ اتفاقیہ وہ جمعہ کا دن تھا۔

مولوی عبدالصمد نے مجھے تسلی دی۔ بعد نماز جمعہ گاؤں والوں کو، جو اپنے سردار کی گمشدگی پر ہراساں تھے یہ قصہ سنایا۔ بچہ ان کے سامنے لایا گیا سردار کی حسرت ناک موت سے ان لوگوں کو ایک گونہ رنج ہوا مگر بھوتوں کے خاتمہ کی خوشخبری اور بچے کے دیکھنے سے سب مطمئن ہوگئے اور سہ پہر کے وقت شمشاد کو دفن کردیا گیا بچے کا نام شمشاد خان رکھا گیا اور اس کے سن بلوغت تک مولوی عبدالصمد کو عارضی حاکم اور بچے کا اتالیق مقرر کیا گیا اور فرزانہ بزرگ کی پیشن گوئی کے مطابق ننھے سردار کی ماں بنائی گئی۔

شمشاد کی موت سے میرا دل اچاٹ ہوگیا اس لئے جلد ہی ہم لوگ وہاں سے چلے آئے۔اب مجھے ان لوگوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں البتہ میرے سفید بال اب بھی اس اندوہناک واقعہ کی یاد مجھے دلاتے رہتے ہیں۔





زندہ روح

ایس امتیاز احمد-کراچی

کمرے میں دیکھتے ہی دیکھتے سناٹا چھاگیا اور کمرے میں موجود تین افراد کے سانس لینے کی آواز تھی کہ اچانک ایک بھاری بھرکم دل کو ہولاتی آواز سنائی دی، یعنی کمرے میں روح کی آمد ہوگئی تھی پھر اچانک

نوجوان روحوں سے باتیں کرنے پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا لیکن یقین آیا تو، حیرتناک کہانی

ٹونی کو پراسرار علوم سے قطاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان علوم کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ان علوم میں وہ ستارہ شناسی، پامسٹری، حاضرات اور قیافہ شناسی سب کو شامل کرتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ساری باتیں ڈھکوسلا تھیں۔

اس کا کہنا تھا کہ ”زیادہ عقلمند لوگ اپنے سے کم عقل رکھنے والوں کی حماقتوں سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

ٹونی کا کوئی دوست اگر کسی ماہر پامسٹ کو ہاتھ دکھا کر آتا اور پامسٹ کی مہارت پر تبصرہ کرتا تو ٹونی ایک قہقہہ لگاتا۔

”بیچارے پامسٹ کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کا علم نہیں ہے۔ وہ تمہارے حالات کیا بتائے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر معاشرے میں اسی فیصد لوگوں کی طبعیتیں اور حالات ایک سے ہوتے ہیں۔ بس پامسٹ وہ، تمہیں بتا دیتا ہے۔“

اگر کوئی دوست کسی ستارہ شناس کے پاس سے آتا تو ٹونی خوب ہنستا۔ ”ارے بھئی ستارہ کسی کے مقدر کا حال کیسے بتا سکتا ہے۔“

اس کی یہ باتیں ٹونی کے ان دوستوں کو بری لگتی تھیں۔ جن کو پراسرار علوم کی صداقت پر یقین تھا۔ مگر ٹونی کو ان کے برا لگنے کی کبھی پروا نہیں رہتی تھی۔ وہ اکثر اس

بات کی کوشش کرتا تھا کہ اخلاقاً ہی سہی ان مسائل پر وہ تبصرہ نہ کرے۔ مگر معلوم نہیں کون سی طاقت تھی۔ جو اسے ان علوم کا مذاق اڑانے پر مجبور کرتی تھی۔

ٹونی کو سب سے دلچسپ اطلاع ایک دن اس کے گہرے دوست جمی نے دی۔ ''ٹونی تم پراسرار علوم پر یقین نہیں رکھتے ہو نا۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں!! یقین کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں تو ان کو ڈھکوسلا اور اعلیٰ قسم کی حماقت قرار دیتا ہوں۔''

''مگر ٹونی۔'' جمی نے کہا۔ ''آج میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گا، اور مجھے یقین ہے کہ تم ضرور یقین کرنے لگو گے۔''

کوئی اور ہوتا تو ٹونی کبھی جانے کی حامی نہ بھرتا۔ مگر جمی اس کا بہترین دوست تھا اور اس کی بات نا ماننا اس کا دل دکھانا ٹونی کے لئے ممکن نہیں تھا۔

ٹونی اس دن جمی کے ساتھ گیا۔ مگر اس پراسرار ماحول میں اسے پہلی دفعہ ایسا لگا۔ جیسے وہ تنہا ہے۔ حالانکہ جمی اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا لیکن ٹونی یوں محسوس کر رہا تھا کہ فرشی نشست پر صرف وہی اکیلا ہے اور کوئی بھی نہیں۔

کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جس میں فرش پر بیچ میں رکھی ہوئی میز نظر آ رہی تھی اور اس کے قریب ایک معمر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر تاریکی کی وجہ سے ان کے نقوش واضح نہ تھے۔ جب ٹونی کی نظریں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ معمر خاتون کسی گہرے رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔

''بیٹے تم میز کے قریب آ جاؤ۔'' خاتون نے کہا تو ٹونی کھسک کر میز کے کنارے پہنچ گیا۔ اب اس نے غور سے میز پر رکھے سامان کو دیکھا اس کی نگاہیں اب بھی پہچاننے سے قاصر تھیں کہ میز پر کیا ہے۔

''کھٹاک۔'' اور اس کے ساتھ ہی سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ میز پر ایک گول کاغذ بچھا ہوا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی سوئی لگی تھی۔ جیسے قطب نما میں ہوتی ہے۔ دائرے میں چاروں طرف حروف تہجی لکھے ہوئے تھے۔ سوئی نیچے کے ایسے خانے پر رکی ہوئی تھی۔ جس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹونی کو ایسا لگا۔ جیسے جوئے خانوں میں دائروں میں سوئی گھومتی ہے۔ داؤ لگانے والے کوئی نمبر بولتے ہیں اور سوئی تیزی سے گھمائی جاتی ہے۔ اور جب تک سوئی نہیں رکتی، داؤ لگانے والے بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ پھر سوئی آہستہ آہستہ کسی خانے پر رک جاتی ہے۔ جوئے خانے والا اس خانے کا نمبر بولتا ہے اور کسی ایک کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو جاتا ہے۔ کچھ اس قسم کا دائرہ اس میز پر بنا ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قسمت آزمائی کے دائرے میں مختلف نمبر لکھے ہوتے ہیں۔ اور اس دائرے میں حروف تہجی لکھے ہوئے تھے۔ ٹونی کو عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اس کیفیت کو پراسرار ماحول کے اثر پر محمول کیا۔

''بیٹے تمہارا کیا نام ہے۔'' خاتون نے پوچھا۔

''ٹونی۔''

''ٹونی بیٹے میں خود کچھ نہیں کرتی میں تو بس روح بلاتی ہوں اور وہ روح جواب دیتی ہے۔''

''تو کیا روح خود جواب دیتی ہے؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''نہیں جب روح آتی ہے تو یہ سوئی زور سے حرکت کرتی ہے۔ اور سائل اپنا سوال کر دیتا ہے تو.....'' یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ ''مگر تم یہ کیوں پوچھتے ہو ابھی سب تمہارے سامنے ہوگا۔ تم جو پوچھنا چاہتے ہو سوچ لو۔ اور جب میں کہوں تو اپنا سوال دہرا دینا اور اگر تم چاہو تو اپنے دوست کو باہر بھیج دو۔''

''نہیں۔'' ٹونی نے کہا۔ وہ جمی کو باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ مگر معلوم نہیں ماحول کی پراسراریت اس پر غالب کیوں آ رہی تھی۔

''تم کس کی روح بلوانا چاہتے ہو۔''

''میں۔'' ٹونی نے کچھ دیر سوچا۔ ''میں اپنے والد کی روح بلوانا چاہوں گا۔''

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اب کمرے میں صرف تین افراد کے سانس لینے کی آواز تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور روشنی صرف اس خانے پر مرکوز تھی۔ جہاں روح آ کر سوئی کو حرکت دیتی۔ پھر معمر خاتون نے کچھ

پڑھنا شروع کیا۔ وہ چند جملے کسی اور زبان میں بار بار دہرا رہی تھیں۔ ٹونی پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

''ٹونی تم روح کو آواز دو۔'' خاتون کی آواز آئی۔

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

سناٹا۔ ''پھر آواز دو۔''

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔ ان کا نام تھا۔ رابرٹ۔''

''تھا نہیں ہے کہو۔''

''میں مسٹر رابرٹ کو یعنی اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

اس بار کمرے میں ایک دم روشنی کا جھماکا ہوا۔ جیسے فوٹو گرافری فلیش گن کا ہوتا ہے۔ پھر بلب کی روشنی سرخ سے اچانک سبز ہوگئی۔ اور دائرے میں بنی ہوئی سوئی تیزی سے حرکت کرنے لگی مگر یہ حرکت خالی خانے ہی میں محدود تھی۔

''تمہارے والد کی روح کمرے میں موجود ہے۔'' خاتون نے کہا اور یہ جملہ سنتے ہی ٹونی پسینے سے نہا گیا۔ اس نے اچھی طرح سنا کہ کمرے میں قدموں کی چاپ آرہی تھی۔ وہ اس چاپ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جب کبھی اس کے والد کسی بات سے بے چین ہوتے تھے تو وہ اسی طرح کمرے میں چہل قدمی کرتے تھے۔ یہ مانوس چاپ تھی۔

''ٹونی!'' ٹونی ایک دم اچھل پڑا۔ وہ سمجھا کہ شاید یہ اس کے والد کی آواز ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اندازہ ہوا کہ معمر خاتون نے اسے آہستہ سے آواز دی تھی۔ ''ٹونی اپنے والد کی روح کو زیادہ پریشان مت کرو۔ سوال کرو اور پھر جلد از جلد انہیں رخصت کرو۔''

''گڈ نائٹ ڈیڈی۔'' ٹونی کی آواز لرزی۔

''سوئی نے حرکت کی، سوئی مختلف خانوں تک جاتی اور خالی خانے تک واپس آتی۔ اور جب سارے حروف اس نے ملائے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مسٹر رابرٹ کبھی ٹونی کے سلام کے جواب مارننگ یا نائٹ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ او کے کہتے تھے۔ اس بار بھی سوئی ''او'' اور ''کے'' پر جانے کے بعد واپس خالی خانے میں لرزنے لگی تھی۔

''کیا آپ کو میری والدہ کا نام۔ میرا مطلب ہے۔ کیا آپ کو اپنی بیوی کا نام یاد ہے؟''

سوئی حروف پر جا جا کر خالی خانے تک واپس آنے لگی۔ روح نے نام لکھوا دیا تھا۔ ''جولیا۔''

ٹونی اس تجربے سے نڈھال سا ہوگیا تھا۔ اس کے والد کی روح اس کے قریب موجود تھی۔ اور اس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

''آپ کا انتقال کس وجہ سے ہوا؟'' یہ وہ سوال تھا۔ جو مدتوں سے ٹونی کے ذہن میں تھا اور جواب نے اس کے شک کو یقین میں تبدیل کردیا۔

سوئی نے حرکت شروع کی اور ٹونی سناٹے میں رہ گیا سوئی کی حرکت نے زہر کا لفظ بنایا تھا۔

''زہر کس نے دیا تھا؟'' ٹونی نے کانپتی آواز میں سوال کیا تو سوئی نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ حرف پھر خالی خانے میں واپسی پھر حرف، واپسی پھر حرف، واپسی، حرف پھر واپسی ٹونی نے حروف کو دہرانا شروع کیا۔ ''بی، اے، آر، ٹی، آر'' سوئی اب خالی خانے میں لرز رہی تھی۔

''بارٹر!''

ٹونی یہ نام بتا کر ساکت وصامت رہ گیا۔ اب اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

خاتون کی آواز ابھری۔ ''ٹونی مسٹر رابرٹ کی روح کو واپس بھیج دو۔''

''روح واپس جائے۔''

''روح واپس جائے۔''

''روح واپس جائے۔''

سوئی خالی خانے میں تھوڑی دیر لرزی پھر ساکت ہوگئی اور معمر خاتون نے کمرہ روشن کردیا۔ کمرے میں چاروں طرف مختلف قسم کے تصویری خاکے آویزاں تھے۔ کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین تھا۔ دائیں طرف ایک میز پر بڑا سا گلوب رکھا ہوا تھا۔ مگر اس پر دنیا کے نقشے کے بجائے مختلف حروف لکھے ہوئے تھے۔

''بس اب آپ دونوں جائیں۔'' خاتون نے کہا اور

ٹونی خواب کی سی حالت میں جمی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر باہر گلی ہوا میں نکل گیا لیکن بہت دیر تک اس کے حواس بحال نہ ہوئے۔

''میرے والد کی روح نے صحیح بتایا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔'' ٹونی نے جمی کو بتایا۔ ''تمہاری والدہ۔''

''نہیں جمی۔ ایسا مت سوچو میرے والد کو زہر دیئے جانے میں میری والدہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو والد کے انتقال سے ایک سال قبل مرچکی تھیں۔''

''بارٹر کون ہے۔''

''بارٹر! میں جانتا ہوں کہ بارٹر کون ہے۔ اور وہ اس وقت ملک کے کس حصے میں رہتا ہے۔''

جمی نے ٹونی سے مزید کچھ دریافت کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اسی دن سے ٹونی پراسرار علوم میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کا دلچسپ مشغلہ روحیں بلانا ہوگیا۔

ٹونی کو کبھی کبھی خود پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ وہ اچانک تبدیل ہوگیا تھا۔ اپنے ان دوستوں سے وہ پراسرار علوم کے سچے اور صحیح ہونے پر بحث کرنے لگا تھا جن کا وہ کبھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کے مزاج کی اس تبدیلی پر حیران سب تھے۔ مگر یہ بات صرف جمی کو معلوم تھی۔ کہ ٹونی میں اس تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے۔ مگر یہ بات جمی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ ٹونی روحیں بلانے کے مشغلے میں منہمک ہوگیا ہے۔ اور مسز روتھ کا باقاعدہ شاگرد بھی ہو چکا ہے۔

مسز روتھ نے ابتداء میں تو روحوں کو بلانے کا عمل سکھانے سے انکار کیا۔ مگر ٹونی کے بے حد اصرار پر آخرکار اُسے راضی ہونا پڑا۔ ویسے یہ بات ٹونی کو اچھی طرح معلوم تھی کہ اس سلسلے میں مسز روتھ نے کسی روح کو بلا کر مشورہ کیا تھا۔ اور اس کی اجازت کے بعد ہی وہ ٹونی کو اپنا علم سکھانے پر تیار ہوئی تھی۔

ٹونی نے آہستہ آہستہ تجربات کرنے شروع کردیئے۔ اس دن وہ خوشی کے مارے ساری رات نہ سو سکا۔ جس دن اس نے پہلی بار خود روح بلائی تھی۔ اس نے روح بلائی، سوئی لرزی اور ٹونی نے روح کو واپس بھیج دیا۔

اس سے زیادہ خطرہ وہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

دوسری دفعہ اس نے روح بلا کر اس سے صرف سلام و دعا پر اکتفا کیا اور اسے واپس بھیج دیا۔

تیسری دفعہ اس نے شیکسپیئر کی روح کو بھی خدا حافظ کہہ دیا۔ اس کی ان مسلسل کامیابیوں سے مسز روتھ بہت خوش ہوئیں مگر جب ٹونی نے کہا کہ ''وہ زندہ آدمی کی روح کو بلانا چاہتا ہے تو مسز روتھ حیرت سے اچھل پڑیں۔ زندہ آدمی کی روح!؟''

''ہاں میں چاہتا ہوں کہ اب زندہ آدمی کی روح بلواؤں۔''

''مگر زندہ آدمی کی روح کیسے بلواؤ گے۔ میں نے تو کبھی ایسا تجربہ نہیں کیا۔'' مسز روتھ نے حیرت سے کہا۔

''مسز روتھ میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔''

''نہیں ٹونی بیٹے ایسے تجربات نہیں کرتے جن کا ضمیر ہمیں نہ ملتا ہو یہی اس عمل کے آداب ہیں۔''

''تو کیا یہ ناممکن بات ہے۔''

''یہ میں نہیں کہہ سکتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس علم میں زندہ لوگوں کی روحیں بلانے کی ممانعت ہے اور کسی نے اس اصول کو توڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مسز روتھ نے محسوس کیا کہ ٹونی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں رہا۔

دوسرے دن مسز روتھ اور جمی دونوں نے ریڈیو، اخبار، ٹیلی ویژن سے یہ خبر سنی کہ ملک کے مشہور سرمایہ دار اور صنعتکار مسٹر بارٹر اچانک بیہوش ہوگئے۔ اور ان کی یہ بیہوشی ان کی موت پر ختم ہوئی۔

اس دن شام کو ٹونی نے جمی کو تو صرف اسی قدر بتایا کہ ''مسٹر بارٹر نے ہی کاروباری رقابت کے سبب اس کے والد کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔''

مگر مسز روتھ کو معلوم تھا کہ ''ٹونی نے مسٹر بارٹر کی روح کو بلانے کے بعد دائرے کی سوئی توڑ دی تھی اور اسے واپس نہیں بھیجا تھا۔''





سکتے کی موت

ایس امتیاز احمد-کراچی

سترہ سال پہلے مرنے والی لڑکی اچانک زندہ ہوگئی اور زندگی کے شب و روز میں رواں دواں ہوگئی، اور پھر وہ دوبارہ ستاون سال بعد ایک مرتبہ پھر مرگئی اور چتا کے سپرد ہوگئی، ناقابل یقین مگر حقیقت کہانی میں موجود ہے۔

ایک عجیب وغریب عقل کواچنبھے میں ڈالتی ناقابل یقین سوچ سے بالاتر حقیقت

کسی مرے ہوئے انسان کا زندہ ہوجانا کسی بھی ڈاکٹر کے لئے قابل یقین نہیں ہوسکتا لیکن محترم سید محمود شاہ من گھڑت قصے سنانے والے نہیں۔ ان کی ہر کہانی سچی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر تحقیقات کی تو انکشاف ہوا کہ یہ کالے عمل کے اثرات تھے۔ ایسے واقعات پاکستان میں بھی ہوئے ہیں۔ کالے عمل کا حامل مطلوبہ فرد پر سکتہ طاری کردیتا ہے جسے موت سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عامل سکتے کی یہ کیفیت خود ختم کرتا ہے یا یہ کیفیت اس وقت کے بعد خود ختم ہوجاتی ہے جو وقت عامل نے مقرر کیا ہو۔

آپ نے ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ سنا ہوگا کہ ایک آدمی مرگیا اسے قبر میں اتارنے لگے تو وہ زندہ ہوگیا۔ یہ سکتہ ہوتا ہے جو از خود بھی ختم ہوسکتا ہے اور کالے عمل

سے طاری کیا ہوا سکتہ بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے جہاں تک اس کہانی کا تعلق ہے یہ سچی ہے۔

ایک سرکاری کام کے سلسلے میں مجھے پٹیالہ جانا پڑا۔ یہ میرا ایک عام سا سفر تھا جسے ایک ہندو نے یادگار بنا دیا۔ گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ موسم تو اچھا خاصا دلکش تھا مگر میں بور ہورہا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ٹرین کا سفر مجھے کبھی اچھا ہی نہیں لگا اور دوسری بات یہ کہ ڈبے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اکثریت ایسے ہندوؤں کی تھی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں تھیلیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان تھیلیوں میں ان کے مرے ہوئے عزیزوں کی ہڈیاں تھیں جنہیں وہ دریائے گنگا میں پھینکنے کے لئے ہردوار جارہے تھے۔

ہردوار کے بارے میں بتا تا چلوں کہ ہردوار ضلع سہارن پور کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ بھارت کے صوبہ اتر پردیش کا یہ قصبہ مذہبی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قدیم زمانے میں ہردوار کا نام کپیلا تھا۔ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا اس قصبے کے پاس بہتا ہے۔ وہاں ایک گھاٹ ہے جس کو ''ہری کا چرن'' کہتے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ صدیوں پہلے ان کے دیوتا نے یہاں اشنان کیا تھا اور دیوتا کے قدموں کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصبہ ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہے۔ تقریباً ہر ہندو کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں ہردوار جا کر گنگا برد کی جائیں کیونکہ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جس کی ہڈیاں ہردوار جا کر ''ہری کے چرن'' کے پاس دریا میں پھینکی جاتی ہیں۔ اس مردے کی آتما کو سکون ملتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔

میرے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس نے ہڈیوں والی تھیلی اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔ اداسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میں بوریت کم کرنے کے لئے کسی ہم سفر کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

''لالہ جی......!'' میں نے خاموشی کو توڑا...... ''آپ ہردوار جارہے ہیں......؟''

''ہاں جی......!'' اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا اور بات ختم کردی۔

اس کے بعد میں نے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دل میں دعا کررہا تھا کہ ''یا اللہ پٹیالہ جلدی آئے تاکہ میں اس ماتمی ماحول سے نکل کر بھاگ سکوں۔'' یہ سفر میری زندگی میں بدترین سفر ثابت ہورہا تھا۔

پٹیالہ سے پہلے گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی، ہمارے ڈبے سے ایک دو مسافر اتر گئے ایک مسافر ہمارے ڈبے میں آیا۔ وہ اپنی ہیت کذائی سے مکمل ہندو بنیا نظر آتا تھا۔ قد درمیانہ، ٹانگیں پتلی، مٹکے جیسی توند جو اس کے داخل ہونے سے پہلے ڈبے میں داخل ہوئی۔ اس نے سرسری طور پر تمام ڈبے کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر پر پڑی۔

''سکھدیو......!'' اس نے پکارا...... ''تم کدھر؟'' اور آکر اس سے لپٹ گیا۔

ان دونوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے انداز سے ہی معلوم ہوگیا کہ برسوں کی آشنائی ہے۔

گاڑی نے وسل دی اور ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ نوارد مسافر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے جو مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''سکھدیو......!'' نوارد مسافر نے کہا...... ''تمہاری پتنی کی مرتیو کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے تمہیں خط ڈال دیا تھا مگر کاروباری مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکا۔ معاف کرنا۔''

''کاروبار میں اتنا مصروف ہونا بھی درست نہیں کہ عزیزوں کی موت پر بھی انسان نہ آسکے۔'' سکھ دیو نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''میں تو اطلاع کو صحیح نہ سمجھا تھا۔'' نوارد نے کہا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہاری طرف سے دوسری اطلاع آئے گی کہ پشپا بھابھی مرگئی اور زندہ ہوگئی تھی۔''

اس ہندو کی یہ بات سن کر میں نے غیر ارادی طور پر حیرت ناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں بھی سمجھ گئے اور میری طرف متوجہ ہوئے۔

''بابو جی......!'' بوڑھے سکھدیو نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کی بات سن کر شاید حیران ہوگئے ہیں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے، دنیا میں ہر انسان کو ایک دفعہ مرنا ہے مگر میری پتنی دو بار مری ہے۔ ایک دفعہ وہ اس وقت مری جب اس کی عمر سترہ سال تھی اور پھر وہ آج سے چند ماہ قبل ستاون سال کی عمر پا کر مری ہے۔''

میری حیرت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں...... کوئی مردہ زندہ ہوا ہو، نہ کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔ ''ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسے لگا جیسے یہ دونوں ہندو کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہوں اور پاگل پن میں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہوں۔ سکھدیو کا پاگل پن تو سمجھ میں آتا تھا...... اس کی بیوی مرگئی تھی۔ بیوی اسے بہت پیاری ہوگی اور اس صدمے کا اثر اس کے دماغ پر پڑا ہوگا مگر دوسرے کا پاگل پن ناقابل فہم تھا۔

''آپ کی پتنی پہلی بار مری تھی تو پھر زندہ کیسے ہوئی......؟'' میں نے سکھدیو سے پوچھا۔

''بابو جی......!'' اس نے جواب دیا۔ ''میری شادی کو چند ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن میری پتنی کو قولنج ہوا۔ وہ درد کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسی۔ ہم اس کی ارتھی شمشان گھاٹ لے گئے۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی مگر بھگوان کی کرپا سے۔''

وہ زندہ ہوگئی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ پھر ہم نے زندگی کے چالیس سال اکٹھے گزارے۔ اس سے میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اب میرے بچے جوان ہیں اور اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ تقریباً تین ماہ قبل میری پتنی کو ٹھنڈ لگ گئی پھر تیز بخار ہوگیا۔ حکیم سے دوائی لی مگر چوتھے دن وہ مرگئی۔ میرے گلے میں آپ جو تھیلی دیکھ رہے ہیں اس میں اس کی ہڈیاں ہیں جنہیں میں ہردوارے لے جارہا ہوں۔''

''لالہ جی!'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ سب ہوا کیسے؟''

''بابو جی......!'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اگر میں تمہیں سنا بھی دوں تو شاید تمہاری عقل اس حقیقت کو سچ تسلیم نہ کرے۔ مگر یہ حقیقت ہے میرا سارا گاؤں اس کا گوارہ ہے۔''

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہ پٹیالہ کا اسٹیشن تھا اور مجھے یہاں اترنا تھا میں نے اپنا سامان اٹھایا اور گاڑی سے اتر گیا۔ ایک تشنگی تھی جو میں محسوس کررہا تھا۔ وہ اپنی کہانی شروع ہی نہ کرتا تو اچھا تھا۔

''موت کے بعد پھر زندگی ایک غیر فطری عمل تھا۔'' مجھے قوی یقین تھا کہ اس کی کہانی سچائی سے خالی ہوگی۔

میری تعیناتی جلال پور میں تھی۔ میں نے پٹیالہ میں دو دن گزارے۔ سرکاری کام نپٹایا اور واپس جلال پور چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد میرا تبادلہ جلال پور سے مکتسر ہوگیا۔ مکتسر اب انڈیا کے صوبہ پنجاب میں ہے۔ ایک شام میں اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ گشت پر نکلا۔ مکتسر کے مین بازار میں کچھ لوگ جمع تھے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہیں اور لوگ انہیں چھڑانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی دونوں کو دو دو ڈنڈے لگائے۔ وہ فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ ایک سپاہی سے کہا۔ ''ان دونوں کو تھانے لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔'' سپاہی ان دونوں کو لے کر تھانے چلا گیا اور میں تھوڑی دیر پوچھ گچھ کے لئے وہاں رک گیا۔ ان کے مابین لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کی بازار میں کپڑے کی دکانیں تھیں ان میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اس روز معاملہ ذرا سنگین ہوگیا تھا۔

دو تین گھنٹے بعد میں جب تھانے میں داخل ہوا تو تھانے میں ان دونوں کے علاوہ ان کے چند عزیز بھی موجود تھے۔ چونکہ کیس معمولی نوعیت کا تھا اس لئے

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں دکانداروں کو ڈانٹ پلا کر ان کی آپس میں صلح کروادی جائے ایسے واقعات تو پولیس والوں کا روز مرہ کا معمول ہوتے ہیں۔ ان دونوں دکانداروں کے سرپرست باہر موجود تھے۔ انہیں بلایا ان میں سے ایک شخص کو دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے کچھ یاد نہ تھا۔

بہرحال میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہ کون ہے؟''

اس نے ایک دکاندار کا نام لے کر کہا۔ ''وہ اس کا پتا ہے۔''

اس نے اپنے بیٹے کی وکالت میں بولنا شروع کردیا۔ ''ہم شریف لوگ ہیں۔ میرا شہر میں کپڑے کا کاروبار ہے۔ عرصہ دراز سے ہم نہایت ایمانداری سے کاروبار کررہے ہیں۔ اس کی تصدیق آپ بازار سے کرسکتے ہیں۔''

میں اس کی باتیں سننے کی بجائے اس کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی جو اس شخص سے وابستہ تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

''میرا نام سکھدیو ہے، تھانیدار صاحب......!''

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''آپ پورے بازار کے دکانداروں سے پتہ کرلیں جی......!''

مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی سکھدیو ہے جو کچھ عرصہ قبل مجھے پٹیالہ جاتے ہوئے ٹرین میں ملا تھا اور وہ ہردوار جارہا تھا۔

ایک رسمی سی کارروائی کے بعد میں نے فریقین میں صلح کرادی اور آئندہ دنگا فساد نہ کرنے کا وعدہ لے لیا۔ تمام لوگوں کو تھانے سے چلے جانے کا کہہ کر سکھدیو کو تھوڑی دیر کے لئے رک جانے کو کہا۔ سب چلے گئے تو میں نے سکھدیو کو ہردوار والا سفر یاد دلایا اور اپنی تشنگی کا اظہار کیا۔ اس کی جان میں جان آئی ورنہ مارے خوف کے اس کا برا حال تھا۔ میں نے اسے اگلے دو دن مصروف ہونے کی وجہ سے کہا کہ ''دو دن کے بعد شام کو آنا، تمہاری کہانی تفصیل سے سنوں گا۔''

تیسرے دن شام کو سکھدیو وعدے کے مطابق آ گیا، تھوڑی گپ شپ کے بعد اس نے اپنی کہانی شروع کی جو میں اسی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

''میں جوان ہوا تو میرے پتا نے مجھے اسکول سے اٹھالیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آٹھویں جماعت تک پڑھ لینا ہی بہت ہے۔ مجھے اپنے پتا کے ساتھ دکان پر بیٹھنا پڑا۔ گاؤں میں ہماری کپڑے کی دکان تھی۔ چار پانچ سال کے مختصر عرصے میں بھگوان کی مہربانی اور ہماری محنت سے ہمارا کاروبار چمک اٹھا پھر ہم نے ایک دکان مکتسر کے مین بازار میں بھی کھول لی۔ گاؤں والی دکان پر پتا جی بیٹھتے تھے اور شہر والی دکان میں نے سنبھال لی۔ اب میرے ماتا پتا میرے بیاہ کی فکر کرنے لگے۔ میں بیاہ کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا۔ سچ پوچھیں تو میں نے کاروبار میں اپنے آپ کو اتنا لجھا رکھا تھا کہ سوائے روپیہ کمانے کے مجھے کوئی اور سوچ ہی نہ تھی۔ میری ماں میرے سر پر سہرا سجانا چاہتی تھی لیکن میں بیاہ سے دامن بچا کر اپنے کاروبار کو بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش میں تھا۔ یہی میری ضد تھی جس کے آگے میرے گھر والے بے بس تھے۔

ایک دن ایک لڑکی اپنی نوکرانی کے ہمراہ میری دکان پر آئی۔ میرا واسطہ ہر طرح کے گاہکوں سے رہتا تھا۔ مگر میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ رنگ بھی سانولا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی بلکہ جادو کا سا اثر تھا۔ میں اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ لڑکی نہیں دیوی ہے۔ اس کی آنکھوں کی کشش مجھے مسحور کررہی تھی۔ شاید میں ہونق لگ رہا تھا۔ وہ مسکرادی اور بولی۔ ''آپ کے پاس بوسکی ہوگی؟''

آپ جانتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کے زمانے بوسکی بہت مہنگا اور مشہور کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں نے فوراً بوسکی کے تھان نکالے اور اس کے آگے ڈھیر کردیئے۔ اس نے دو سوٹ خریدے اور چلی گئی۔

''وہ چلی گئی مگر مجھے لگا کہ میرا سب کچھ اپنے ساتھ

لے گئی ہو۔ میں آج تک حیران ہوں کہ مجھ جیسے مکمل کاروباری شخص پر اس کے عشق کا بھوت کیسے سوار ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا جادو تھا جس نے میرے اندر کے نوجوان سکھدیو کو جگادیا۔ اب تو کسی پہلو چین نہ تھا۔

اس کو دیکھنے کی خواہش من میں مچلنے لگی۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ گھر گیا تو طبیعت بوجھل بوجھل تھی۔ وہ رات صحیح طریقے سے میں سو بھی نہ سکا، صبح صبح نہا کر مندر بھی گیا۔ بھگوان سے اس کے ملن کی پرارتھنا کی اور یہ امید لئے دکان پر آیا کہ شاید وہ دیوی پھر آ جائے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ابھی تو کل کپڑا لے کر گئی تھی۔

کئی دنوں کے مسلسل انتظار کے بعد میری دکان کے بھاگ جاگے۔ اس دفعہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ آئی۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔ میرے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت آ گئی۔ ایسے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

وہ بول پڑی...... ''اس دن تم نے غلطی سے کپڑا بہت سستا دے دیا تھا۔ مجھے تو شاید پتہ بھی نہ چلتا میری اس سہیلی پریم کور کو جب میں نے سوٹ دکھائے اور قیمت بتائی تو یہ حیران رہ گئی۔ اس نے یہی کپڑا چند دن گزرے کہ خریدا تھا۔ آج پھر ہم نے بازار سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کپڑے کا ریٹ واقعی زیادہ تھا۔ لگتا ہے تم سے بھول ہوگئی ہے۔'' یہ ساری باتیں وہ ایک ساتھ کہہ گئی۔

''دیوی جی! آپ نے اور کپڑا لینا ہے تو لے جائیں۔ اس سے بھی آدھے ریٹ پر دوں گا۔''

یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ''بکواس بند کرو تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو کپڑے کے ٹکڑے پر بک جاتی ہیں۔'' اس نے اپنا بٹوا کھولا۔ باقی رقم میرے منہ پر ماری اور بکتی جھکتی، غصے میں پیر پٹختی دکان سے چلی گئی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوگیا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے آخر کون سی خطا کی ہے۔ میں غلط کردار کا آدمی نہ تھا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

منجو میرا ایک جگری یار تھا۔ اکثر شام کو میری دکان پر آتا تھا۔ شام کو منجو آیا تو میں نے اسے پوری رام کہانی سناڈالی۔ وہ جگت استاد تھا۔ کہنے لگا۔ ''سکھدیو اپنا کاروبار آرام سے کرو۔ لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنا کاروبار بھی برباد کرو گے اور بدنامی مفت میں ملے گی۔''

مگر میری حالت میرے قابو سے باہر تھی۔ میں نے منجو کی بہت منت ساجت کی پھر اس نے میری مدد کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ شاید وہ بھی معاملے کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔ اس کی دکان پر ایک بڑھیا آیا کرتی تھی جس کی لڑکیاں سوزن کاری میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ ان کے کاڑھے ہوئے کپڑے منجو کی دکان پر لاتی تھی۔ اس کا شہر کے کئی گھروں میں آنا جانا تھا۔ منجو نے اس سے راز داری کا وعدہ لے کر بات کی۔

''شاہ صاحب! وہ بڑھیا بڑی تیز نکلی۔ اس نے لڑکی کا مکمل پتہ معلوم کرلیا۔ وہ لڑکی سیٹھ بھگوان داس کی سب سے بڑی بیٹی پشپا تھی۔ پشپا سے چھوٹی تین بہنیں اور تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ بڑھیا کے بقول پشپا پاکیزہ اور نیک لڑکی تھی۔'' میں نے بڑھیا کو اس کی توقع سے بڑھ کر انعام سے نوازا، بڑھیا کی خواہش تھی کہ وہ میرے اور پشپا کے درمیان تعلق پیدا کردے گی مگر میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑھیا کو اس کام سے روک دیا۔

ایک دن میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ ''میں سیٹھ بھگوان داس کی بڑی بیٹی پشپا سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو میں ساری عمر بیاہ نہ کروں گا۔''

''بیاہ کا سن کر میری ماں بہت خوش ہوئی۔ اگلے ہی دن میرے ماں باپ سیٹھ بھگوان داس کی حویلی میں میرے رشتے کے لئے گئے۔ میں اس کام کو بہت دشوار سمجھ رہا تھا۔ اتفاق سے سیٹھ بھگوان داس میرے باپ کا پرانا جاننے والا نکلا اور پلک جھپکتے میری اور پشپا کی بات پکی ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد میری شادی پشپا سے ہوگئی۔

شادی سے پہلے اسے میرے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ شادی کے بعد جب اسے پوری کہانی کا علم ہوا تو وہ میری محبت کی قائل ہوگئی۔

ہماری شادی کو چند ہی ماہ گزرے تھے۔ پوہ کا مہینہ تھا۔ سردی بہت تھی۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا، باہر دروازے پر ایک جوگی نے صدا لگائی۔ دروازہ کھلا تھا اور جوگی کشکول لئے کھڑا تھا۔ میری ماں نے پشپا سے کہا کہ ''جا بیٹی! جوگی بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے کچھ دے آؤ۔''

پشپا نے کچھ پیسے لئے اور جوگی کو دینے گئی۔ جوگی نے اپنا کشکول آگے کرنے کی بجائے پیچھے کرلیا اور نگاہیں پشپا پر مرکوز کردیں۔ اتنے میں میری ماں بولی۔ ''جوگی بادشاہ، نئی دلہن ہے۔ اس کو دعا دے دو۔''

جوگی بولا۔ ''دعا رحم کی یا قہر کی؟''

میری ماں دوڑی گئی اور کہا۔ ''مہاراج! رحم کی دعا کرو۔''

میں صحن میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جوگی نے اپنے کشکول سے گندم کے چند دانے اٹھا کر پشپا کے منہ پر مارے اور بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ میری ماں گھبرا گئی میں نے اٹھ کر ماں کو تسلی دی مگر وہ کہہ رہی تھی کہ ''ایسے لگتا ہے جوگی ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔''

جوگی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پشپا کے پیٹ میں بائیں جانب درد شروع ہوگیا جو بڑھ گیا۔ میں دوڑ کر گاؤں کے حکیم کے گھر گیا۔ حکیم صاحب بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھے فوراً میرے ہمراہ آگئے۔ پشپا درد سے تڑپ رہی تھی۔ حکیم صاحب نے ایک سفوف پانی میں گھول کر پشپا کے منہ میں ڈالا جس سے درد کی شدت میں کمی آگئی مگر وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ حکیم صاحب کی دوائی کا اثر تھا یا وہ درد کو برداشت کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

حکیم صاحب نے مجھ سے کہا ''اپنی بیوی کو شہر لے جاؤ وہاں اسپتال میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس سے اس کا علاج کرواؤ۔''

میں نے فوراً ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا، پشپا کو اس میں ڈالا اور شہر کو روانہ ہوئے۔ ابھی شہر کچھ دور تھا کہ پشپا نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔

وہیں سے بیل گاڑی واپس موڑی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

بہر حال موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ پشپا کو میں نے بڑی چاہت سے حاصل کیا تھا۔ محبت کی جیتی ہوئی بازی میں اتنی جلدی ہار جاؤں گا اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں اس شام کو کبھی نہیں بھول سکتا جب پشپا کی ارتھی شمشان بھومی لے جائی جا رہی تھی۔ پھر میری پشپا کو بہت ساری خشک لکڑیوں میں دفن کردیا گیا۔ کئی کنستر دیسی گھی لکڑیوں پر انڈیل دیا گیا۔ شام گہری ہوگئی۔ سردی زیادہ تھی اور آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میرے باپ نے مجھے چتا کو آگ لگانے کے لئے کہا۔ مذہبی فرض کی بجا آوری کی خاطر میں نے اپنی محبوب پتنی کی چتا کو آگ لگادی۔ اب پشپا کی چتا بڑے دھیمے انداز میں جل رہی تھی حالانکہ اس پر خاصی مقدار میں گھی ڈالا گیا تھا۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ چتا کی آگ نے تھوڑی سی جگہ کو روشن کر رکھا تھا۔ ورنہ ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے رشتہ دار کھسکنے لگے۔ پتا نے مجھے کہا کہ ''تم بھی چلو صبح آکر پھول چن لیں گے۔''

شاہ صاحب! ہم ہندو لوگ مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ میرا دل وہاں سے جانے کو نہ کر رہا تھا۔ پتا سے کہا۔ ''آپ لوگ چلیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ چلے گئے۔ میں تنہا اس ہیبت ناک مقام پر موجود رہا۔ میرے سامنے پشپا کی چتا جل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی چتائیں اس جگہ جلی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی چتائیں جلتی دیکھی تھیں۔ مگر میری پتنی کی چتا اس طرح نہیں جل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آگ میری پتنی کو جلانا نہیں چاہتی تھی۔

تیز ہوا سے جھاڑیوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی اس سے خوف آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گردونواح میں بہت ساری آتمائیں بے چین پھر رہی ہوں۔ میرا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا رو رہا تھا۔ شدید سردی کے علاوہ جو دوسری پریشانی مجھے لاحق تھی وہ یہ کہ چتا کی آگ ہوا کے جھونکوں سے بھڑکنے کی بجائے بجھتی جارہی تھی۔

میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے کی جھاڑیوں میں مجھے ایک سایہ دکھائی دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس سائے پر مرکوز کردیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ اگر میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت کرنا بھی چاہتا تو نہ کرسکتا تھا۔

وہ سایہ آہستہ آہستہ چتا کی جانب بڑھنے لگا۔ جونہی وہ چتا کے قریب پہنچا تو چتا کی آگ کی روشنی میں اسے دیکھا۔ ایسے لگا جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ وہی جوگی تھا جو دن کو ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے پشپا کے چہرے پر گندم کے دانے مارے تھے۔ وہ پوری فلم میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

جوگی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر منتر پڑھنے کے بعد اس نے چتا کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے شروع کردیئے۔ اس کے کشکول میں کچھ دانے تھے جن کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چتا پر پھینکتا جارہا تھا۔ چتا کی آگ پہلے بھی صحیح طریقے سے نہیں جل رہی تھی۔ اب جوگی کے منتر نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ اب آگ مکمل طور پر بجھ چکی تھی۔ جوگی کے منہ سے غیر مبہم سی آوازیں مسلسل نکل رہی تھیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میرے دل میں خوف کی شدت میں بھی کمی آرہی تھی۔

جب آگ اچھی طرح بجھ گئی تو جوگی نے اپنا کشکول زمین پر رکھ دیا اور چتا کی لکڑیوں کو ہٹانا شروع کردیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ پشپا کی لاش تک آگ پہنچی تھی یا نہیں کیونکہ اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ اس نے پشپا کی لاش کو اٹھا کر چتا کے ساتھ زمین پر رکھ دیا اور خود لاش کے سر کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر وہی غیر مبہم سی آوازیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر جوگی نے اٹھ کر پانی کی طرح کا کوئی محلول پشپا کی لاش پر پھینکنا شروع کیا۔

شاہ صاحب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کو میں مرتے دم تک فراموش نہ کرسکوں گا۔

میرے سامنے پڑی ہوئی پشپا کی لاش نے حرکت کی۔ پھر جوگی نے اسے ایسے اٹھایا جیسے کوئی کسی کو سوتے میں جگاتا ہے۔ پشپا اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔

میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رک گئی۔ میرا دماغ ماؤف ہوچکا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ یہ کیا ہے کہ جوگی ایک طرف چل پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے پشپا اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی سدھایا ہوا جانور اپنے مالک کے پیچھے چلتا ہے۔

کچھ دیر تو میں وہاں شمشان بھومی میں بیٹھا رہا۔ میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ شمشان بھومی سے تھوڑی دور راستے کے ساتھ چند مسلمان کسانوں کے گھر تھے۔ ان لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ راستے کے بالکل ساتھ والا گھر شمشاد خان کا تھا۔ جب جوگی ان مسلمان کسانوں کے گھروں کے پاس سے گزرنے لگا تو میری نگاہ ایک کسان پڑی جو اس بلا کی سردی میں لالٹین لے کر مویشیوں کے باڑے میں نہ جانے کیا کررہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کوئی قوت بیدار ہوگئی ہو۔ میں نے پورے زور سے چیخنا شروع کردیا۔ جتنا شور مچا سکتا تھا مچایا اور ساتھ ہی جست لگا کر پشپا کو پکڑلیا۔

جونہی میں نے پشپا کو چھوا تو وہ ایک بے جان مجسمے کی طرح زمین پر گر پڑی۔ چند کسان لاٹھیاں لے

کر دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ شمشاد خان آگے آگے تھا۔اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں چارپائی پر پڑا تھا۔ حکیم امجد علی میرے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ رشتہ دار ہمارے گھر میں جمع تھے۔ سب سے پہلے میں نے پشپا کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں ہے اور ہوش میں آ چکی ہے۔

شمشان بھومی کے باہر جب میں چیختے چیختے بے ہوش ہوگیا تھا تو شمشاد خان اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اور پشپا کو اٹھا کر ہمارے گھر لے آئے تھے۔ جہاں میں اور پشپا کچھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آ گئے تھے۔ اس جوگی کا کسی کو پتہ نہ چلا کہ کدھر غائب ہوگیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے تمام حالات تفصیل سے بیان کئے۔ تمام لوگ حیران رہ گئے۔ اگر وہ میری کہانی پر یقین نہ بھی کرتے تو کیا کرتے کیونکہ ان میں سے بہت سارے لوگ ایسے موجود تھے جن کے سامنے پشپا مری تھی اور انہوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔

شاہ صاحب! آپ یہ سن کر اور زیادہ حیران ہوں گے کہ پشپا نے اس کہانی پر بالکل یقین نہ کیا۔ وہ کہنے لگی کہ ''اسے اتنا ہی یاد ہے کہ جوگی ہمارے دروازے پر آیا تو وہ اس کے پاس گئی۔ جوگی نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ اس کو اپنے اندر بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں پھر جوگی نے گندم کے چند دانے کشکول سے اٹھا کر اس کے منہ پر مارے اور وہ چلا گیا۔ اس کے بعد پشپا کے پیٹ میں درد اٹھا جو بڑھتا ہی گیا۔'' پشپا نے کہا کہ ''اسے یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اسے دوائی دی تھی اور پھر وہ سوگئی یا بے ہوش ہوگئی تھی۔'' پشپا نے کہا۔ ''اسے ہوش آیا تو وہ گھر میں اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہیں۔''

آپ یقین کریں! یہ واقعہ بالکل سچا تھا اور اس کے بہت سارے عینی گواہ اب بھی زندہ ہیں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں۔ ان کے نام میں بتا دیتا ہوں۔ ان کو بلوا کر تصدیق کر لیں۔''

''پشپا اور تمہارا پھر کتنے عرصے کا ساتھ رہا؟'' میں نے سکھدیو سے پوچھا۔

''ہم دونوں تقریباً چالیس برس اکٹھے رہے۔''

چند لمحے اس نے خلاء میں گھورنے کے بعد کہا۔ ''اس کے بطن سے میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان چالیس برسوں میں، میں نے کئی بار اس سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا مگر ہر بار اس کا یہی جواب تھا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' مرنے سے تین چار دن قبل اس کو ٹھنڈ لگ گئی اور تیز بخار ہوگیا۔ یہی بخار اس کی موت کا باعث بن گیا۔

'' اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والے کئی لوگ ایسے بھی تھے جو چالیس برس پہلے بھی پشپا کی ان رسومات میں شرکت کر چکے تھے۔ اس بار بھی چتا کو میں نے آگ لگائی۔ اب کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا آگ نے پشپا کو جلا کر راکھ کر دیا۔''

سکھدیو نے مزید بتایا کہ ''پشپا کی خواہش تھی کہ اس کے پھول ہردوارے جا کر گنگا میں بہائے جائیں۔'' چنانچہ وہ اس کے پھول (ہڈیاں) لے جا رہا تھا تو مجھ سے ٹرین میں اس کی ملاقات ہوئی۔

بوڑھے سکھدیو کی یہ حیران کن کہانی میں نے سن لی اور وہ چلا گیا۔ میں خاصی دیر سوچتا رہا، کیا ایسا ممکن ہے؟ یہ کہانی میں کبھی فراموش نہ کر سکا۔ ایک دفعہ سکھدیو کے گاؤں کا ایک جہاندیدہ شخص مجھے مل گیا۔ اس کہانی کے متعلق اس سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب!'' اس شخص نے کہا۔ ''واقعی ہمارے گاؤں میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ سکھدیو نامی شخص کی پتنی کو سکتہ ہوگیا تھا۔ لوگ سمجھے وہ مرگئی ہے۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی پھر ایک جوگی نے منتر پڑھا اور وہ پھر ہوش میں آ گئی۔''



"نن...... نہیں...... نہیں......!" میں دہشت کی شدت سے گھگھیانے لگا۔

"ڈرو مت میری جان......" اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے باغ میں تم نے میرے بدن سے اپنے دل کی پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی۔ تب تمہیں ڈر محسوس نہیں ہوا تھا اور اب کیوں مجھ سے خوفزدہ ہو......"

"تت...... تم۔ تم چڑیل ہو......" میں نے بہ مشکل کہا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

"بہت خوب۔ اب میں تمہیں چڑیل نظر آتی ہوں۔" اس نے طنزیہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "ٹرین میں تو تم مجھ پر لٹو ہو رہے تھے، میرے بدن کی رعنائیوں سے اپنی آنکھیں سینک رہے تھے۔ آؤ مجھ سے لپٹ جاؤ ڈیئر......"

اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ مگر میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ خوف سے میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔

"تم میری پیاس بجھائے بغیر نہیں جا سکتے ناصر۔ اگر میں نے تمہارا گاڑھا اور سرخ خون نہ پیا تو ہمیشہ کے لئے مر جاؤں گی۔" وہ بولتی ہوئی میرے قریب آتی چلی گئی۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا کنویں کی دیوار سے جا لگا۔

"میں سو برس سے صرف تازہ اور گرم خون پر زندہ ہوں ناصر ڈیئر......" اس نے رکے بغیر کہا اور میرے بالکل قریب پہنچ گئی۔

میں دیوار سے لگا دہشت سے کانپ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بھیانک موت رقص کر رہی تھی۔ اس چڑیل سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ اس نے میرے سامنے رک کر اپنے تیز ناخنوں والے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھائے تو میں نے آخری چارے کے طور پر ایک دم اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ مگر فوراً ہی درد سے میری چیخ نکل گئی۔ میرا پاؤں ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا اور میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور ادھر ادھر دیکھا تو ماحول بدل چکا تھا۔ میں باغ میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں نیلوفر مجھے چھوڑ کر اپنے گھر گئی تھی۔

اسی لمحے مجھے ٹرین کا وسل سنائی دیا تو میں بوکھلا کر پلٹا اور ریلوے لائن کی طرف دوڑنے لگا۔ باغ سے نکل کر میں ریلوے لائن کے قریب پہنچا تو سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا اور ٹرین حرکت میں آ کر سست رفتاری سے حرکت کر رہی تھی۔ میں فوراً دوڑ کر رینگتی ہوئی ٹرین کی طرف بڑھا اور گارڈ روم میں سوار ہو کر ہانپتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین کی رفتار بڑھتی گئی اور اگلا اسٹیشن قریب آنے لگا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مجھ پر جو گزری تھی وہ حقیقت تھی یا کوئی خواب......؟

میں نے برتھ کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں نہ نیلوفر کا برقع تھا اور نہ ہی اس کا بیگ نظر آ رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ واقعی نیلوفر کی شکل میں ایک چڑیل نے مجھے شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھ سے پہلا گارڈ چونکہ ادھیڑ عمر بوڑھا تھا۔ اس لئے چڑیل کبھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور چونکہ وہ چڑیل صرف جوان خون پینے کی عادی تھی۔ اس لئے اس نے مجھے اپنے حسن و جوانی کے جال میں پھنسایا اور غلط بیانی کر کے باغ کے درختوں میں لے گئی تھی لیکن میں اس پر حملہ کر کے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ آپ بھی غور کریں کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا واقعی، میں ایک چڑیل کا شکار ہونے سے بال بال بچا تھا۔

بہرحال میں اس واقعہ سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ منزل پر پہنچتے پہنچتے میں تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے روز میں واپس ٹرین کے ساتھ ملتان پہنچا اور آفس سے بیماری کی رخصت لے لی۔ تیسرے دن میری طبیعت سنبھل گئی تو میں نے والد صاحب کی سفارش سے اپنی ڈیوٹی تبدیل کرالی اور تھل ایکسپریس کے بجائے مین لائن پر چلنے والی تیز رو ایکسپریس میں بطور گارڈ فرائض انجام دینے لگا۔ لیکن وہ خوفناک واقعہ آج تک مجھے یاد ہے۔





سمادھی کا بھوت

ایس امتیاز احمد۔کراچی

انتظار کی گھڑیاں بہت کٹھن ہوتی ہیں اور یہ حقیقت اس کہانی میں پنہاں ہے، مرنے کے بعد بھی انتظار کرنے والے کی روح ایک مقررہ وقت پر اپنے مطلوبہ وجود کا انتظار کرتی رہتی تھی اور پھر آخر کار......

خودغرضی اور ہوس پرستی کے گرداب میں ڈولتی ہوئی دل شکستہ اور دل فگار کہانی

میری طبیعت آج بہت بے چین تھی۔ میں ... شب خوابی کے لباس میں تھا مجھے سنیل کے خط کا ... رتھا۔ ہر چند اپنا دل دوسرے کاموں میں لگانا چاہتا تھا ... چمپا کی یاد کچھ نہ کرنے دیتی۔ میری سب امیدیں ... یل کے خط سے وابستہ تھیں...... میں اپنی زندگی کی ... منزلیں طے کر چکا تھا۔ اب تک کسی عورت نے ... رے دل پر قبضہ نہ کیا تھا۔ عشق و محبت میرے نزدیک بالکل لغو اور بے معنی الفاظ تھے۔ لیکن آہ برا ہو سنیل کا جو مجھے شکار کی غرض سے کرپاچو پارہ ایک پہاڑی گاؤں میں اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ جہاں میں اپنے دیہاتی میزبان رام شنکر کی لڑکی چمپا کے تیر نگاہوں کا خود ہی شکار ہو گیا۔

چمپا بحرِ حسن کا انمول موتی تھی۔ وہ اس وقت سترہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی مگر اپنے حسن و شباب سے قطعاً بے

خبر چمپا اپنے پتا کی توجہ سے علم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ اسی تعلیم کے اثر سے وہ دیہاتی لڑکیوں سے بالکل جداگانہ طبیعت کی مالک تھی۔ میں نے سنیل کے ذریعے رام شنکر کو رشتے کا پیغام دیا جو اس نے نامنظور کردیا۔ تاہم سنیل کے خطوط مجھے برابر آتے رہے اس کا خیال تھا کہ رام شنکر ایک شہری امیر زادے کو رشتہ دیتے ہچکچاتا ہے لیکن عنقریب ہی وہ رضامند ہوجائے گا۔

آج کئی دن سے سنیل کا خط نہ آیا تھا۔ اسی وجہ سے میں مضطرب تھا۔ بارہ بجے کے قریب ملازم ایک لفافہ لایا۔ میرے دل کا کنول کھل گیا۔ مگر خط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سنیل کا خط نہ تھا بلکہ میرے ایک دوست آکاش کی طرف سے دعوتی رقعہ تھا۔ اس نے رات کو مجھے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

آکاش کی کوٹھی میری کوٹھی سے ملحق تھی۔ وہ کوئی نوے سال کا بوڑھا آدمی تھا لیکن کاٹھی اچھی پائی تھی۔ اسے یہاں آباد ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے اسی حالت میں دیکھا باوجود اس دیرینہ ہمسائیگی کے ہمارا آپس میں میل جول نہ تھا۔ یوں تو بارہا پھاٹک سے گزرتے وقت میرا اس کا سامنا ہوتا مگر معمولی خیر خیریت کے سوائے اس نے کبھی مجھے بات چیت کا موقع نہ دیا تھا۔

آکاش بہت بدمزاج، چڑچڑا اور سخت گیر آدمی تھا۔ اس کو آج تک کسی نے ہنستے نہ دیکھا تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے، اس کو مغرور کہتے تھے۔ آج اس کی طرف سے دعوتی رقعہ پاکر مجھے سخت تعجب ہوا۔ آکاش اور دعوت انہونی بات معلوم ہوتی تھی۔

رات میں وقت مقررہ پر میں آکاش کے یہاں پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر میرا استقبال کیا۔ اس کی خشونت اور سخت گیری دور ہوچکی تھی اور وہ حسن اخلاق کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے لائبریری میں لے گیا جہاں تین اور مہمان بھی تھے ان مہمانوں کو دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

یہ رام شنکر اور اس کی لڑکی چمپا تھے تیسرا مہمان روی تھا جو آکاش کا مشیر قانونی تھا۔ یہ لوگ ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے وہ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اس ملاقات کو کچھ پراسرار خیال کرتے ہوئے میں کھنکا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"روی کچھ لکھ رہا تھا۔ میرے دل میں سینکڑوں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد روی اپنے کام سے فارغ ہوا اور کاغذ میری طرف سرکا کر کہنے لگا۔

"آکاش کی خواہش ہے کہ آپ ان کی وصیت پر بطور گواہ کے دستخط کریں۔"

وصیت کا مضمون پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ آکاش اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ جس کی مالیت دس لاکھ روپے ہے چمپا کے نام اس شرط پر وصیت کرتا ہے کہ وہ تمام عمر کنواری رہے ورنہ بصورت دیگر یہ تمام جائیداد یتیم خانوں کو ملے دوسرا وہ اقرار نامہ تھا چمپا کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

نفس مضمون سے آگاہ ہوکر یاس واندوہ سے میرا دل بیٹھنے لگا میں نے دستخط تو کردیئے لیکن میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میری تمام آرزوؤں کا خون ہوچکا تھا۔ وہ تمام ہوائی قلعے جو میں نے تیار کر رکھے چشم زدن میں مسمار ہوگئے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ تاہم حوصلہ کرکے بیٹھا رہا۔

یہ کام ختم کرکے آکاش ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ میز انواع واقسام کی نعمتوں سے پر تھا مگر مجھ سے ایک لقمہ بھی نہ اٹھایا گیا آکاش میری حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کررہا تھا۔

کھانے کے بعد روی رخصت ہوا رام شنکر اور چمپا اپنے اپنے مخصوص کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ ایک میں تھا کہ نقش پا کی طرح جوں کا توں جما رہا۔ میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ آخر آکاش نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "ونود!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ متانت سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے تم کس خیال میں ہو اور! یہ سب

کچھ میں نے مظلوم چمپا کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو میں تم پر ظاہر کردینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے رام شنکر کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ چمپا سے شادی کے خواہش مند ہو......" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

آکاش کہنے لگا۔ "بچپن میں مجھے اپنی پھوپھی کی لڑکی سے محبت تھی۔ اس لڑکی کا نام چمپا تھا۔ میرا پھوپھا جاگیردار تھا میری پھوپھی سے اس کی دوسری شادی تھی۔ اس کی پہلی بیوی سے بہت سی اولاد تھی مگر میری پھوپھی کے صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ میرے ماتا پتا سورگ باش ہوچکے تھے۔ پھوپھی نے ہی میری پرورش کی تھی۔

چمپا امیر آدمی کی لڑکی تھی اور میں ایک یتیم لڑکا لیکن آہ! محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں اس پر پروانہ وار فدا تھا۔ 1864ء میں جب کہ میں اٹھارہ سالہ نوجوان تھا میرے پھوپھا کا انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کے بعد پھوپھی کے ساتھ سوتیلی اولاد نے بہت برا سلوک کیا۔ چونکہ ان کو میرا بھی وہاں رہنا سخت ناگوار تھا اس لئے میرے متعلق چمپا پر تہمتیں تراشنے لگے۔

پھوپھی نہایت صابر تھی۔ ان کے سب ظلم وستم سہتی رہتی مگر چمپا کے ساتھ ان کا حقارت آمیز سلوک برداشت نہ کرسکی اور گھر کو خیر باد کہہ دیا۔ پھوپھی نے اپنے زیورات بیچ کر ہری پور کے علاقہ میں موضوع کھوڑ کے قریب کچھ اراضی خرید لی۔ ہم لوگ وہیں جھونپڑی بنا کر رہنے لگے اور اب اس اراضی کی کاشت پر ہمارا گزارا تھا۔

چمپا مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی جو چند سال میں ایک مکمل عورت بن گئی۔ پھوپھی کو چمپا کی بہت فکر تھی۔ ایک دن وہ تنہائی میں مجھ سے کہنے لگی۔

آکاش تم دیکھتے ہو۔ میری صحت روز بروز گر رہی ہے۔ تم جوان آدمی ہو اگر ہمت کرو گے تو ہماری مشکلیں آسان ہوسکتی ہیں۔

پھر میرے حلفیہ اقرار پر کہنے لگی۔

ہری پور میں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ اس کا پتی ایک کمپنی کا حصہ دار ہے۔ یہ کمپنی مصر میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام کرتی ہے اگر تم مصر جا کر روپیہ کما لاؤ تو تمہارے ساتھ چمپا کا نکاح کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔

پھوپھی کے ارادے سے آگاہ ہوکر ایک مسرت کی لہر میری رگوں میں دوڑ گئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہمارے علاقے میں کوئی ریل گاڑی کا نام نہ جانتا تھا اور دس بیس میل بھی اکیلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مصر جانا گویا قطب شمالی کی مہم پر جانے کے برابر تھے۔ لیکن چمپا سے وابستہ ہونے کے لئے مصر کا سفر کوئی سفر نہ تھا۔

میری مستعدی دیکھ کر پھوپھی بہت خوش ہوئی۔ اسی دن پھوپھی نے مجھے تین سو روپیہ نقد اور ایک طلائی زنجیر دی۔ یہ روپیہ اور زنجیر میری ماں نے مرتے وقت پھوپھی کے پاس امانت رکھے تھے تاکہ میں بڑا ہوکر کسی ضرورت کے وقت کام میں لاسکوں۔ یہ زنجیر بہت بیش قیمت تھی۔ اس کے درمیان ایک سورج مکھی کا پھول بنا ہوا تھا جس پر قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے نکلا تو چمپا نہایت مغموم چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی صورت پر حسرت برس رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری جدائی کے غم نے اسے نڈھال کر رکھا ہے۔ میں بھی چپ چاپ اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے محبت کے چشمے ابل رہے تھے۔ آہ! اگر میرے پاس دنیا بھر کی دولت ہوتی تو ان غم آلود نگاہوں پر تصدق کردیتا مگر میرے پاس اس وقت سوائے ایک پرمحبت دل کے اور کوئی چیز نہ تھی جو میں بارگاہ حسن میں پیش کرسکتا۔

اپنی ناداری اور مجبوری کو محسوس کرکے میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میری آنکھیں بار ندامت سے جھک گئیں یکایک مجھے اس زنجیر کا خیال آیا جو میری ماں کی نشانی تھی۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا اور زنجیر لاکر چمپا کے گلے میں ڈال دی اور کہا۔

چمپا یہ ایک مسافر کی نشانی ہے۔ اس کو اپنی سگائی کا

تحفہ سمجھ کر اپنے گلے سے جدا نہ کرنا۔" چمپا نے وعدہ کیا کہ وہ اس زنجیر کو اپنی جان کے ساتھ رکھے گی۔

اسی دن ہم لوگ ہری پور گئے۔ جہاں پھوپھی نے مجھے اپنی سہیلی کے پتی کے سپرد کیا۔ اور چند دنوں میں اپنے سرپرست کی معیت میں مصر کی مہم پر روانہ ہوگیا۔

مجھے ساتھ لے جانے والا بہت مہربان اور نیک آدمی تھا۔ چھ مہینے تک میں اس کے پاس بطور ملازم کام کرتا رہا۔ مگر بعد میں اس نے مجھے ہر طرح قابل اور محنتی پا کر حصہ دار بنالیا۔ قسمت یاور تھی۔ میں خوب روپیہ کمانے لگا۔ ان دنوں ڈاک کا سلسلہ بھی محدود تھا اس لئے کبھی کبھی مجھے پھوپھی کا خط ملا کرتا۔ جس میں وہ میری کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتی۔

تین سال بعد چمپا کے ایک خط سے مجھے پھوپھی کے انتقال کی اطلاع ملی۔ چمپا نے لکھا تھا کہ میں گھبرا کر جلدی آنے کی کوشش نہ کروں کیوں کہ اس نے اپنی بوڑھی اماں کو اپنے پاس بلالیا تھا جو سگی ماں کی طرح اس کی حفاظت کررہی تھی۔

☆☆☆

میں اپنا کام برابر سرگرمی سے کرتا رہا حتیٰ کہ وہ دن بھی آ پہنچا کہ ہم اپنے وطن کو واپس لوٹے۔ گردش کے ایام گزر چکے تھے۔ میں اس وقت دو لاکھ روپے کا واحد مالک تھا۔ اپنی شاندار زندگی کے دلآویز نظارے میرے پیش نظر تھے خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا میری منتظر تھی۔ میں چمپا کو آغوش میں لینے کے لئے بے قرار تھا...... اس زمانہ میں بحری سفر بے حد خطرناک ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ خیر تمام سفری صعوبتوں کے بعد ہم لوگ اپنے شہر پہنچے۔ یہاں میں نے چمپا کے لئے قیمتی زیور اور خوبصورت کپڑے خریدے اور ہزاروں آرزوئیں دل میں لئے گھر کو روانہ ہوا۔ ان دنوں ریل گاڑی صرف لاہور تک آتی تھی اور باقی سفر تانگے اور رتھوں کے ذریعہ طے کیا جاتا تھا۔ جب میں سفر کی صعوبتیں سہتا ہوا ہری پور پہنچا تو معلوم ہوا کہ تمام علاقے میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ ہزار ہا جوان بوڑھے اور بچے اس وبا کی نذر ہوگئے۔ اس خبر سے میرا دل بجھ گیا۔ مجھے چمپا کی فکر ہوئی جس کی خیریت کی خبر مجھے اک عرصہ سے نہ ملی تھی۔

گو میرا گھر یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا مگر میں نے ہری پور میں گھڑی بھر دم نہ لیا اور وہاں سے چل دیا۔ راستے میں جو گاؤں ملتا سنسان تھا۔ گلی کوچے اجاڑ، کنوئیں جن پر پانی بھرنے والی پری وشوں کے جھرمٹ ہوتے تھے بالکل ویران پڑے تھے۔ جہاں پر امیروں کی محفل جما کرتی تھی اور بانکے کڑیل نوجوان خوش گپیاں ہانکا کرتے تھے قبرستان کی طرح خاموش تھے۔ اس تباہی و بربادی پر میں کانپ اٹھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں چمپا بھی اس وبا کی نذر نہ ہوگئی ہو۔

ساون کا مہینہ تھا۔ اس سال برسات اس کثرت سے ہوئی تھی کہ کھیت اور میدان دریا بن رہے تھے۔ جس طرف نگاہ اٹھتی سوائے عالم آب کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وبا پھیلنے کی بھی یہی وجہ تھی کنوؤں کا پانی خراب اور ہوا زہریلی ہوچکی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا ایک خاص قسم کی بھڑاس کھیتوں سے نکل کر فضا کو گندہ کررہی تھی جس سے خود بخود طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے دور سے اپنی جھونپڑی دکھائی دی۔ اس کا دروازہ بند دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگے۔ مگر ساتھ ہی میری نظر بڑ کے تناور درخت پر پڑی۔ اس کے نیچے کوئی چارپائی پر سو رہا تھا۔ یہ چمپا تھی۔

میں والہانہ اشتیاق سے آگے بڑھا۔ وہ اس ویرانے میں بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی دراز مشکیں بال چارپائی سے نیچے گر رہے تھے۔ وہ سفید ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی اس کا دلکش چہرہ اترا ہوا تھا۔ جس سے یاس و حرماں کے علامات ہویدا تھے۔ عالم خواب میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کے سینے سے ایک ڈیڑھ دو سالہ بچہ لپٹا ہوا تھا۔

میں پرمحبت نگاہوں سے اس کے زاہد فریب حسن کا نظارہ کرنے لگا لیکن جوں ہی میری نظر اس کے بچے پڑی میں دھک سے رہ گیا اس بچے کی شکل ہو بہو جیسی تھی۔ ذہنی اضطراب سے میرا دل پھٹنے لگا۔ "آہ

نے مجھ سے بے وفائی کی۔" یہ خیال اتنا اشتعال انگیز تھا کہ غیرت سے میرا خون کھولنے لگا۔ میرے نزدیک چمپا ایک فاحشہ عورت تھی۔ میں حالت غیظ میں زمین پر پاؤں پٹخنے لگا۔

دفعتاً میرا پاؤں اس کی لٹکی ہوئی زلفوں سے الجھا جس کی تکلیف سے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ مجھے دیکھ کر ایک خوشی کی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اپنے غمگین چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تعظیم کو اٹھی۔

اس کی ڈھٹائی پر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

"چمپا بچہ کس کا ہے؟"

وہ نہایت طمانیت سے بولی۔ "اب میرا ہی سمجھئے!"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ ہے تو تمہارا ہی بچہ مگر اس کا باپ کہاں ہے؟"

وہ کہنے لگی۔ "میں اس کی بابت کچھ نہیں جانتی۔ شاید وہ کوئی مسافر تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بچہ گود میں لے لیا۔ جواب رو رہا تھا۔ بچے کو اس کی گود میں دیکھ کر مجھے تاب نہ رہی، میں نے کڑک کر کہا۔ "بے حیا لڑکی! تو نے خاندان بھر کی ناک کاٹ ڈالی۔ تجھ پر اور تیرے آشنا پر جس کا تو نے بچہ جنا ہے ابدی لعنت ہو۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپ گئی اور سسکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"آہ کاش خدا کے لئے یہ شرمناک الزام مجھ پر نہ لگاؤ یہ بچہ تو مجھے کل ہی ملا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے اس کو دیکھا تک نہ تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہمارے علاقے میں سخت وبا پھیلی ہوئی ہے۔ تمام علاقہ تباہ و برباد ہو گیا ہے چنانچہ میری اماں بھی جس کو میں نے اپنے پاس بلا لیا تھا اسی وبا کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اب میں یہاں تنہا تھی اس بیابان کے خوفناک سناٹے میں میرا دل سخت گھبرا رہا تھا اس لئے میں قریب و جوار کے گاؤں میں جا کر وبا زدہ لوگوں کی خدمت کرنے گئی۔

کل میں تمام دن مریضوں کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ رات کو جب میں وہاں سے واپس آ رہی تھی تو راستے میں بارش نے آ لیا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے خوفزدہ ہو کر میں نے بھاگنا شروع کیا لیکن جب موضع کھوڑ کے قریب پہنچی تو بارش بڑے زور و شور سے ہونے لگی اور مجھے اس کی یورش سے بچنے کے لئے اس اجاڑ بستی کے ایک تاریک گھر میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس تاریک اور ہولناک فضا میں پریشان روحیں منڈلاتی معلوم ہوتی تھیں ہر طرف موت کا تسلط تھا قریب کے ایک گھر سے باد و باراں کے طوفان میں ملی جلی انسانی آہ و بکا کی آواز آ رہی تھی جس نے میرے خوف و ہراس میں مزید اضافہ کیا۔ میں آنکھیں بند کر کے دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔

بارش تھم کر مطلع صاف ہوا تو میں اس ڈراؤنے گھر سے باہر نکلی۔ ابھی تک کسی بدنصیب کی آہ و زاری ختم نہ ہوئی تھی اس لئے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ ایک دکھی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ چنانچہ میں اس ماتم کدہ کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی اندر ایک کونے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ سامنے ایک عورت کی لاش پڑی تھی جس کے پاس ایک بوڑھا آدمی اس بچے کو گود میں لئے دردناک بین کر رہا تھا۔ یہ شخص انتہائی صدمہ سے پاگل ہو رہا تھا اور عالم دیوانگی میں کہہ رہا تھا۔ "ستیہ بالا۔ ستیہ بالا، میں نے ظلم تم پر کیا تھا، مجھ سے قدرت اس کا انتقام لے رہی ہے۔ میں نے تمہارا ایک بچہ چھینا تھا جس کے عوض پر ماتما نے مجھ سے کئی بچے چھینے۔ اور اب یہ میرا آخری بچہ ہے جسے میں نے بڑی منتوں اور آرزوؤں سے پایا تھا میرے سامنے بلک رہا ہے۔"

آہ! یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اے مظلوم ستیہ بالا میں تجھے کہاں تلاش کروں۔ تیری آتما امن و سکون کی غیر فانی دنیا میں پرواز کر رہی ہوگی۔ تمہیں کیا غرض کہ ایک بدعہد اور بد طینت کی گریہ و زاری سنو گر نہیں! ستیہ بالا! بہت رحم دل تھی۔ وہ مجھے معاف کر دے

گی اور اس بے ماں کے بچے کو اس بچے کے عوض جو میں نے اس سے چھینا تھا لے کر میرے بارِ غم کو ہلکا کر دے گی۔'' پھر وہ لگاتار ستیہ بالا ستیہ بالا، کہہ کر چلانے لگا۔

اس بوڑھے کی حالت پر مجھے بہت رحم آیا۔ میں اس کی دلجوئی کے لئے اندر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر بوڑھے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا۔

''اوہ! اے نیک ستیہ بالا کی آتما۔ آخر تمہیں میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ افسوس میں نے تمہاری قدر نہ کی۔'' میں نے کہا۔

''میں ستیہ بالا نہیں ہوں، میرا نام چمپا ہے اور تمہارا واویلا سن کر آئی ہوں۔''

''نہیں نہیں! میری نگاہ کبھی غلطی نہیں کرتی، تم اسی کی آتما ہو۔ پرماتما کے لئے میرے سب گناہ معاف کر دو۔ نیک آتمائیں کسی سے دشمنی نہیں رکھتی اور اس بچے کو لے جاؤ۔ یہ بچہ بالکل تمہارے بچے کا ہمشکل اور اسی عمر کا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے بچہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس مظلوم کا دم توڑنا پسند نہ کیا اور بچے کو گود میں اٹھا کر گھر چلی آئی۔

میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس بچے کی شکل گواہی دے رہی ہے کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔''

وہ لرز کر کہنے لگی۔

''آہ! آ کاش یہ بالکل اتفاق کی بات ہے ورنہ میں ہرگز نہیں جانتی کہ یہ بدنصیب بچہ کس کا ہے۔''

میں کڑے تیوروں سے چمپا کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک میری نظر اس کے گلے پر پڑی۔ میری دی ہوئی زنجیر اس کے گلے میں موجود نہ تھی۔ میں نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم سچی ہو تو میری دی ہوئی زنجیر گلے میں کیوں نہیں؟''

یہ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بدحواسی سے گلے پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر نہ پا کر تھراتے ہوئے میرے پاؤں پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ میں نے حقارت سے اس کے سر کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے دے پٹکا اور وہاں سے چلا آیا۔

میں چند سال ہری پور میں مقیم رہا مگر بعد میں آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں میں نے بہت سی زمین خرید لی اور باقی روپیہ تجارت میں لگا دیا۔ اس واقعہ سے میرا مزاج سخت چڑچڑا ہو گیا اور خصوصاً عورتوں، بچوں سے مجھے سخت نفرت ہو گئی۔

☆☆☆

اس شکستہ دلی کی حالت میں، میں نے ساٹھ سال گزار دیئے۔ لیکن آج سے چند ماہ پیشتر مجھ پر ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا جس نے میری زندگی کو بالکل بدل دیا۔

گزشتہ مارچ کو مجھے ایک دلال سے اطلاع ملی کہ موضع نور پور کے قریب ایک بیوہ کی بہت سی زمین فروخت ہونے کو ہے مجھے وہاں زمین کی ضرورت تھی اس لئے میں نے فوراً وہ زمین خرید لی۔ موضع نور پور ایک نہایت خوشحال گاؤں ہے جو ایک سرسبز و شاداب خطہ میں واقع ہے۔

بہار کا موسم تھا، کھیتوں اور میدانوں کی گود سبزے سے بھری ہوئی تھی۔ نونہالان چمن کی دھانی پوشاک آنکھوں میں سماتی جا رہی تھی۔ خوشبودار پھولوں سے مزین جھاڑیوں پر بلا کا نکھار تھا۔ درختوں پر بہار شان بے نیازی سے کھڑے اپنی عظمت و جلال کا مظاہرہ کر رہے تھے ایک طرف سیال چاندی کی طرح نورانی چشمہ فردوسی گیت گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔

انہی ایام میں ایک دن میں اپنے مزارع کے ہمراہ زمین کی دیکھ بھال کر کے واپس آ رہا تھا۔ شام کافی ہو چکی تھی مگر ایک دھندلا سا اجالا ابھی تک چار سو محیط تھا۔ ایک موڑ کے قریب جہاں شاہراہ سے ایک راستہ گاؤں کی طرف گھومتا تھا، ہمارے گھوڑے رک گئے۔ میرا ساتھی کہنے لگا۔

''یہ سادھو والا موڑ ہے۔ گھوڑے سوار سمیت آگے نہیں بڑھیں گے۔''

میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا "وہاں ایک بھوت رہتا ہے جسے دیکھ کر جانور آگے نہیں بڑھتے۔"

ہم دونوں نیچے اترے، میں نے قدم بڑھایا تو فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش اور دھیمی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میرے ساتھی نے کہا۔

"یہ سرسراہٹ اسی بھوت کے گزرنے سے ہوئی ہے۔"

میں گھر پہنچ کر تمام رات سوچتا رہا کہ یہ کسی جانور کے پاؤں کی سرسراہٹ تھی یا سچ مچ کوئی اسرار تھا۔ دوسرے دن جب میں پھر اپنے ساتھی سمیت وہاں سے گزر رہا تھا تو وہی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے اچھی طرح اردگرد دیکھا لیکن کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دی۔

چنانچہ ایک دن جب کہ میرا ساتھی بیمار تھا۔ میں کھیت پر اکیلا ہی مزدوروں سے کام کرواتا رہا۔ اس دن مجھے کافی دیر ہوگئی۔ میں واپسی پر تنہا تھا۔ اماوس کی آخری راتیں تھیں۔ میں ٹارچ ہاتھ میں لئے اطمینان سے راستہ طے کررہا تھا۔ جب سادھ والے موڑ پر پہنچا تو پھر وہی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں لاپرواہی سے آگے بڑھتا گیا۔

یکایک مجھے قریب سے ایک دلدوز آہ سنائی دی۔ میں ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ میں نے دوبارہ قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے پھر آہ بھری۔ ان آہوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ باوجود انتہائی خوف کے میرے پاؤں زمین سے نہ اٹھ سکے۔

یکایک مجھے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید اور لطیف سا دھواں دکھائی دیا۔ میں عجب سے اس کو دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ وہ دھواں سادھ کی طرف بڑھنے لگا۔ جو دور ایک ویران باغ کی آخری کونے میں بنی ہوئی تھی۔ اس دھوئیں کا حرکت کرنا تھا کہ خودبخود میرے پاؤں کو بھی جنبش ہوئی اور میں بغیر کسی ارادے کے اس طرف چلنے لگا۔ گو خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا تاہم کوئی نامعلوم قوت مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی کہ میں بالکل اس پرانی سادھ کے قریب پہنچ گیا۔

سادھ کی عمارت بوسیدہ اور چاروں طرف سے بند تھی۔ جس کو برگد کے گنجان درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرانے زمانے کی باؤلی تھی جس کی ایک دیوار بالکل اسی سادھ سے ملحق تھی۔ وہ سفید سایہ سادھ سے آگے بڑھ کر باؤلی کے قریب ٹھہر گیا اور پھر آہوں کی آواز آنے لگی۔

یکایک وہ سایہ سیڑھیوں کے ذریعے باؤلی میں اترنے لگا۔ میں بھی کسی پراسرار کشش کے ماتحت اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوا۔ شکستہ سیڑھیاں زنگ آلود ہونے کی وجہ سے چکنی ہورہی تھیں۔ ہر قدم پر خطرہ تھا کہ اس زنگ پر سے پھسل کر میں نہ گر جاؤں لیکن دو سو سیڑھیاں اتر کر پانی کے قریب آ گیا۔

یک دم وہ سایہ دیوار کے ساتھ ساتھ باؤلی میں چلنے لگا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو باؤلی کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی روش بنی ہوئی تھی۔ جس پر ایک آدمی بمشکل چل سکتا تھا اب چونکہ میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ بادل نخواستہ اس سایہ کے پیچھے روش پر چلنے لگا۔ روش کے اختتام پر وہ سایہ غائب ہوگیا۔ میں نے سامنے والی دیوار پر روشنی ڈالی تو ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا جو کسی زمانے میں اینٹوں کے جھرنے بنا کر چن دیا گیا تھا مگر اب اینٹیں پانی کی نمی کی وجہ سے گل کر گر گئی تھیں اور دروازے میں شگاف ہوگیا تھا۔

میں دروازے کے اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا سا تکون کمرہ تھا جس کی ہوا کثیف اور بدبودار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میں اس وقت پرانی سادھ کے نیچے تہ خانے میں کھڑا ہوں جس کی سیاہ اور کائی آلود بالائی منزل برگد کے درختوں میں محصور ہے۔

سامنے کی دیوار میں ایک بالکل چھوٹی سی کھڑکی تھی، نہ جانے کس طرح وہ کھڑکی کھول کر میں اندر گھس گیا۔ ٹارچ کی روشنی جب اس وسیع کمرے میں پڑی تو میرا خون خشک ہوگیا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ گو ٹارچ میرے ہاتھ سے گر گیا تھا تاہم اس کی روشنی کمرے میں اجالا کررہی تھی۔ میں نے قریب کی دیوار کا سہارا لیا اور

شدت خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔
دفعتاً مجھے آہوں کی آواز سنائی دی۔
ان آہوں نے میری ڈھارس بندھادی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ کوئی ہمدرد ہستی میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ اٹھا کر اس چیز کو دیکھنے لگا جس کے لئے میں اتنا خوفزدہ ہورہا تھا۔
یہ ایک بڑا سا مربع کمرہ تھا جس کے عین درمیان میں ایک انسانی ڈھانچہ لکڑی کی ٹیک لگائے آسن مارے بیٹھا تھا۔ وہ ڈھانچہ بالکل بدھ مذہب والوں کی طرح اپنے استخوانی ہاتھ اس لکڑی پر ٹیکے عبادت میں محو دکھائی دیتا تھا۔
میں واپس ہونے کو تھا کہ ڈھانچے کی ہڈیوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے پاؤں پھول گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی طرح تہہ خانے میں پڑا تھا مگر اب کمرے میں بجائے اندھیرے کے اجالا تھا۔ سورج کی روشنی ان جھروکوں سے آرہی تھی جو چھت کے قریب باؤلی کی طرف بنے ہوتے تھے۔ میں بھگوان کا نام لے کر اٹھا گو ڈھانچہ اب بھی موجود تھا اور رات والی باتیں بھی سب یاد تھیں لیکن دن کے اجالے میں خوف کسی حد تک دور ہو چکا تھا۔ میں نے دل کڑا کرکے اس ڈھانچے کو دیکھا۔ اس کی استخوانی کمر میں ایک رسی بندھی ہوئی دکھائی دی جس کے ساتھ ایک چھوٹا ساٹین کا ڈبہ لٹک رہا تھا۔
اس ڈبے کو دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی اور میں ڈبے کا راز دریافت کرنے پر تل گیا۔ حالانکہ ڈھانچے کے قریب جاتے ہوئے میری آتما فنا ہوتی تھی، تاہم میں نے جان پر کھیل کر وہ ڈبہ اس رسی سے کھول لیا اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔
اب مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی میں مناسب جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا......
گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اس ڈبے کو کھولا۔ اس کے اندر نیلے رنگ کی دھجی میں کچھ کاغذات بندھے ہوئے تھے، میں نے کاغذوں کو کھولا تو کوئی سنہری سی چمکتی ہوئی چیز زمین پر گر پڑی۔ اس کو دیکھ کر میرا رنگ فق ہوگیا۔ ”آہ! یہ وہی طلائی زنجیر تھی جو میں نے اپنی منگیتر چمپا کو محبت کے تحفے میں دی تھی۔“
اس زنجیر کو دیکھ کر میرا دل بہت غمگین ہوا، میں زنجیر کو پکڑے اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہا تھا کہ میری نظر ان کاغذات پر پڑی جن پر موٹے قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ وہ کسی کی داستان زندگی تھی جس نے میری زندگی میں یکلخت انقلاب پیدا کردیا۔
میرا نام گوکل ہے۔ میں 1816ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ جاگیردار تھا۔ ہماری جاگیر سے ملحق ایک برہمن کی زمین تھی۔ میرا باپ اس برہمن سے ناحق دشمنی رکھتا تھا۔ اور اس کی زمین میں بے جا دخل اندازی کیا کرتا۔ یہ عداوت کئی سال سے چلی آتی تھی۔ اس برہمن کے دو بیٹے تھے جو نہایت خوبصورت اور جوان تھے۔ میرا باپ ان لڑکوں کو دیکھ کر بہت حسد کرتا۔
جب میں اٹھارہ سال کا ہوا تو ایک نہایت اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ اس سال فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ کسان بہت خوش تھے۔ میرا باپ مزدوروں سے کھیت پر کاشت کروا رہا تھا، ادھر برہمن بھی دونوں بیٹوں سمیت اپنا کھیت کاٹنے میں مصروف تھا۔ میرا باپ ان لوگوں پر فقرے کستا رہا۔ بوڑھا برہمن بالکل خاموش تھا لیکن کہاں تک برداشت کرتا۔ تنگ آکر وہ بھی ایک آدھ بات کا جواب دے بیٹھا۔ اس طرح بات طول پکڑ گئی اور دنگا فساد کی نوبت آن پہنچی۔
وہ صرف تین آدمی تھے۔ ادھر ہمارے کئی ملازم میرے باپ کے اشارے پر بے گناہ برہمنوں پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرا باپ گاؤں کا سردار تھا اس لئے بظاہر کسی کو بھی مخالفت

کی جرأت نہ تھی۔ مگر در پردہ وہ بہت سے لوگ ہمارے دشمن ہو گئے۔ بوڑھی برہمنی کی حالت بہت پر درد تھی۔ میرا باپ تو چاہتا تھا کہ اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے مگر وہ اپنی پوتی سمیت راتوں رات غائب ہو گئی۔

اس واقعے کے دو سال بعد میرے باپ کو کسی نے قتل کر دیا۔

میرا چال چلن پہلے سے خراب تھا، باپ کے مرنے کے بعد خوب دل کھول کر عیش و عشرت شروع کر دی۔ اس گناہ آلود زندگی میں سات سال گزر گئے......

میری شادی باپ کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی اور ابھی تک وہ بیچاری میکے میں بیٹھی میری جان کو رو رہی تھی۔ ماں میری آوارگی پر بہت کڑھتی اور ہمیشہ مجھے سمجھا بجھا کر اس کام سے روکنے کی کوشش کرتی۔ مگر مجھ پر اس کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔

میں نے ایک اچھوت عورت کو گھر میں ڈال لیا۔ میری ماں یہ ذلت کیسے گوارا کر سکتی تھی وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی، پہلے میں نے کچھ پرواہ نہ کی لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ ماں کے بغیر گھر کا انتظام اور بزرگوں کی شان نبھانا مشکل ہے۔ ادھر اس اچھوت عورت سے بھی جی بھر گیا تھا اس لئے اب مجھے ماں کو منانے کی فکر ہوئی۔

دوارکا بھومی جہاں میری ننھیال تھی۔ یہاں سے چھبیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ میں نے سامان سفر درست کیا اور باپ کے وقت کے ایک بوڑھے ملازم کو لے کر ماں کے پاس چلا گیا......

ماں کا دل بھی مہر و محبت کا سر چشمہ ہوتا ہے وہ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ میں نے ماں کو گھر لانے کی بہت کوشش کی مگر ماموں نے اجازت نہ دی اس لئے کچھ دن مجھے یہاں ٹھہرنا پڑا...... دوارکا بھومی ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ میرا دل بھی وہاں لگ گیا۔ میں تمام دن اپنے پرانے یار دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں مشغول رہتا۔ یہاں سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک ندی تھی جہاں ہم لوگ اکثر سیر کو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم ندی کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں ہانک رہے تھے ساون کا مہینہ تھا بادل گھرے ہوئے تھے۔ یک دم بارش ہونے لگی۔ میرا ایک دوست کہنے لگا۔ یہاں قریب ہی ایک برہمن کی جھونپڑی ہے چل کر وہاں پناہ لیں۔

ہم لوگ وہاں سے بھاگے تھوڑی دور نیم کے درختوں سے گھرے ہوئے کنج میں ایک جھونپڑی دکھائی دی جھونپڑی کے دروازے پر نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کی نازک کلائیوں پر کانچ کی نہایت کم قیمت چوڑیاں تھیں۔ وہ نہایت غمگین تھی۔ اس کی مدھ بھری آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے جھلک رہے تھے۔ اس کا توبہ شکن حسن و جمال باوجود اس افلاس کے بھی بے پناہ تھا۔ اس کے کندنی چہرے پر شاہانہ رعب و داب تھا۔ میں اس کے حسن سے مرعوب ہو گیا۔

اس لڑکی نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے دوست نے کہا۔ ''ستیہ بالا! بہن آج اتنی پریشان کیوں ہو؟''

وہ بولی۔ ''بھیا کیا بتاؤں، دادی کی صحت روز بروز گر رہی ہے، آج اسے پھر دورے پڑ رہے ہیں۔''

میرے دوست نے مجھے بتایا کہ دونوں دادی پوتی بہت غریب اور شکستہ دل ہیں۔ بوڑھی برہمنی دنیا سے متنفر ہے اس لئے آبادی سے دور رہتی ہے اور نوخیز ستیہ بالا تمام دن کچے سوت سے جنیو تیار کرتی رہتی ہے جنہیں بیچ کر وہ شام کو اپنا اور اپنی دادی کا پیٹ پالتی ہے۔

بارش تھمنے تک ہم لوگ وہیں ٹھہرے اور دفعۃً ازراہ ہمدردی سب نے ایک ایک جنیو اس لڑکی سے خرید لیا۔ گھر پہنچ کر چپ چپ میں بستر پر پڑا رہا۔ اس لڑکی کی صورت میرے دل میں اتر گئی تھی دوسرے دن صبح سویرے میں اکیلا ہی دل بہلانے کی خاطر ندی پر جا پہنچا۔

پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمکتی دمکتی ندی سورج کی اچھوتی کرنوں سے کھیلتی اور معشوقانہ انداز سے اٹھلاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ کناروں پر ریت کے چھوٹے چھوٹے بیشمار ذرے گوہر ہائے شب تاب کی طرح آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دور دور تک چھوٹے چھوٹے رنگین گھونگے

اور جگمگاتی ہوئی سیپیاں پھیلی تھیں جن سے قوس قزح کے جلوے منعکس ہوکر انوکھی شان پیدا کررہے تھے۔

دفعتاً چوڑیوں کی کھنک نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، میں نے محویت سے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے ستیہ بالا پانی بھرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کی دادی کی خیریت دریافت کی، جب وہ پانی بھر کے واپس جانے لگی تو میں بھی جنیو خریدنے کے بہانے اس کے ساتھ ہولیا۔

اس روز سے میں علی الصبح کسی نہ کسی بہانے ستیہ بالا کے ہاں جاتا اور اس کی دادی کی تیمارداری میں اس کی مدد کرتا، اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا، ستیہ بالا مجھ سے بہت مانوس ہوگئی۔

ایک دن موقع پاکر میں نے اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کا بدن جوش مسرت سے کانپنے لگا۔ اس کا ہر انداز ثابت کررہا تھا کہ وہ بھی میری محبت میں سرشار ہے۔ اسے خاموش پاکر میں نے زیادہ پر محبت الفاظ میں شادی کی درخواست کی، وہ لجاتے ہوئے بولی؟

''دادی کی زندگی میں مجھے اس انتخاب کا کوئی حق نہیں۔ اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو دادی سے اجازت حاصل کریں۔''

دوسرے دن ستیہ بالا کے ہاں گیا تو وہ پانی لینے ندی پر گئی ہوئی تھی اس کی دادی پرارتھنا میں مشغول تھی۔ میں نے بوڑھی برہمنی کو پرنام کیا اس نے مجھے آشیرباد دی۔ میں نے اس کی خیریت کی خبر پوچھی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرکے حرف مطلب زبان پر لایا وہ میری درخواست پر خوش تھی۔ اتنے میں ستیہ بالا بھی آگئی۔ برہمنی نے اسے بلایا اور میری درخواست سے مطلع کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس رشتے کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔ ستیہ بالا نے شرماتے ہوئے دبی زبان سے ہاں کردی۔

اس کے بعد برہمنی نے میرا حسب نسب دریافت کیا، جب میں نے اپنے باپ دادا کا نام بتایا تو غیظ و غضب سے برہمنی کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ وہ گرج کر کہنے لگی۔

''دشٹ پاپی، یہاں سے دور ہوجا۔ تمہی لوگوں کے ظلم وستم کی بدولت میں تباہ وبرباد ہوئی۔ تمہارے ہی ظالم باپ نے میرا سہاگ لوٹا اور میرے نوجوان بچوں کو مار ڈالا مجھے اور میری پوتی کو دربدر کیا۔ اب تم کس منہ سے ستیہ بالا کے رشتے کی درخواست کرتے ہو۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

برہمنی کا جلال دیکھ کر میں کانپتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر سے میں نے سنا۔ وہ اپنی پوتی سے کہہ رہی تھی۔

''دیکھ ستیہ بالا خبردار بھول کر بھی اس کا خیال دل میں نہ لانا۔ یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے تمہارے دادا اور تمہارے چچا کو بے گناہ قتل کیا!''

ستیہ بالا رو کر کہنے لگی۔

''لیکن اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ اگر گنہگار تھا تو اس کا باپ تھا۔''

برہمنی فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگی۔

''خاموش! یہ شخص ہرگز تمہارا پتی نہیں ہوسکتا! شاید میرے مرنے پر تم اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاؤ۔ اس لئے میں تمہیں تنبیہ کرتی ہوں کہ کبھی اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ یاد رکھنا اگر تم نے میری وصیت پر عمل نہ کیا تو تمہیں سہاگ کا سکھ نصیب نہ ہوگا اور ایک اناتھ برہمنی کا یہ سراپ اس جنم تو کیا کسی جنم میں بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے گا۔''

برہمنی کی باتوں سے مایوس ہوکر، میں وہاں سے چلا آیا اور دوسرے ہی دن ماموں کی منت سماجت کرکے ماں کو لے کر اپنے گاؤں واپس آگیا۔ یہاں آکر میں نے بہت کوشش کی کہ ستیہ بالا کو بھول جاؤں لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ ستیہ بالا کے لئے میری آتش شوق دن بدن بھڑکتی رہی۔

دوارکا بھوی میں دسہرہ کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ اب کی مرتبہ ماموں نے مجھے اور ماں کو اس تہوار پر بلاوا بھیجا میں پہلے ہی موقع کا منتظر تھا جھٹ ماں کے ساتھ تیار ہوگیا۔ دوارکا بھوی آکر مجھے اپنے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ بوڑھی برہمنی سورگباش ہوگئی ہے۔

دوسرے دن میں ڈرتے ڈرتے جھونپڑی کی طرف گیا۔ مہندی کے پودوں کے قریب ستیہ بالا پیکر یاس بنی بیٹھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا وہ بالکل سفید موم کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے احمریں لبوں کی رنگت گو پھیکی پڑ گئی تھی تاہم وہ ابھی تک پرکشش تھے۔ اس کے رخسار اگرچہ زرد ہو رہے تھے مگر اس کے بیضوی چہرے پر غم کی تاثیر سے غیر معمولی ملاحت ٹپک رہی تھی۔ اس کی مژگان پر غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے ایسی دلفریب چمک ہویدا تھی جس کی تاب زاہد صد سالہ کے لئے بھی دشوار تھی۔

وہ مجھے دیکھتے ہی جھونپڑی میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا مگر اس کے اس سلوک سے میں مایوس نہ ہوا اور ہر روز بلاناغہ وہاں جانے لگا۔ آخر میں نے اس پری کو شیشے میں اتار لیا۔ اس نے دادی کی وصیت توڑ دی اور مجھ سے شادی کر کے میری ڈگمگاتی کشتی حیات کو حسن کے پرمسرت ساحل سے لگا دیا۔

شادی کے بعد میری زندگی بہت طمانیت بخش تھی لیکن میں اکثر اس کے لالہ گوں لبوں پر سرد آہیں محسوس کرتا۔ اور اس کی غزالی آنکھوں کو نمناک پاتا، میں ہمیشہ اسی کی دلجوئی کے لئے کہتا۔

''ستیہ بالا مجھ کو تم سے ایسا عشق ہے جیسا بلبل کو پھول سے'' ان باتوں پر وہ بجائے خوش ہونے کے کانپنے لگتی کیوں کہ دادی کی شراپ کا اثر ابھی تک اس کے دل پر موجود تھا۔

شادی کے ایک سال بعد ستیہ بالا کو پرماتما نے ایک بچہ دیا۔ بچہ بہت خوب صورت اور پیارا تھا۔ مجھے اب تک ستیہ بالا سے بدستور محبت تھی۔ مگر آہ! میرا یہ عشق ایک شیریں خواب ثابت ہوا۔ میری محبت کا مدہوش کن طلسم ایک گوالے کی لڑکی نے آن واحد میں مکڑی کے جالے کی طرح توڑ دیا۔

ستیہ بالا میری اس کیفیت سے بالکل بے خبر تھی لیکن جب میں گوالے کی لڑکی نندنی کو گھر لے آیا تو اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ پھر بھی اس نے ماتھے پر شکن نہ ڈالی اور بدستور میری خدمت گزاری کا اپنا فرض ادا کرتی رہی۔

نندنی ضدی اور پھوہڑ عورت تھی۔ وہ اسے بہت تنگ کرتی اور ہر وقت لڑتی بھڑتی رہتی۔ پھر اس کے خلاف الٹا میرے اور میری ماں کے کان بھرتی میری اماں پرانی عداوت کی وجہ سے پہلے ہی اس سے خوش نہ تھی نندنی کے بھڑکانے سے وہ اور زیادہ خلاف ہوگئی۔

آخر ایک دن میں نے ستیہ بالا کا بچہ جواب دو سال کا تھا چھین کر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔

میرے اس ظلم سے ستیہ بالا کا دماغ پھر گیا۔ اس کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ وہ گلیوں میں آوارہ پھرتی اور پاگل پنے میں نعرے لگا کر کہتی۔ ''شراپ شراپ!''

آخر ایک دن وہ غائب ہوگئی، میں خوش تھا کہ اس بلا سے چھٹکارا ملا۔ دوسرے دن ایک کنوئیں سے اس کی لاش برآمد ہوئی اس نے خودکشی کرلی تھی۔

اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد نندنی نے بچے کو زہر دے کر مار ڈالا، بچے کی موت کا مجھے اور میری ماں کو بہت صدمہ ہوا۔ میں نے نندنی کو گھر سے نکال دیا اور اپنے کئے پر پچھتانے لگا۔

مرد کے لئے رنج و غم عارضی چیز ہے۔ چند دن بعد میں یہ صدمہ بھول گیا۔ اب میں نئی شادی کی فکر میں تھا۔ میری ماں ایک اور پتنی لے آئی۔ اس پتنی سے میرے گھر تیرہ بچے ہوئے۔ یہ سب دو سال کی عمر میں ماں کا دودھ چھوڑ دیتے اور بلک بلک کر مر جاتے۔ مجھے اور میری ماں کو یقین ہوگیا کہ یہ اسی ظلم و ستم کا بدلہ ہے۔ جو ہم لوگوں نے ستیہ بالا پر کیا تھا۔ تیرہواں بچہ پیدا ہوتے ہی میری پتنی گزر گئی۔

میری ماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ میں اور شادی کروں مگر میرا دل ان متواتر صدموں سے ٹوٹ چکا تھا میں نے شادی کا خیال چھوڑ دیا۔ آخر جب میری ماں کا مرتیو ہوا اور گھر بالکل ویران ہوگیا تو دوستوں کے کہنے سننے پر میں نے آخیر عمر میں پھر شادی کرلی۔

میری یہ پتنی بہت نیک اور فرمانبردار تھی۔ اس سے بھی یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے لیکن انہوں

نے بھی دو دو سال کی عمر میں دودھ چھوڑ دیا اور کھل کھل کر مر گئے......

1857ء میں جب غدر ہوا تو کئی گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ چنانچہ اس مصیبت سے بھی نہ بچ سکا۔ میری جاگیر چھن گئی۔ میں برباد ہو گیا اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پنجاب میں آنکلا۔ یہاں موضع کھوڑ میں ایک ٹھاکر کے ہاں مجھے نوکری مل گئی۔ جہاں میں اپنی پتنی سمیت زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ میرے ہاں پھر ایک لڑکا پیدا ہوا جو بالکل ہی ستیہ بالا کے بچے کا ہمشکل تھا۔

یہ بچہ خوبصورت اور صحت مند تھا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید بچ نکلے مگر بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جو یہ بچہ دو سال کا ہوا تو تمام علاقہ میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے۔ ہمارے گاؤں میں صرف دو تین گھر محفوظ تھے۔ باقی سب صفایا تھا۔

ایک دن شام کے قریب میری پتنی کی طبیعت خراب ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے اندر اس نے پران تیاگ دیئے۔ طوفانی رات تھی۔ بادل خوب زور سے برس رہے تھے۔ لاش سامنے پڑی تھی بچہ ماں کے واسطے بلک رہا تھا اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو رہی تھی کچھ دیر بعد بارش بند ہو گئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو تمام گاؤں پر اندھیرا محیط تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گاؤں میں اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جو میری مدد کر سکے۔

اپنی بے کسی پر میرا دل سخت رنجیدہ ہوا۔ میں چیخ چیخ کر آہ و بکا کرنے لگا۔ میں بار بار ستیہ بالا کی آتما کو مخاطب کر کے اس سے معافی مانگتا اور اس کی آتما سے التجا کرتا کہ وہ اس وقت میری مدد کرے۔ میں گہرے جذبے اور عقیدت مندی سے ستیہ بالا کو پکار رہا تھا کہ ایک دم دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی جسے دیکھ کر میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ آنے والی عورت ستیہ بالا تھی۔

میں نے گڑگڑا کر اس سے التجا کی "یہ بچہ لے کر میرے گناہ معاف کر دے۔"

بچہ تو اس نے میرے ہاتھوں سے پکڑ لیا مگر کہنے لگی۔ "بابا تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میں ستیہ بالا نہیں۔ میرا نام چمپا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بچہ سمیت باہر نکل گئی۔

بچہ اس کی گود میں جاتے ہی خاموش ہو گیا۔

صبح اس جگہ سے جہاں وہ لڑکی تھی مجھے سونے کی ایک زنجیر ملی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ستیہ بالا کی آتما نہیں تھی، ضرور کوئی نیک دل لڑکی تھی جو پرماتما نے میری مدد کو بھیجی......

میرے دل میں اس لڑکی کو ملنے کی زبردست خواہش تھی تاکہ یہ زنجیر اسے واپس دے دوں مگر باوجود انتہائی تلاش کے اس لڑکی کا سراغ نہ ملا۔ اب میرے سر پر بار تو تھا نہیں جس کی مجھے فکر ہوتی، چنانچہ میں سادھو بن کر شہر بہ شہر، گاؤں گاؤں گھومنے لگا۔ مجھے دنیا سے کچھ دلچسپی نہ تھی البتہ یہ آرزو مجھے چین نہ لینے دیتی کہ کسی طرح یہ زنجیر اس لڑکی تک پہنچا دوں۔

آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ سادھی لگاؤں۔ اس زنجیر کا مالک خود میرے پاس آئے گا اور یہ امانت لے جائے گا۔ اب میں یہاں سادھی لگائے، رات دن ایشور کی یاد میں رہتا ہوں۔ شام کے وقت صرف دو گھنٹہ کے لئے اس زنجیر کے مالک کا انتظار کرتا ہوں لیکن ابھی تک میری خواہش پوری نہیں ہوئی۔ شاید میرے مرنے کے بعد وہ یہاں آئے...... اگر اس کے آنے سے پیشتر میں مر گیا تو میری آتما وقت مقررہ پر موڑ کے قریب حسب دستور اس کا انتظار کیا کرے گی۔"

یہ قصہ ختم کر کے آکاش اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ واقعات پڑھ کر مجھے چمپا کی مظلومیت کا یقین ہو گیا اور اس صدمہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میری تمام سخت گیری آنکھوں کے راستے بہہ گئی۔ میں اسی دن ہری پور پہنچا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ چمپا خواہ میرے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کرے میں اسے ضرور ملوں گا۔

مجھے بالکل خیال تک نہ آیا کہ چمپا اب بیاسی سالہ بڑھیا ہو گی بلکہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اپنی نوخیز منگیتر سے صلح صفائی کرنے جا رہا ہوں جیسا کہ کسی زمانہ میں مصر

سے آتے وقت کر چکا تھا۔ مجھے اپنی عمر کا بھی احساس نہ رہا، میں اسی شوق اور ولولے سے سفر کررہا تھا۔

جب اس جگہ پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اب وہاں ایک گاؤں آباد تھا۔ میں نے بمشکل برگد کے درخت اور کنوئیں سے جھونپڑی کا سراغ لگایا۔ اس جھونپڑی میں ان دنوں چمار رہتے تھے۔ میں نے ان سے چمپا کی بابت دریافت کیا۔ ایک بوڑھے چمار نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں ماں بیٹی جھونپڑی فروخت کر کے کرپا چورہ میں آباد ہوگئی ہیں اور چمپا کا لڑکا رام شنکر کبھی کبھی اپنی زمین کی دیکھ بھال کرنے آیا کرتا ہے۔"

میں بادل نخواستہ واپس لوٹا اور لوگوں سے دریافت کرتا ہوا چوپارہ پہنچا۔ رام شنکر سے ملاقات ہوئی تو اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کیونکہ وہ ایک سفید ریش آدمی تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وقت نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے۔ رام شنکر وہی منحوس بچہ تھا جس کی وجہ سے میں نے چمپا سے قطع تعلق کیا تھا...... میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی ماں کا رشتہ دار ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ چمپا کو مرے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ اس خبر سے میں بہت غمزدہ ہوا۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ رام شنکر مجھے نہایت احترام سے اپنے دیوان خانے میں بیٹھا کر خود کھانا لانے کی غرض سے زنان خانے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پر آہٹ ہوئی میں نے زمانہ گزشتہ کی یاد سے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا حیرت واستعجاب سے میری چیخ نکل گئی۔ دروازے پر وہی نوخیز چمپا ہاتھ میں کھانے کا طشت لئے کھڑی تھی۔ میری چیخ سے ڈر کر وہ مودبانہ طریقے پر کہنے لگی۔

"باباجی میں آپ کے لئے کھانا لائی ہوں۔"

اتنے میں رام شنکر آگیا اور ان دونوں نے مل کر میرے سامنے کھانا چن دیا۔

میں نے رام شنکر سے اس لڑکی کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے جس کا نام اس نے اپنی ماں کے نام پر چمپا رکھا ہے۔ شکل وصورت کے علاوہ اس لڑکی کی چال ڈھال آواز غرضیکہ ہر انداز میری منگیتر جیسا تھا۔ میں دیر تک اس لڑکی سے گفتگو کرتا رہا۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی چمپا ہے جس نے اب کی مرتبہ رام شنکر کے گھر جنم لیا ہے۔

چنانچہ میں نے وہ طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈال دی۔ وہ لڑکی بھی مجھ سے مانوس ہوگئی۔ میں کئی دن ان کے گھر مہمان رہ کر واپس چلا آیا۔ لیکن آج سے ایک ماہ پیشتر جب میں پھر اس لڑکی سے ملنے گیا تو رام شنکر نے مجھے بتایا کہ راولپنڈی کا ایک رئیس جس کا نام روی ہے چمپا کا رشتہ مانگتا ہے۔ اس نے تمہارے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عنقریب ہی تمہاری درخواست منظور کرلے گا۔ اس خیال سے کہ ایک نہ ایک دن اس کی شادی ضرور ہوگی، مجھے سخت تشویش تھی۔

ایک دن جب کہ رام شنکر کہیں باہر تھا، موقع پاکر میں نے وہ ساری کہانی چمپا کو سنادی جوان کاغذات میں قلم بند تھی اور آپ بیتی سنا کر اس کے ذہن نشین کردیا کہ پہلے جنم میں وہ ستیہ بالا تھی جس نے وادی کی شراپ سے گوکل کے ہاتھوں دکھ پایا اور دوسرے جنم میں چمپا کے روپ میں میری ذات سے تکلیف اٹھائی۔ اب پھر وہ تیسری مرتبہ دنیا میں آئی ہے اور وہی شراپ اس جنم میں بھی اس کو سہاگ کا سکھ نہ دیکھنے دے گی چنانچہ اب اس کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ تمام عمر شادی نہ کرے۔

چمپا پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ میری داستان سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ شادی کے نام پر لرزنے لگی۔ اب مجھے یہ فکر تھی کہ اس کا باپ کہیں اسے زبردستی بیاہ نہ دے۔ اس لئے انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تمام جائیداد اسے اس شرط پر دے دوں کہ وہ تمام عمر کنواری رہے۔

یہ سب کچھ میں نے چمپا کی بہتری کے لئے کیا ہے تاکہ اسے پچھلے جنم میں جو تکلیف میری طرف سے ہوئی تھی اس کی تلافی کرسکوں۔



مطلب پرفقط ایک سرکاری تالہ لٹک رہا تھا جس کی چابی علاقے کے ایس ایچ او کے پاس تھی۔

سرکاری تحقیقات کے دوران وطن عزیز کے وفادار اداروں کے وفادار افسروں نے جب پیر صاحب کے گاہکوں کا رجسٹر قبضہ میں کیا تو کچھ دیر کی چھترول کے بعد ہی منور نے بہت کچھ بتا دیا پیر صاحب کو ابھی رسیوں سے باندھ کر الٹا لٹکایا ہی گیا تھا کہ وہ ابھی اپنی ''الف لیلیٰ'' بولنے پر مجبور ہوگئے۔

اس ساری طلسم ہوش ربا کا پول کھول دیا گیا ملک کے اخبارات ورسائل اور کیبل چینلز پر یہ خبر خوب گرم ہوئی عوام الناس کو باخبر کرنے کے لئے بعض صحافیوں نے اپنا قومی فریضہ نبھایا تو بعض نے بات کا بتنگڑ بنا بنا کر خبروں کو گرمایا۔

لیکن جب گاہکوں کی فہرست میں قمرالزماں کو پولیس نے گھر سے بلایا تو اس کی ہوائیں اڑی ہوئی تھیں وہ مقامی پولیس کے ایس پی آفس پہنچ گیا وہاں سے تفتیش کے لئے قمرالزماں کو اس انجانے علاقے میں لے جایا گیا جہاں پیر اور اس کا خادم خاص موجود تھے جہاں سارے معاملے کا پول کھل گیا۔

پیر لوگوں کو اپنے چنگل میں پھانسا کرتا تھا اس نے روحانی عامل ہونے کا ایک ڈھونگ رچا رکھا تھا سارا کھیل پیسے کا تھا سب اس کی ذہنی اختراع تھی جسابی کلیہ تھا وہ چالیس ہزار روپے کے اصلی بینک بونڈز کی بچت کیا کرتا تھا انہیں اوپن مارکیٹ سے خریدا کرتا تھا اس نے اپنے پاس جعلی نمبروں کے کوپن رکھے ہوئے تھے لوگوں سے پیسے اینٹھ کر وہ ان بونڈز کی مکمل فہرست لیا کرتا تھا ہر چار ماہ بعد کم ازکم تین یا دو نمبر چھوٹے انعامات کے نکل آتے تھے جن سے اپنے گاہکوں کو خوش کرتا۔ ایک انعام سے اس کے سات گاہک اس پر کامل یقین رکھنے لگتے تھے اور یوں وہ جتنا دیتا تھا اس سے کہیں زیادہ گاہکوں سے وصول کرلیا کرتا تھا۔

جب سرکاری ترقی اور سند کی بات عیاں ہوئی تو معلوم ہوا کہ سند تو جعلی خریدی گئی تھی ان لوگوں کو بھی پولیس نے گرفتار کرلیا تھا اپنی شہرت کی وجہ سے وہ سرکاری اداروں کے اعلیٰ افسران سے بھی مراسم بڑھا چکا تھا۔ جن سے بوقت ضرورت کام لیا کرتا تھا اور قمرالزماں کی ترقی میں بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ اپنے تعلقات کے لوگوں کو ''موکل'' کہا کرتا تھا جب پولیس نے پیر کے ذاتی عقبی آستانے کے حصے پر چھاپہ مارا تو گیارہ کروڑ باون لاکھ روپے کے پرائز بانڈز قبضے میں کیئے تھے۔ جن میں ہر ایک کی مالیت چالیس ہزار روپے کی تھی یہ رقم اس نے دس سالوں کی محنت سے حاصل کررکھی تھی۔ اور اس میں بہت وقت لگا تھا۔

جب یہ معلوم کیا گیا کہ یہ مختلف ناموں کی لوحیں اور انگوٹھیاں کہاں سے حاصل کی جاتی تھیں تو وہ عام دکانوں سے یہ سب بنوالیا کرتا تھا جو فریم کا کاروبار کیا کرتے تھے انگوٹھیاں وہ سنار کی دکان سے بناتا تھا۔ پولیس نے سنار کی دکان پر جاکر ساری تفصیل بتائی تھی لیکن کسی کی گرفتاری عمل میں اس لئے نہیں لائی گئی کیونکہ سنار سے انگوٹھی بنوانا جرم کے دائرہ میں نہیں آتا۔

جب پیر سے پوچھا گیا کہ بے اولاد جوڑوں کو اولاد کا جھانسہ دے کر وہ کون سا عمل کیا کرتا تھا تو پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا لیکن بالآخر اس چھ فٹ کے چمڑے کے لتر نے جس پر لکھا ہوتا ہے۔

''آیا کرو پاس اپنے بھی بجنا کبھی کبھی۔''

دو ''لتر'' کھانے کے بعد پیر جی نے روتے روتے سب کچھ اگل دیا۔ وہ ایسا نفس پرست شیطان کا چیلا تھا جو انسانوں میں انسانی روپ میں لوگوں کی عزت اور آبرو کو بھی نہ بخش رہا تھا۔ جس خبیث صفت انسان سے عورتوں کی پاکدامنی بھی محفوظ نہ تھی۔

قمرالزماں کے سامنے یہ تمام انکشافات ایک پہاڑ بن کر ٹوٹے تھے۔ اس کے لئے یہ زندگی اب اس زندگی سے بھی بدتر ہوچکی تھی جو وہ ایک چھوٹے منصب پر رہتے ہوئے گزار رہا تھا۔





سونے کی تلاش

ایس امتیاز احمد-کراچی

لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی نوجوان حرص و لالچ کے تحت آگے ہی آگے بڑھتا رہا کہ اچانک اس کا سامنا موت سے ہوگیا، مگر اس کے دل میں آیا کہ موت میرا کیا بگاڑ لے گی لیکن جو کچھ بھی ہوا اس کا تصور ناممکن تھا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ خودغرض اور مطلب پرست کو موت اپنے شکنجے میں جلد جکڑ لیتی ہے

ہم دریائے ریوبونازا کے دونوں کناروں کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی کشتی میں سراسیمہ سے بیٹھے تھے۔ جوں جوں کشتی آگے بڑھ رہی تھی، دریا کے دونوں کنارے قریب آتے جارہے تھے اور دونوں جانب ابھری ہوئی چٹانیں کبھی لہروں میں ڈوبتی اور کبھی ابھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کشتی چلانے والے ریڈ انڈین خطرات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ کشتی کو بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے چٹانوں سے بچاتے ہوئے ڈھلوان میں دریا کے تیز بہاؤ کے رخ لے جارہے تھے۔

نیچے دریا کا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر سفید جھاگ پیدا کررہا تھا۔ پانی کے درمیان میں بھنور بن رہے تھے۔ پانی بری طرح ابلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ملاحوں نے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی کوئی ابھری ہوئی چٹان دیکھتے تو فوراً بانس چٹان سے لگا کر کشتی

کو چٹان سے ٹکرانے سے روک لیتے۔ یہ بانس بڑے مضبوط تھے۔ کشتی ایک تنکے کی مانند تیزی سے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ملاح اپنی نگاہیں پیش آنے والی ڈھلوانوں پر جمائے ہوئے تھے۔ انہیں نسبتاً سست روبہاؤ کی تلاش تھی اور وہ غیر مطمئن سے تھے۔ لیکن وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

میرا ساتھی جم ونٹرز کشتی کے اگلے حصے میں سفری بستروں پر بیٹھا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمام ڈھلوانوں سے واقف ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہی کہا تھا نا تم نے؟"

"بے شک۔" میں نے بتایا لیکن نسبتاً سست رولہریں رات کے وقت یکا یک اپنا راستہ بدل بھی لیتی ہیں۔ مرنے والوں کا اس دریا کو "احمقوں کا دریا" کہنا کافی حد تک صحیح ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ انہیں کسی بھی قسم کا مغالطہ لگے کیونکہ ایسا کوئی بھی مغالطہ جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہم مطلوبہ لہر سے ہٹ کر اپنا سامان نہیں لے جاسکتے۔؟" وہ بولا۔

"نہیں اس الجھن سے بچ کر نہیں جاسکتے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے دریا کے دونوں جانب پرخطر گھنے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جم ونٹرز کے لئے جنوبی امریکہ کے بالائی ایمزن کے علاقے میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہاں بہنے والے دریا اینڈیان کے پہاڑی علاقوں سے بڑی تیزی کے ساتھ بہتے ہیں۔ بعض حصوں میں سوسوگز کے رقبے میں پندرہ پندرہ فٹ گہرے بھنور بنتے ہیں جن میں سے کشتی کو بغیر کسی حادثے کے بچالے جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ کشتی تو ایک طرف رہی کوئی بہترین تیراک بھی تیر کر ان بھنوروں کو عبور نہیں کرسکتا۔ پانی میں ڈوبی ہوئی کسی بھی چٹان سے ٹکرا کر وہ موت کی آغوش میں پہنچ سکتا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان علاقوں میں آسان گزرگاہیں یہ تیز رفتار دریا ہی گردانے جاتے ہیں۔ اگرچہ موسم برسات میں ان میں سے لرزنا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

دریا کی پہلی مشکل ترین ڈھلوان اب بالکل قریب تھی۔ ریڈ انڈین ملاح بڑی ہوشیاری سے کام لے رہے تھے۔ جم بھی میری طرح کیلیفورنیا کا باشندہ تھا۔ وہ جنوبی امریکہ کے ان جنگلوں کے بارے میں جانتا تو تھا لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں کس کس قسم کے خطرے موجود ہیں جبکہ میں پچھلے دس برسوں سے ان جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا ہماری ملاقات اچانک کویٹو میں ہوئی تھی۔ وہاں دو مقامی ریڈ انڈین ایوشن کے علاقے سے بہت سا سونا لے کر آئے تھے۔ ایوشن کے علاقے سے بہت کم لوگ واقف تھے اور یہ انتہائی پرخطر علاقہ تھا۔

ان کی باتیں سن کر جم ونٹرز کو بھی وہاں جاکر قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے مجھے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا شاید اس لئے کہ میں مقامی باشندوں کی زبان سے آگاہ تھا۔ مقامی باشندوں کا کہنا تھا کہ مذکورہ علاقہ انتہائی پرخطر بلکہ موت کی وادی ہے، بہرحال کرہ ارضی پر اور بھی لاتعداد پرخطر مقامات ہیں بشرطیکہ آپ کوئی بھی غلط قدم اٹھائیں۔ الغرض میں نے اپنے اس نئے ساتھی کے ہمراہ چلنے کی ہامی بھرلی اسی لئے میں اس کے ساتھ کشتی پر سوار تھا۔

ملاحوں کو مطلوبہ گزرگاہ مل گئی اور انہوں نے اطمینان سے اپنے بانس اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ میں بھی اچھی طرح سنبھل کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ "نیچے بیٹھ جاؤ اور اپنے بازو کشتی کے سروں سے ہٹالو۔" میں نے بلند آواز میں جم سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ہم کشتی سمیت ابلتے اور جھاگ اڑاتے ہوئے تیز روپانی میں تھے۔ اچانک ایک چٹان کے قریب سے کشتی بال بال بچتے ہوئے گزری۔ ملاح بدقت کشتی کو چٹانوں سے ٹکرانے سے بچائے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بانس دہرے ہوئے جارہے تھے۔ دونوں ملاح یکا یک چیخے اور انہوں نے اپنے تیسرے ساتھی جاپاپایا سے کچھ کہا۔ جاپاپایا نے تیزی کے ساتھ کشتی کو دائیں جانب موڑا۔ عین اسی لمحے کشتی کا دایاں حصہ چٹان سے رگڑ کھاتا ہوا آگے بڑھا۔ دونوں ملاح

گھٹنوں کے بل کشتی میں گر پڑے اور کشتی ایک اور چٹان کی طرف بڑھنے لگی۔ تیزی سے اٹھ کر دونوں ملاحوں نے بانس مضبوطی سے ہاتھوں میں پکڑ لئے تا کہ چٹان کے قریب پہنچتے ہی کشتی کو ٹکرانے سے بچا لیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب کے ہم نہ بچ سکیں گے، سر پر آئے خطرے کے انتظار کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

ایک عجیب معجزہ ہوا۔ چٹان سے رگڑ کھاتی ہوئی کشتی پھر بہاؤ کے تیز رو دھارے میں جا پہنچی۔ اس ٹکراؤ سے کشتی کے بیرونی حصے سے لکڑی کے ٹکڑے اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دوسرے ہی لمحے کشتی میں خاصا پانی در آیا۔ قریب ہی ایک اور چٹان دکھائی دے رہی تھی۔ ملاح کسی چالاک بندر کی طرح چٹان پر اپنے بانسوں کے ساتھ جھپٹے اور کشتی ایک بار پھر ان کے کنٹرول میں تھی۔ ہم اس چٹان سے بالکل محفوظ گزر گئے۔ اب دریا کی چوڑائی بڑھ چکی تھی اور ہم نسبتاً سست رو پانی میں تھے۔

جم چہرے پر مسکراہٹ لئے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ساری ڈھلوانیں ایسی ہی خطرناک ہیں؟" جم نے پوچھا۔

"ساری تو نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "البتہ یہ واقعی بہت خطرناک تھی۔"

ہمارا ایک ملاح جھکا ہوا دیکھ رہا تھا کہ کشتی کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے بتایا کہ کشتی میں پانی داخل ہو رہا ہے۔ ہم نے کشتی کو دریا کے کنارے لے جاتے ہوئے دیکھا تو ایک بڑا سوراخ تھا جس میں سے پانی کشتی کے اندر آ رہا تھا۔

"اسے نپگارا سے مرمت کیا جا سکتا ہے۔" میں نے اپنے تین ریڈ انڈین سے کہا جنہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان میں سے ایک اپنے ہاتھ میں لمبا شکاری چاقو لے کر جنگل میں اس درخت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس میں سے "نپگارا" حاصل کیا جا سکے۔ یہ ایک قسم کا انتہائی لیسدار مادہ ہے جو اس علاقے میں موجود ایک درخت کے تنے پر کلہاڑی سے ضرب لگانے کے بعد بہہ نکلتا ہے۔ اسے گرم کر کے سریش کی مانند لکڑی جوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ مقامی باشندے اس درخت کو "سیبو" کہتے ہیں۔ اس کام میں دیر کا امکان تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے گردوپیش نگاہ ڈالی۔ "کیا خیال ہے اگر ہم یہاں دریا کے پانی سے کناروں کی مٹی کو دھو کر سونا تلاش کریں؟" میں نے جم سے کہا۔

"مناسب ہے۔" جم بولا۔ میں نے مطلوبہ برتن نکالے اور ہم دونوں اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ہم نے ابھی دو بار ہی مٹی کو دھویا تھا کہ یکا یک ہمارے عقب میں جنگل سے ایک لرزا دینے والی چیخ سنائی دی اور اس کے فوراً بعد کسی درندے کے غرانے کی آواز آئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے برتن وہیں چھوڑتے ہوئے کہا۔

ہم کشتی کی جانب لپکے تا کہ اپنی بندوقیں لے لیں۔ کشتی میں موجود دونوں ریڈ انڈین پہلے ہی اپنے بھالے لئے تیار کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شکاری چاقو بھی تھے۔ وہ ہمارے آگے آگے جنگل کی جانب بھاگ نکلے۔ ہم بندوقیں ہاتھوں میں لئے ان کے پیچھے تھے لیکن جنگل میں تیز رفتاری سے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا، قدرتی جڑی بوٹیاں اور خاردار پودے سب سے بڑی رکاوٹ تھے اس کے علاوہ ہمارے بوٹ گیلی مٹی میں لت پت تھے۔

"کہاں ہو تم؟" میں نے ہانک لگائی۔

"یہاں ہیں۔" جواب ملا۔ "جلدی کرو۔"

جب ہم جائے حادثہ پر پہنچے تو منظر بڑا ہولناک تھا۔ بوڑھا اور تجربہ کار جاپایا "نپگارا" لانے والے ریڈ انڈین کی لاش کے قریب کھڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا اور اس کا سر بری طرح ایک جانب مڑا ہوا تھا۔ چھاتی بری طرح زخمی اور چھلی ہوئی تھی۔ گوشت کے لوتھڑے برہنہ چھاتی پر موجود تھے ایک بازو درندے نے بری طرح چبا ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ جسم پر مزید لرزا دینے والے زخم تھے۔ اس کی موت واقعی اذیت ناک تھی، جاپایا غور سے زمین پر درندے کے پاؤں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ وہ ان نشانوں کو دیکھتا ہوا گھنے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب ہی

ہمیں درندے کے بچوں کے پیروں کے نشانات بھی دکھائی دیئے۔

''انگالا کہاں ہے؟'' معاً مجھے تیسرے ریڈ انڈین کا خیال آیا۔

''وہ درندے کا تعاقب کررہا ہے۔'' جاپاپا بولا۔'' میں بھی اس کے پیچھے جارہا ہوں۔''

''یہ اندازہ کرنا بالکل آسان ہے۔'' میں نے خوف زدہ جم سے کہا۔'' وہ سامنے والے درخت کو دیکھو اس کے تنے میں سیاہ رنگ کا مادہ بہہ رہا ہے یہی ''پنگارا'' ہے اس تنے پر ضرب لگانے کے بعد یہ ہمارا مرنے والا ساتھی ادھر ''لیسان'' کے پتے لینے آیا تھا کہ ''پنگارا'' پتے پر جمع کرسکے یہاں پر چیتے کی مادہ پہلے سے اپنے بچوں کو لئے بیٹھی تھی اس نے اچانک اس پر حملہ کردیا۔

''معلوم ہوتا ہے اس نے مرنے سے پہلے چیتے کو بھی ایک دو زخم لگائے ہیں۔'' جم نے زمین پر خون کے قطروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اگر وہ زیادہ زخمی ہے تو جاپاپا اور انگالا ضرور اسے پکڑلیں گے، ورنہ اس گھنے جنگل میں اسے تلاش کرنا ممکن نہیں۔ شکاری کتے ہی اسے کسی درخت پر پناہ لینے پر مجبور کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ زیادہ زخمی نہ ہو اور بچ کر نکل جائے۔ اپنے بچوں کے ساتھ مادہ بہت خطرناک ہوتی ہے اور مکار لومڑی سے کہیں بڑھ کر مکار ہوتی ہے۔''

''کیا وہ تعاقب کرنے والوں کو بھی ماردے گی؟'' جم بولا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔'' یہ بہت ہوشیار لوگ ہیں۔ بڑی احتیاط سے یہ اس کا تعاقب کریں گے۔ یہ بے چارہ انجانے میں مارا گیا ہے۔ آؤ میرے ساتھ تاکہ ہم ان کی واپسی سے پہلے پہلے اسے زمین کھود کر دفن کردیں، ورنہ ہم یہیں پھنس کر رہ جائیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' جم حیرت سے بولا۔

''یہ واپسی پر اس کی لاش قصبے میں لے جانے کے لئے اصرار کریں گے۔'' میں نے جم سے کہا۔'' اور اس کی لاش قصبے میں لے جانا ممکن نہیں۔ گرمی بہت زیادہ ہے یہ اسے کہیں راستے ہی میں دفن کرکے آگے بڑھنے سے انکار کردیں گے اور کہیں گے کہ یہ بدشگونی ہوئی ہے اور ہم مزید تمہارا ساتھ نہیں دیتے۔''

''اسے دفن کرنے پر خفگی کا اظہار نہیں کریں گے؟'' جم بولا۔

''یقیناً کریں گے، لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ مردے کی قبر دوبارہ نہیں کھودتے۔ پھر ہم انہیں آگے بڑھنے پر مجبور کرسکیں گے۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں نے مل کر ایک گہرا گڑھا کھودا اور اسے دفن کردیا۔ جم نے قبر کے سرہانے نشانی کے طور پر ایک شاخ گاڑدی۔

دوپہر کے بعد جاپاپا اور انگالا واپس لوٹے۔ انہیں ناکام ہی لوٹنا پڑا، کیونکہ خون کے قطروں کے نشان گم ہوگئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ چیتے کی مادہ زیادہ زخمی نہ تھی۔ اندھیرے کے پیش نظر وہ دونوں واپس آگئے تھے اور مزید ہمارے ساتھ آگے جانے سے انکاری تھے لیکن جب میں نے انہیں دگنی اجرت کا لالچ دیا تو مان گئے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس مقام پر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے کشتی کی مرمت ''پنگارا'' سے کرتے ہوئے کشتی کو پھر دریا میں بہاؤ کے رخ پر ڈال دیا۔

دو دن بعد ہم ایک مقامی قصبے سارایا کو پہنچ گئے۔

اس مقام سے خطرے ہی خطرے تھے۔ ہمیں شمال کی جانب بالسایا کو جانا تھا۔ آوشن کا علاقہ یہاں سے شروع ہوتا تھا جو ہماری منزل تھا۔ ہمیں وہاں سے سونا بھی مل سکتا تھا اور موت بھی۔ اخلاقاً ہمارے لئے قصبے کے ریڈ انڈین چیف سے ملنا ضروری تھا اس لئے بھی کہ ہمارا ایک ساتھی مرچکا تھا اور ہمیں ایک تجربہ کار آدمی کی ضرورت تھی۔ واپسی پر بہاؤ کے خلاف طاقتور اور مزید آدمی کے بغیر آنا ممکن نہ تھا۔ ہم مقامی انڈین چیف سے ملے اسے نمک اور چند تحفے پیش کیئے۔

''محتاط رہنا اور زیادہ دور نہ جانا۔'' چیف بولا۔'' جوارس قبیلے کے لوگ نہایت شقی اور خون خوار ہیں۔ ان کا گاؤں واشیلی راستے ہی میں پڑے گا۔ تم جانتے ہی ہو کہ

بالسایوکا میں پہلے ہی وہ سفید فام لوگوں کو لوٹ کر اور ان کے سر کاٹ کر لے جا چکے ہیں۔''

''یہ گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''پانچ روز کی مسافت پر ''جاپیو'' نامی پھل کے درخت ہیں۔ اس سے ذرا آگے دائیں کنارے پر چٹان کے اوپر واشیلی کا جھونپڑا ہے۔'' چیف بولا۔

ہم نے انڈین چیف کا شکریہ ادا کیا اور پھر نئے ساتھی اپالو سے گفتگو کی۔ یہ مضبوط تن و توش کا نوجوان ہمیں انڈین چیف نے دیا تھا۔ ہمیں مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے لئے چھ دن لگے۔ راستے میں ہم بہت سے مقامات پر سونے کی تلاش کے لئے بغور دیکھتے رہے لیکن کوئی جگہ نہ مل سکی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے ریڈ انڈین ساتھی زیادہ سے زیادہ بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی منزل کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ سن کر کہیں بھاگ ہی نہ جائیں میں نے بہرحال ان سے یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ مزید چند روز سفر کے بعد وہ آزاد ہوں گے۔

انڈین چیف کے بتائے ہوئے مقام پر ہم جنگلی پھل حاصل کرنے کے لئے رکے۔ یہ پھل آڑو کی طرح تھے۔ ذائقے میں میٹھے اور مزیدار، ہم نے بڑی مقدار میں یہ پھل وہاں سے اپنے کھانے کے لئے لے لئے۔

''اپنا ریوالور بالکل تیار رکھنا۔'' میں نے جنم ونٹرز سے کہا۔ ''لیکن چھپا کر۔'' جب ہم پھل لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملاحوں کو تاکید کی کہ وہ کشتی ہر ممکن کوشش سے بائیں کنارے پر رکھیں۔ جوارس قبیلے کے نوجوان بڑے پھرتیلے واقع ہوئے تھے۔ ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر مقابلہ ہو جائے تو وہ تیزی کے ساتھ کشتی کو بہاؤ کے رخ لے جائیں۔

دائیں کنارے، موڑ کے نزدیک چٹان پر ایک جھونپڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے نیچے کنارے پر کوئی کشتی نہ تھی اور نہ کسی اور جھونپڑے سے دھواں نکل رہا تھا۔ ہمیں کسی شخص کا بھالا یا سر بھی دکھائی نہ دیا۔

''اچھی بات ہے۔'' اپلالو بولا۔ ''شاید سب ہی لوگ دوسرے قصبے نیوشینو چلے گئے ہیں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تمام قصبہ خالی پڑا تھا۔ جیوارس قبیلے کے لوگ کسی حد تک خانہ بدوش واقع ہوئے تھے۔ جب کبھی ان کے پاس خوراک کم پڑ جاتی یا انہیں شبہ ہو جاتا کہ کوئی قبیلہ ان پر حملہ کرنے والا ہے تو وہ نقل مکانی کر جاتے۔ ہم ہر طرح سے چوکنے رہتے ہوئے گاؤں کے قریب سے بہاؤ کی جانب آگے بڑھ گئے۔ جم ونٹرز چاہتا تھا کہ کچھ فاصلے پر رکیں اور گھوم پھر کر دیکھا جائے لیکن میں نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ امکان تھا کہ قبیلے کے کسی اکیلے فرد نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے چلا گیا ہو۔

اس شام ہم نے ایک جنگل کے پاس دریا کے کنارے کیمپ لگایا۔ ہمارے ہمراہیوں نے پام کے پتے اکٹھے کیے تاکہ موسم کی شدت سے بچا جا سکے۔ میں اور جم اپنی بندوقیں لئے جنگل میں گھس گئے۔ کچھ آگے چل کر میں نے کہا۔ ''ذرا اور آگے چلتے ہیں تاکہ شکار مل جائے۔''

میں نے کچھ فاصلے پر ایک جانور کی طرف اشارہ کیا۔ جم ونٹرز نے فائر کیا لیکن اس کا نشانہ اندھیرے کے باعث چوک گیا۔ گھنے درختوں کے باعث اس مقام پر روشنی کچھ زیادہ نہ تھی۔ بہرحال پرندہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے اڑنے کی کوشش کی لیکن اڑ نہ سکا، البتہ لنگڑاتا ہوا چل کر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے میں گھس گیا۔ جم اس پرندے کے پیچھے لپکا۔ اس نے درخت کے تنے میں جھکتے ہوئے تاکا اور پھر اس سے پیشتر کہ میں اسے متنبہ کروں، اس نے اپنا بازو درخت کے تنے میں داخل کر دیا تاکہ پرندے کو پکڑ کر نکالے۔

''ارے۔'' جم دوسرے ہی لمحے چیخا اور اپنا ہاتھ نکال لیا۔ میں تیزی سے جم کے پاس پہنچا۔ اس کا ہاتھ بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھ سوج گیا۔ میں نے دیا سلائی جلا کر درخت کے کھوکھلے تنے کے اندر جھانکا پرندہ مرا پڑا تھا اور لاتعداد زہریلی چیونٹیاں ''ساؤبس'' اسے چمٹی ہوئی تھیں۔ یہ چیونٹیاں انتہائی زہریلی ہوتی ہیں۔ ایک چیونٹی ایک سے ڈیڑھ انچ لمبی اور اس کی دم میں زہریلا ڈنک ہوتا ہے۔

"جم تم خاصی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔" میں نے اپنے دوست سے کہا۔

"ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔" جم بولا۔

میں نے ایک لکڑی کے ذریعے پرندے کو کھوکھلے تنے سے باہر نکالا اور اس پر چمٹی ہوئی چیونٹیوں کو ہٹایا اور جم سے کہا کہ "ان کے زہر کا کوئی مناسب علاج نہیں ہے۔"

پھر ہم کیمپ کی جانب واپس چل پڑے۔ "یہی ہو سکتا ہے کہ درد کم کرنے کے لئے میں تمہیں مارفیا کا انجکشن دوں اور تمہیں کونین کی گولیاں کھلا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔" جم بولا۔ "ہو سکتا ہے ان کا زہر کچھ اثر نہ کرے۔"

"یہ تمہارا خیال خام ہے۔" میں نے کہا۔ "کل تم محسوس کرو گے کہ تمہارا بازو تمہارے جسم کے ساتھ ہے ہی نہیں۔ تم تین دن تک شدید بخار میں بھنکو گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے ایک مرتبہ میں بھی ان چیونٹیوں کا شکار ہو چکا ہوں۔"

اس کے بعد جم ونٹرز تین دن شدید بخار سے پڑا رہا۔ دوسرے روز اس کا بازو بری طرح سوج گیا تھا۔ اسے ایک سو چار ڈگری بخار ہو گیا، میں نے اسے کونین دی اور مارفیا کا انجکشن بھی لگایا۔ جم کو کشتی میں لٹا کر ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جیوارس قبیلے کے لوگ ہمیں اس حالت میں آن دبوچیں۔ کشتی چلتی رہی اور میں مناسب وقفوں سے انجکشن لگاتا اور کونین کھلاتا رہا۔ تین روز اسی طرح گزر گئے۔ ایک بار مجھے ریڈ انڈین ہمراہیوں کو دھمکانے کے لئے بندوق بھی اٹھانا پڑی تا کہ وہ آگے بڑھتے رہیں۔ میں بدستور جاگ کر ان کی نگرانی کرتا رہا کہیں وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں۔ چوتھے روز جم ونٹرز نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔

"مجھے بھوک لگی ہے اور میں اب ٹھیک ہوں۔"

"ابھی کھانے کو دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور اسے کچھ سونا دکھایا۔

"یہ تمہیں کہاں ملا؟" جم نے پوچھا اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

"قریب ہی ایک تالاب سے۔" میں نے بتایا۔

"کل ہم زیادہ اوپر نہ جا سکے تھے۔ پانی تیز تھا اور میں نے یہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

ہم نے کھانا کھایا اور ریڈ انڈینز کو کیمپ کے لئے جگہ صاف کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ان میں سے دو کو حکم دیا کہ وہ شکار کر کے تازہ گوشت کا انتظام کریں۔ ہرن وغیرہ جو بھی انہیں ملے شکار کر لائیں۔ گرد و پیش کے جنگل میں ہرن، سور اور نیل گائے کی قسم کے جانور موجود تھے۔ ریڈ انڈینز اس قسم کی مہلت کو بہت پسند کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنی بندوقیں اور بھالے وغیرہ اٹھا کر جنگل میں گھس گئے۔ جاپایا کو میں نے کیمپ میں ہی روک لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے اسے چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ جم اور میں سونا دھونے کے برتن لے کر دریا کی جانب چل پڑے۔ جلد ہی ہم نے سونا حاصل کر لیا۔ جم بہت خوش تھا کہنے لگا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بہت پہلے یہاں آ گیا ہوتا۔"

سات روز متواتر ہم صبح سے شام تک سونے کی تلاش میں رہے۔ اندھیرا ہونے سے قبل ہم تھک ہار کر کیمپ میں آ جاتے۔ ساتویں روز تک ہم نے بارہ اونس کے قریب سونا حاصل کر لیا تھا، پچھلے تین دن سے ہم بہت محنت کر رہے تھے۔ ہمارے پاس سونے کا وزن بڑھ رہا تھا ہمارے ریڈ انڈین ساتھی بھی بے خوف و خطر اپنے لئے سونا حاصل کر رہے تھے۔

"زندگی تو یہ ہے۔" جم نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی تلاش کر سکے تو اس علاقے میں سونا بہت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس علاقے میں عام لوگ نہیں آ سکتے جہاں تک سفید فام نسل کے افراد کا تعلق ہے انہیں فوراً یہاں سے نکل جانا ہو گا تب ہی وہ اپنی جان بچا سکتے ہیں۔"

"لیکن میں تو تقدیر کا قائل ہوں۔" جم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے اگر سونا ملتا رہے تو میں تو ہر خطرہ مول

لینے کے لئے تیار ہوں۔"

اگلے روز صبح سویرے میں نے اپالو اور انگالا کو مزید شکار کی تلاش میں بھیج دیا۔ ہم سونا حاصل کرنے کے لئے جانے ہی والے تھے کہ اپالو اور انگالا ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔ ان کے چہروں کا رنگ زرد تھا۔ وہ کپکپا رہے تھے۔ جنگل کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"آ ئیسوکا......"

یہ سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جنوبی امریکہ میں "آ ئیسوکا" سے بڑھ کر وحشی اور کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ یہ لوگ جیوارس قبیلے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔

"کیا بات ہے؟" جم نے مجھے خوف زدہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مصیبت۔" میں نے ہکلاتے ہوئے بمشکل فقرہ پورا کیا۔ "بہت بڑی مصیبت۔"

میں نے اپالو اور انگالا سے گفتگو جاری رکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا "آ ئیسوکا" کے کسی بھی فرد سے آمنا سامنا نہیں ہوا، ورنہ ان میں ایک تو ضرور مر گیا ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے ان کے قدموں کے نشانات دیکھے ہیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ پیروں کے یہ مخصوص نشانات اسی قبیلے کے کسی فرد کے تھے۔ وہ اکیلا آدمی بلاشبہ ہمارے کیمپ کے گرد گھوما پھرا تھا۔

"سامان باندھو اور یہاں سے فوراً نکل چلو۔" میں نے حکم دیا۔

"کیا تم واقعی نامراد جانا چاہتے ہو؟" جم حیرانگی سے بولا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اس سے پیشتر کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ کر ہمارا صفایا کر دیں۔"

"لیکن ہمارے پاس بندوقیں ہیں۔" جم نے احتجاج کیا۔

"انہیں استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ ہم اب تک کسی قدر خوش قسمت رہے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے وحشی دیکھے ہیں، لیکن یہ آئیسوکا قبیلے کے لوگ انتہائی وحشی ہیں۔ یہ کانگو کے چیتے سے بھی کہیں خاموشی کے ساتھ اچانک حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی تمہاری کمر میں ان کا زہریلا بھالا پیوست ہوگا۔ یہ ہر اجنبی کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔"

میں نے اشارے سے ریڈ انڈینز کو تیزی سے سامان سمیٹنے اور چلنے کو کہا۔ وہ پہلے ہی گھبراہٹ میں سامان اٹھا اٹھا کر کشتی میں پھینک رہے تھے۔

"اگر انہوں نے ہمیں دریا میں چلتے ہوئے دھر لیا تب؟" جم بولا۔

"پھر ہمارا بچ نکلنا محال ہے البتہ ہم کشتی میں لیٹ کر شاید بچ نکلیں کیونکہ ان لوگوں کے پاس کشتیاں نہیں ہیں اور نہ یہ تیرنا جانتے ہیں۔"

"مجھے یوں اس جگہ سے جانا پسند نہیں۔" جم مایوسی سے بولا۔

"مردے کے سونا کس کام آئے گا؟" میں نے کہا۔ "چلو اب جلدی سے کشتی پر سوار ہو لو، ورنہ یہ ریڈ انڈینز ہمیں یہیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔"

جم بدستور اپنا سر جھٹک رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ میں کس خطرے سے اسے آگاہ کر رہا ہوں۔ میں بیس مسلح سفید نسل کے تنومند افراد کو جنگل اور کیچڑ میں لت پت مردہ پڑے دیکھ چکا تھا اور "آ ئیسوکا" قبیلے کے زہریلے بھالے ان کی کمروں میں پیوست تھے۔ یہ چند برس پہلے کا واقعہ تھا کہ یہ شیطان سیرت لوگ خاموشی سے ڈچ پیٹرولیم کمپنی کے کیمپ میں گھس آئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارا "آ ئیسوکا" قبیلے سے سابقہ پڑے۔ آخر ان بھوت نما وحشیوں سے مقابلہ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

ہم تیزی کے ساتھ بہاؤ کے خلاف کشتی چلاتے رہے۔ سب کی نظریں کناروں پر لگی تھیں اور ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ جتنی جلد ہو سکے ان وحشیوں کی دسترس سے نکل جائیں۔ بہر حال قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ ہم بخیریت سارا یا پہنچ گئے۔ خطرہ دور ہو چکا تھا، للہٰذا اپالو نے بولو ناز اتک ہمارے ساتھ چلنا منظور کر لیا۔

میں واپسی پر دریا کی تیسری رات زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ ہم ابھی اس مقام پر نہیں پہنچے تھے جہاں ہمارا ایک بدقسمت ریڈ انڈین ساتھی دفن تھا۔ دریا کے بہاؤ کے خلاف کشتی چلاتے چلاتے ہمارے ساتھی بری طرح تھک چکے تھے۔ ضروری تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے کہیں رکا جائے۔ تازہ گوشت کے لئے شکار کرنا بھی ضروری تھا۔ ہمارے ریڈ انڈین ساتھی اب اپنے علاقے میں تھے اور اس گردونواح سے بخوبی واقف تھے بوڑھے جاپایا کو کیمپ لگانے کے لئے چھوڑ کر میں اور جم جنگل میں ایک جانب چل دیئے۔ اپالو اور انگالا دوسری سمت میں شکار کے لئے جا چکے تھے۔

ہمیں چلتے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا کہ جم نے میرے بازو پر ٹھوکا دیا اور بولا۔ ''اس سامنے والی جھاڑی میں مجھے متحرک چیز دکھائی دی ہے۔ آؤ ہم اسے گھیرے میں لیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن زہریلی چیونٹیوں سے بچ کر رہنا۔'' میں نے جم کو یاد دہانی کرائی۔

ہم دونوں الگ الگ خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے جم سے الگ ہو کر ابھی نیم دائرہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے جم والی سمت میں ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ دوسری بار جم کی آواز کان میں آئی۔ وہ گالیاں بک رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے جم والی سمت میں لپکتے ہوئے ہانک لگائی۔

''ادھر آؤ...... فوراً'' جم چلایا۔

میں تیزی سے بڑھتا ہوا ایک نسبتاً کھلی جگہ پر پہنچا۔ جم ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہاتھ اپنے دائیں گال پر رکھے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے گردن کے پٹھے دبا رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' یہ کہتے ہوئے میری نظر اچانک آٹھ فٹ لمبے انتہائی زہریلے سانپ پر پڑی۔ یہ اس علاقے کا ''موٹوبو'' نامی سانپ تھا جو بار بار ڈنک مارتا ہے۔

''یہ اس تنے کے اوپر بیٹھا تھا۔ میں نے جونہی اس کی اوٹ سے اوپر سر اٹھا کر دیکھنا چاہا اس نے جم کے گال پر کاٹ کھایا اور دوسری بار اس کے ہاتھ پر۔''

میں نے تیزی سے شریان بندی کے لئے جم کے بازو پر پٹی باندھی لیکن اس کے رخسار نے مجھے شدید تذبذب میں ڈال دیا۔ کسی کے گلے پر کس کر پٹی باندھنا ممکن نہیں۔ میں نے تیزی سے اس کے سوجتے ہوئے رخسار پر نشتر سے کراس لگایا اور تین زہر چوسنے والے پھاہے رکھے جو اس وقت میرے پاس موجود تھے۔ باقی تین زخموں کو میں نے اپنے منہ سے چوسا۔ میں نے اپنے منہ سے خون اور زہر کو چوس کر باہر پھینکنے کا عمل متعدد بار کیا اور جم سے کہا۔

''میرے پاس انجکشن فسٹ ایڈ بکس میں ہیں لیکن تم کیمپ تک جا بھی سکو گے؟''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' جم بولا۔

لیکن اسی لمحے میں جم کی ابلتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے نتھنوں اور کانوں سے خون بہنے لگا تھا۔ منہ پر سانپ کے کاٹے کا سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔'' میں نے اسے کہا۔

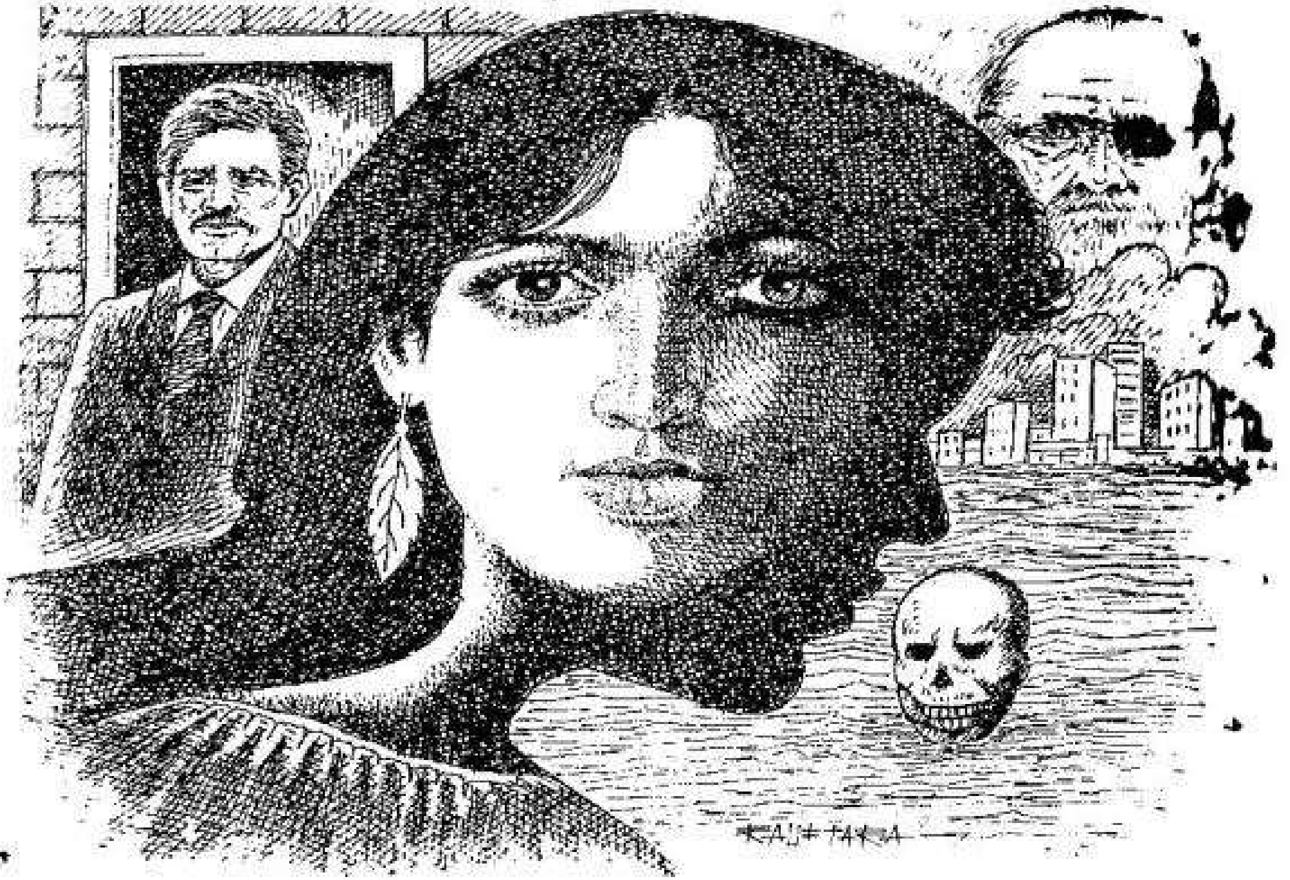
''نہیں تم یہاں ٹھہرو میں خود جا کر انجکشن لے آتا ہوں۔ میں جب تک واپس آؤں تم اپنے بازو کا زخم خود ہی چوسو۔''

میں جلد انجکشن لے کر لوٹ آیا۔ لیکن اب سبھی کچھ بیکار تھا۔ جم مر چکا تھا...... اور اب سوائے اس کے کہ اسے فوری طور پر دفن کر دیا جائے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جم کو وہیں دفنا دیا اور دیر تک اس کی قبر پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ جم نڈر اور ایک اچھا دوست تھا سونے کی طلب نے اسے موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔

میں نے اس کا جمع کیا ہوا اور اپنے حصے کا سونا بھی اس کے والدین کو بھیج دیا۔ اس کے بعد کبھی اس علاقے میں نہیں گیا۔ اگرچہ ایمزن کے جنگلوں کے بارے میں میرا دس سالہ تجربہ جوں کا توں تھا۔ یہ علاقہ بدستور سفید فام لوگوں کے لئے خطرہ اور جان لیوا ہے۔







شکار

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانك نوجوان نے سانس اندر کی جانب کھینچا اور اسپرے پمپ کی نالی ہیولے کی طرف کردیا اور ہینڈل دبادیا تو نووارد کا منہ حیرت سے کھل گیا اور پھر اس کی فلك شگاف چیخ نے قرب و جوار کو دھلا کر رکھ دیا۔

دوسروں کے مشورے پر دھیان نہ دینے والے گھاٹے میں رہتے ہیں، سبق آموز کہانی

وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بیٹھا پھلوں سے صبح کا ناشتہ کررہا تھا۔ جس جگہ وہ بیٹھا وہاں سے شیکران اور صنوبر کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک صاف نظر آتی تھی۔ اس کے اردگرد سلیٹی اور بھورے رنگ کی بے شمار چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں جن کے اوپر جا بجا سرخ کائی جمی ہوئی تھی۔ بظاہر وہ اونگھتا محسوس ہورہا تھا تاہم وہ بیدار اور چاق و چوبند تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور کان کسی متوقع آواز پر لگے ہوئے تھے۔ قرب و جوار میں حشرات الارض اور پرندوں کی ہم اقسام آوازیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے لیے یہ خوب صورت آوازیں نغمہ سحری سے کم نہ تھیں۔ جھیل کے شمال میں واقع اس کنج تنہائی میں شکاریوں کی آمد اب تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔

دس بجکر پانچ منٹ اس نے ایک اسٹیشن ویگن کو

اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے رومال سے منہ صاف کیا اور پتلون جھاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اسٹیشن ویگن گھنے درختوں والے حصے کی طرف مڑ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی نمودار ہوگئی اس نے جیب سے رومال نکالا اور اسے مخالف کونوں سے پکڑ کر گھمانے لگا۔ یہاں تک کہ رومال پتلی رسی کی مانند ہوگیا۔ یعنی اب رومال سے گلے میں پھندا لگایا جاسکتا تھا۔

چہرے سے وہ ایک نرم مزاج اور رحم دل آدمی نظر آتا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات پر سکون اور ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ نہایت عزم اور استقلال کے ساتھ پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اس کی چال میں کسی پہاڑی بکرے کی سی تیزی اور توازن پایا جاتا تھا۔ آنکھوں میں مخصوص چمک جھلک رہی تھی۔

اسٹیشن ویگن درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رک گئی۔ انجن بند ہوگیا اور اندر سے ایک تیس بتیس سالہ خاتون باہر آگئی وہ خاصے پرکشش چہرے اور جسم کی مالک تھی۔ اپنے بدن کے گداز پن کی وجہ سے اپنی عمر سے چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس نے ہلکے رنگ کی چست پتلون پہن رکھی تھی جو اس کے کولہوں کی فربہی کو نمایاں کررہی تھی۔ جسم پر خاکی رنگ کا بلاوز تھا جس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بھورے بال پونی ٹیل کی شکل میں سرخ ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ پتوں کے درمیان سے چھن کر آتی ہوئی روشنی اس کے چہرے اور لباس پر بیل بوٹے بنارہی تھی۔ گذشتہ رات کی بارش کی وجہ سے صبح کی ہوا خاصی ٹھنڈی تھی۔ اردگرد پودوں اور درختوں پر پرندوں اور درندوں کی آوازیں اور سرسراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں والے خودرو پودے بھی کافی تعداد میں دیکھے جاسکتے تھے۔ مجموعی اعتبار سے وہ ایک پرکیف اور خوبصورت جگہ تھی۔

خاتون کے لئے یہ خاصا خوشگوار لمحہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی جنگل کی زندگی ختم ہونے والی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بار پھر وہ شہر کے ہنگاموں میں لوٹ جائے گی۔ اس نے اگلی سیٹ پر رکھا ہوا چرمی بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ پھر اس نے اسٹیشن ویگن کا پچھلا حصہ کھولا اور وہاں سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ نکال کر اس کی چیزوں کا جائزہ لیا۔ ڈبے کے اندر روئی اور کیڑے مکوڑے مارنے والے زہر کی شیشی رکھی تھی۔ اس ڈبے کو اچھی طرح بند کرکے اس نے بیگ میں ڈال لیا پھر مارٹینی سے بھرا ہوا تھرماس اور سینڈوچ کا پیکٹ بھی بیگ میں رکھ لیا۔ آخر میں اس نے تتلیاں پکڑنے والی جالی نکالی اور اسے ہوا میں لہرا کر دیکھا۔

آج بھی اسے اپنی کامیابی کی کوئی زیادہ امید نہیں تھی۔ تاہم اس تکلیف دہ یکسانیت میں ضرور کچھ کمی کی توقع تھی جو ایک کسان کی بیوی کا مقدر ہوتی ہے۔ خصوصاً نیوانگلینڈ کے کسان کی بیوی کا۔ اس کا شوہر دولت مند ضرور تھا لیکن انتہائی سرد مزاج اور بے کیف تھا۔ اس کی زندگی ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

اس کی ساری دلچسپیوں کا مرکز کھیتی باڑی تھا۔ وہ کم گو اپنے اصولوں کا سخت پابند اور تکلیف دہ حد تک سنجیدہ تھا۔ تاہم اس نے اپنی بیوی کو آسودگی اور فراغت کی ہوئی تھی۔ جو اسے پہلے میسر نہیں تھی۔ لہٰذا اس کے لئے شکایت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن انسان تو انسان ہی ٹھہرا کسی چیز پر قناعت نہیں کرتا جو میسر ہو اس سے لطف اندوز نہیں ہوتا اور جو نہیں ہو اس پر نظر رکھتا ہے۔

خاتون نے شکاری نظروں سے فضا کا جائزہ لیا۔ ایک شوخ پیلے رنگ کی تتلی سامنے سے گزرتی دکھائی دی۔ خاتون نے بٹرفلائی نیٹ لہرائی اور اس کے پیچھے بھاگی۔ اس کی آنکھوں میں جو چمک پائی جاتی تھی وہ صرف شکاریوں کے لیے مخصوص تھی۔ ایک بجے تک وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتی رہی پھر سائے میں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے لگی۔ کھانے کے بعد اس نے مارٹینی کے چند گھونٹ پیے اور درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر ستانے لگی اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

ایک شخص جنگلی گلاب کی اوٹ میں بیٹھا خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کئی روز سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ادھر خاتون بھی باقاعدہ وہاں آرہی تھی اس

لے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی تھی کہ خاتون جسمانی اعتبار سے خاصی مضبوط اور چست ہے اسے مغلوب کرنا خاصا مشکل تھا کیونکہ وہ دبلا پتلا اور کمزور آدمی تھا۔ خاتون کو وہاں آنے سے باز رکھنے کے لئے دو ہی طریقے تھے یا تو اس پر غفلت میں وار کر کے اسے ہلاک کر دیا جائے یا اسے اتنا زیادہ خوفزدہ کر دیا جائے کہ وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ اس علاقے کے لوگ توہم پرست تھے اور ذرا سی بات کو بھوت پریت کی طرف منسوب کر دیتے تھے لیکن اس عورت کو خوفزدہ کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک چھپ کر اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس درخت کے پیچھے پہنچ گیا جس کے ساتھ وہ عورت ٹیک لگائے پڑی تھی۔ چند لمحوں تک وہ سانس روکے درخت کے پیچھے کھڑا رہا۔ اس کے کانوں میں عورت کے سانس لینے کی متوازن آواز آ رہی تھی۔ اس نے ریشمی رومال کے پھندے کو مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر عورت کے گلے میں ڈال دیا۔ اس کا منہ عورت کے بالوں کو چھو گیا۔ جن میں سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ لمحے بھر کے لیے اسے اپنے فعل پر تھوڑی سی ندامت بھی ہوئی اس نے پہلی مرتبہ ایک عورت کے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، اور وہ بھی ایک خوبصورت اور گداز بدن عورت کے گلے کی طرف۔

دفعتہً اسے یوں محسوس ہوا کہ زمین آسمان اور درخت گردش میں آ گئے ہیں لیکن درحقیقت وہ خود گردش میں آ گیا تھا۔ وہ زمین سے کئی فٹ اونچا اچھل کر دوبارہ زمین پر پہنچ گیا۔ لیکن اب وہ اپنے پیروں پر نہیں کھڑا تھا۔ چاروں شانے چت پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ کمر حرکت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی اور حواس خمسہ وقتی طور پر معطل ہو گئے تھے۔ ایک طویل لمحے کے بعد وہ کراہتا ہوا بیٹھ گیا سب سے پہلے اس کی نظر خاتون کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ حسب سابق مطمئن انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے کہا۔ "تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں لگی۔"

وہ اپنے کپڑوں سے گرد اور پتے جھاڑتا ہوا بولا۔ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چوٹ تو یقیناً لگی ہے لیکن اس بات کا اندازہ ایکسرے کے بعد ہی ہو گا کہ کتنی ہڈیاں ٹوٹی ہیں۔

عوت کی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی۔ "زندگی میں پہلی مرتبہ جوڈو استعمال کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ فن آج کل لڑکیوں میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔" پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "لیکن تم کون ہو اور تمہاری حرکت کا مقصد کیا تھا؟"

"میرا نام ہارڈی ہے۔ میرے ایک دوست نے یہاں ملنے کا وقت دیا تھا۔ میں سمجھا کہ تم میر دوست ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری نیند خراب کی۔"

"میرا نام بابرا ہے۔" خاتون اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "اور میرا خیال ہے کہ تم مجھے ہی تلاش کر رہے تھے۔"

"کیا؟" ہارڈی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"شکریہ، میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔"

بابرا نے تھرماس کے ڈھکنے میں شراب انڈیل کر ہارڈی کی طرف بڑھائی۔ "یہ چیز تمہاری طاقت بحال کرنے میں مفید ثابت ہو گی۔"

ہارڈی نے شراب کا کپ لیا اور ہولے ہولے چسکیاں لینے لگا۔ ابھی تک وہ اس عورت کے بارے میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

"مجھے تجسس اس جنگل میں کھینچ لایا ہے۔" بابرا نے مزید کہا۔ "آس پاس کے قصبوں میں اس جنگل کے بارے میں بڑی پراسرار باتیں مشہور ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس جنگل پر آسیب کا سایہ ہے۔

گذشتہ چند ماہ کے دوران یہاں تین آدمی پراسرار طریقے پر ہلاک ہو چکے ہیں۔" اس نے سگریٹ اور کش لینے کے بعد بولی۔ "ان اموات کے بارے میں کئی قسم کی باتیں مشہور ہیں لیکن میرا اندازہ بالکل مختلف ہے۔"

"اچھا!" ہارڈی کے چہرے پر حیرت نمودار ہوگئی۔

"ہلاک ہونے والے لوگ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے تھے مگر ان میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ تینوں یہاں تتلیوں کا شکار کرنے آئے تھے۔ تینوں کی موت بھی تقریباً ایک ہی انداز میں ہوئی تھی۔ دو شکاری تو اس زہر کی بو سے ہلاک ہوئے تھے جو وہ تتلیوں کو مارنے کے لئے لائے تھے۔

"اس قسم کا زہر تمہارے پاس بھی ہے۔" ہارڈی کھلے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"ہاں، یہ وہی زہر ہے۔" بابرا نے کہا...... "خاصا خطرناک زہر ہے۔ اگر انسان پانچ منٹ تک اسے سونگھ لے تو ہلاک ہوجاتا ہے۔ شیرف کی رپورٹ کے مطابق دو شکاریوں نے اتفاقی حادثے کے نتیجے میں زہر کی بو سونگھ لی تھی۔ ایک تو ٹھوکر لگنے سے گر کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ زہر کی بوتل پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی اور سارا زہر اس کے سر کے آس پاس پھیل گیا تھا۔ دوسرا شخص سر کے قریب زہر کی بوتل رکھ کر سو گیا تھا۔ اس دوران میں کسی جانور نے بوتل کو گرا کر توڑ دیا۔"

"اور تیسرا شکاری؟" ہارڈی نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا تھا۔ بعض سمجھدار لوگوں نے مختلف قسم کے خدشات کا اظہار بھی کیا تھا۔ مگر شیرف بہت سادہ لوح آدمی ہے اس نے تمام خدشات کو بے بنیاد قرار دیا تھا۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال بہت مختلف ہے۔" پھر وہ پرخیال نظروں سے پھولوں کے پودے کی طرف دیکھنے لگی جہاں چند رنگ برنگی تتلیاں اڑتی پھر رہی تھیں...... "کتنی پیاری لگتی ہیں یہ تتلیاں! نرم ونازک۔"

"وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھ لگانے سے رنگ میلا ہوتا ہے وہ ان تتلیوں پر صادر آتا ہے۔ ذرا سا ہاتھ لگانے سے ان کا رنگ اتر جاتا ہے۔ یہ قدرت کی نازک ترین اور حسین ترین مخلوق ہے۔ یہ صرف پھولوں کے اوپر اڑتی پھرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"مجھے تمہارے خیالات سے سو فیصدی اتفاق ہے۔" بابرا نے کہا۔

لیکن ہارڈی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بابرا کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا وہ شک آمیز نظروں سے بٹر فلائی نیٹ اور زہر کی بوتل کی طرف دیکھنے لگا۔ بابرا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"خدا نے کسی چیز کو بلا ضرورت پیدا نہیں کیا۔ ہر شے کی اپنی ایک انفرادیت اور افادیت ہے۔ خواہ وہ پھولوں کے گرد منڈلانے والی تتلی ہو یا افریقہ کے جنگل میں چنگھاڑنے والا ہاتھی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ انسان جانوروں کی صحت اور سلامتی کو تسلیم کرنا شروع کردیا ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہر ملک میں جانوروں کے ڈاکٹر اور انسداد بے رحمی حیوانات کے محکمے موجود ہیں۔ میرے خیال میں جو شخص بلا جواز کسی جانور کو ہلاک کرتا ہے وہ قتل عمد کا ارتکاب کرتا ہے اس کی وہی سزا ہونی چاہیے جو ایک قاتل کی ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے خیالات سے پورا اتفاق ہوگا۔"

"معلوم نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" ہارڈی نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ میں کہنا چاہتی ہوں کہ اس جنگل میں ہلاک ہونے والے تین شکاریوں کی موت کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔ ان تینوں کو قتل کیا گیا تھا۔"

ہارڈی آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگا وہ اس عورت کی ذہانت پر دہشت زدہ رہ گیا تھا۔

"بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان شکاریوں کو سزائے موت دی گئی تھی یعنی انصاف کا تقاضا پورا کیا گیا تھا اور میں بھی ہوں کہ تم نے نہایت عمدگی سے اس کارروائی کو سرانجام دیا تھا۔"

"میں نے؟" ہارڈی نے ہولے سے کہا۔

"اوہ ہاں۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں۔ مجھے اس علاقے میں آئے ہوئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ جب میں شہر میں تھی تو انسداد بے رحمی حیوانات کی کئی تنظیموں اور انجمنوں کی رکن تھی۔ ہم نے جانوروں کی

بے مقصد قتل و غارت کے خلاف بہت کام کیا ہے۔ اب اگر میرا کسی تنظیم سے تعلق نہیں مگر میں اپنے طور پر کوشش کرتی رہتی ہوں۔" بابرا نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "اس بات سے بری کوئی چیز نہیں کہ ایک جاندار کو بے مقصد جان سے ماردیا جائے۔ خون کا بدلہ خون کی قائل ہوں۔"

"اور ہونا بھی یہی چاہیے۔" ہارڈی نے کہا۔ پھر وہ ایک دم چونک کر بٹر فلائی نیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔" لیکن تم بھی تو تتلیاں پکڑنے یہاں آئی ہو۔"

بابرا نے مسکراتے ہوئے نیٹ کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ "میں تتلیاں پکڑنے نہیں آئی۔ یہ نیٹ تو تم سے رابطہ قائم کرنے کا ایک ذریعہ تھا سو وہ پورا ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ جس شخص نے تین شکاریوں کو ہلاک کیا ہے وہ یہ نیٹ دیکھ کر ضرور مجھ سے رابطہ قائم کرے گا اور اس طرح ہم اکٹھے مل کر کام کرسکیں گے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" ہارڈی نے کہا......

"یہ ایک قسم کا پھندا معلوم ہوتا ہے۔ تم مجھے پھنسانا چاہتی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ہارڈی میں بالکل سچی بات کررہی ہوں مجھے تمہارے طریقے کار نے بہت متاثر کیا ہے میں تمہارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی ہوں۔ گو میں جوڈو جانتی ہوں لیکن کسی انسان کو قتل نہیں کرسکتی۔"

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کروگی؟"

"چند ملاقاتوں کے بعد تمہیں خود بخود میری بات پر یقین آجائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ہارڈی نے کہا...... "کل اسی جگہ پر اور اسی وقت دوبارہ ملاقات ہوگی۔" کچھ دیر بعد بابرا اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر رخصت ہوگئی۔

اگلی صبح ہارڈی حسب معمول چھپ کر بابرا کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ کوئی سازش کررہی ہے تو ضرور کوئی شخص اس کی نگرانی کررہا ہوگا۔ لیکن اگلی صبح وہ اکیلی ہی آئی تھی اس کے پیچھے دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

یہ ملاقاتیں کئی دن تک ہوتی رہیں یہاں تک کہ ہارڈی پوری طرح بابرا پر اعتماد کرنے لگا۔ ایک روز بابرا نے اسے مری ہوئی لال چڑیا دکھائی......

"جانتے ہو یہ چڑیا کس طرح ہلاک ہوئی ہے؟"

اس نے کہا۔ "یہ ان زہریلی دواؤں کے باعث ہلاک ہوئی ہے جو کسان اپنے کھیتوں کے ردگرد گھڑکتے ہیں۔ ان زہریلی دواؤں کی وجہ سے ہر سال ہزاروں خوب صورت پرندے اور تتلیاں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس سلسلے میں ذرا سی احتیاط سے کام لیا جائے تو اس قتل عام کی نوبت نہ آئے۔ ان لاپرواہ کسانوں کے مقابلے میں ان شکاریوں کا جرم بہت معمولی ہے جو جنگل میں تتلیوں کا شکار کرتے ہیں۔"

ہارڈی نے مٹھیاں بھینچ لیں اور اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔ "میں ان لاپروہ کسانوں کو چن چن کر ختم کردوں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کرنی پڑے گی۔ میں اس کام میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔ میں ان لوگوں کے معمولات سے بخوبی آگاہ ہوں میں تمہیں بتاؤں گی کہ کب اور کس طرح چوٹ لگانی چاہیے۔"

"او خدا......" ہارڈی نے کسی سحر زدہ انسان کی طرح کہا۔ "یہ لوگ ایک دو کے نہیں ہزاروں خوبصورت اور بے ضرر پرندوں کے قاتل ہیں۔ سنو یہ ہوا انتقام کا نغمہ الاپ رہی ہے۔"

اگلی صبح ہارڈی ایک اسٹوریج شیڈ کے اندر گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے اور شیڈ کے اندر مکمل تاریکی تھی اس کے اردگرد زراعت کے آلات، کھاد اور بیج کی بوریاں اور کچھ شکستہ پیٹیاں پڑی تھیں۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک بکس رکھا تھا جس کے اندر جراثیم کش دوائیں اور چھوٹے بڑے اسپرے پمپ پڑے تھے۔ ایک پمپ کے اندر پیراتھیون نامی دوائی تھی جو کیڑے مکوڑوں کے علاوہ انسانوں کے لئے بھی انتہائی مہلک تھی ہارڈی اس پمپ کے اوپر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

چند لمحوں کے بعد شیڈ کے باہر سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی شید کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہارڈی نے اسپرے پمپ مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑلیا اور اس کا رخ آنے والے کی طرف کردیا اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ شخص کون تھا۔ وہ جو کوئی بھی بالواسطہ ہزاروں پرندوں کے قتل میں ملوث تھا اور جیسا کہ بابرا نے کہا تھا یہ تو ابتدا تھی رفتہ رفتہ ایسے تمام لوگوں کی باری آنے والی تھی۔

لمحہ بھر کے بعد تاریکی میں ایک شخص کا دھندلا سا ہیولہ نمودار ہوا۔ ہارڈی نے سانس اندر کی طرف کھینچا اور اسپرے پمپ کی نالی اس ہیولے کی طرف کرکے ہینڈل دبایا۔ اسے دیکھتے ہی نو وارد کا منہ حیرت سے کھل گیا اور پمپ سے نکلنے والی مہلک دوائی سیدھی اس کے منہ میں داخل ہوگئی۔ وہ چیختا ہوا الٹے پاؤں واپس بھاگا لیکن چند قدم جانے کے بعد ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ہارڈی اس کے سر پر پہنچ گیا اور عملی طور پر اسے مہلک دوائی سے تربتر کردیا۔

بابرا نشست گاہ میں اداس اور دم بخود بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس پر سکتہ طاری ہوگیا ہے۔ اس کے آنسو خشک ہوچکے تھے۔ شیرف ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سوگوار بیوہ کا غم ہلکا کرنے کا کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کپ میز پر رکھ دیا۔

”میں اس دیوانے کو قصباتی جیل بھجوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تم اسے کہیں بھی بھیج دو۔“ بابرا نے کہا۔ ”میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”مجھے احساس ہے۔ ہم تمہارا نقصان پورا نہیں کرسکتے۔ کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ پیراتھیون کے چند قطرے انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔“

”اور میرے شوہر کو تو اس نے اس دوا میں تقریباً ڈبو دیا تھا معلوم نہیں کیسا دیوانہ شخص ہے۔“

”بہر حال تمہاری بروقت کارروائی سے ہم اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مگر نشانہ بہت اچھا ہے۔ گولی اس کی ٹانگ پر لگی ہے۔ اگر دل یا سر پر لگتی تو وہ ختم ہوجاتا اور یہ اس کے لئے بڑی آسان موت ہوتی۔“

”ڈیرل کا خیال تھا...... کہ شیڈ کے اندر کوئی چور گھسا ہوا ہے۔“ بابرا نے کہا۔ ”لیکن اس نے غلطی یہ کی کہ خالی ہاتھ اندر چلا گیا۔“

”غالباً وہ چوری کے ارادے سے ہی اندر گھسا تھا۔ حالانکہ شکل و صورت سے ایسا نہیں لگتا۔ شناختی کاغذات کے مطابق وہ لیک وائل میں پروفیسر ہے۔“

”وہ...... وہ ضرور کوئی جنونی شخص ہے۔“ بابرا نے ہولے سے کہا۔ ”میں اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”انسان کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ وہ کسی وقت بھی خطرناک روپ اختیار کرسکتا ہے۔“ شیرف نے اداس لہجے میں کہا۔

بابرا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ ڈیرل مرچکا ہے۔“

”بہت اچھا آدمی تھا۔“ شیرف نے کہا۔ ”روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔“

بابرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ فارم اور بینک بیلنس کے علاوہ پچاس ہزار ڈالر کی انشورنس بھی تھی۔ اس نے سوچا وہ فارم ہاؤس بیچ دے گی اور پارک ایونیو کے کسی خوبصورت اپارٹمنٹ میں منتقل ہوجائے گی۔ اب اس کے لئے ٹی وی ڈراموں میں کام حاصل کرنا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ اس نے سر جھکالیا اور رونے لگی۔

شیرف نے اس کا کندھا تھپ تھپایا اور بولا۔ ”کوئی بات نہیں رونے سے بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔“

اس کے جانے کے بعد بابرا آنسو پونچھتی ہوئی سوچنے لگی کہ اسے کام حاصل کرنے میں یقیناً کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ آج کے دن نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک بہترین اداکارہ ہے۔





پراسرار آئینہ
خونی کاوش
پراسرار دھندلکا
راج دلاری
پھر وہی کتا
روح کا انتقام
پراسرار مخلوق
روح کا فریب
تم مر چکے ہو
روح کی بے چینی
جنات کا مہمان
زندہ لاشیں
خطرناک تجربہ
زندہ روح
حسین روح
سکتے کی موت
خونخوار
سمادھی کا بھوت
خوفناک وکٹوریہ
سونے کی تلاش
خونی ڈرامہ
شکار